SYED AHMED ESAR KI HAYATH AUR ADABI KHIDMAAT

Thesis submitted for the award of degree of Doctor of Philosophy

in Urdu

Research Scholar

SHAIKH NOOR SALMA ABDUL REHMAN SHAKIRA BI

Guide

Prof. S.Masood Siraj

Former Dean, Faculty of Arts & Chairman DOS in Urdu

Department of Studies in Urdu, University of Mysore,

Mysore

2018

CERTIFICATE

I **Shaikh Noor Salma Abdul Rehman Shakira Bi** certify that this thesis is the result of research work done by me under the supervision of **Prof.S.MasoodSiraj** at the Department of Studies in Urdu, University of Mysore, Mysore. I am submitting this thesis for possible award of **Doctor of Philosophy** (Ph.D) degree in **Urdu** of the University of Mysore.

I further certify that this thesis has not been submitted by me for award of any other degree / Diploma of this or any other university.

Signature of Doctoral candidate

Date :

Signature of Guide

Date:

Signature of Chairperson / HOD

With Name and Official Seal

فہرستِ ابواب

پیش لفظ

ریاستِ کرناٹک میں جن ادباء وشعراء نے اپنے فکر وفن، مطالعے ومشاہدے، احساسات وجذبات اور زورِ قلم سے گراں قدر تخلیقات پیش کیں اور اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے ان میں سید احمد ایثؔار کا شمار ہوتا ہے۔ ایثؔار اردو کے نہ صرف معتبر شاعر وادیب ہیں بلکہ بلند پایہ مترجم بھی ہیں۔ ان کے تراجم اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

اس مقالے میں ایثؔار کی علمی، ادبی خدمات کا جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ سید احمد ایثؔار ایک متنوع اور ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنی شعری وادبی خدمات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ راقمہ نے اس تحقیقی مقالے میں ان کی زندگی اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سید احمد ایثؔار کی حالاتِ زندگی اور شخصیت وکردار پر محیط ہے جس میں ان کے وطن، خاندان، ولادت، تعلیم وتربیت، ملازمت اساتذہ، حلقۂ احباب کا ذکر کیا گیا ہے۔ سیرت وشخصیت کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں ان کے عادات واطوار، وضع قطع، خدوخال، معمولات، لباس جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

دوسرے باب میں ان کے ادبی سفر کو پیش کرتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ان محرکات وعوامل کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کے باعث ایثؔار ایک باشعور ادیب، شاعر اور مترجم کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ ایثؔار کا ادبی سفر ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ کم وبیش ستر سال سے وہ شعر وسخن کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ایثؔار نے غزل گوئی سے اپنے شعری سفر کی ابتداء کی اس کے ساتھ ساتھ نظموں اور رباعیات میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے اگرچہ اپنے شعری سفر کا آغاز غزل

گوئی سے کیا لیکن وہ بہت جلد ترجموں کی طرف مائل ہو گئے۔ ترجموں کے سلسلے میں انھوں نے اقبالؔ کے تمام فارسی مجموعہ ہائے کلام جیسے پیامِ مشرق، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز، پس چہ باید کرد، اسرارِ خودی، رموزِ بےخودی اور زبورِ عجم کا ترجمہ کیا ہے نیز عمر خیّامؔ، حافظ، سعدی شیرازی اور مولانا جلال الدین رومی کی رباعیات کا ترجمہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں ان کی نثری مضامین اور خودنوشت سوانح حیات ''سراغِ زندگی'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں بحیثیت شاعر ان کے شعری کارناموں میں ان کی نظموں، غزلوں، رباعیات اور قطعات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید احمد ایثارؔ نے شاعری میں مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ترانہ وترنگ'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ایثارؔ نے متعدد موضوعات پر بعنوان ''اسرارِ حیات'' رباعیات کہی ہیں۔ اور بعنوان ''نوائے زندگی'' ایسے قطعات ہیں جو ان کے منفرد نقطۂ نظر کے مظہر ہیں۔ دوسرا شعری مجموعہ بعنوان ''آب فشار'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ جس میں حمدیہ نظمیں، نعتیں، رباعیات، قطعات اور غزلیں شامل ہیں۔

چوتھا باب ان کی ترجمہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس باب میں ان کے متعدد منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ایثارؔ نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ ترجمہ کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۷۷ء میں عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ نہایت ہی شگفتہ انداز میں کیا۔ اس کے بعد حافظ شیرازی، سعدی اور مولانا جلال الدین رومی کے کلام کا ترجمہ کیا۔ اسی دوران اقبالؔ کے فارسی کلام نے ان کے قلب و ذہن کو اس درجہ مسحور و مسخر کیا کہ انھوں نے بقیہ زندگی اقبالؔ کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے میں صرف کر دی اور ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک اقبال کے تمام فارسی کلام کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔

پانچویں باب میں ایثارؔ کے تراجم کا دیگر مترجمین کے تراجم سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؔ کے فارسی کلام کے اردو کے کئی شعرا نے منظوم تراجم کئے ہیں مثلاً مضطر مجاز نے جاوید نامہ، پیامِ مشرق، پس چہ باید

کرداور ارمغانِ حجاز کا ترجمہ کیا ہے۔عبدالرحمٰن طارق نے پیامِ مشرق،زبورِعجم اور ارمغانِ حجاز کا ترجمہ کیا ہے۔جسٹس شیخ عبدالرحمٰن نے اسرارِخودی اورزبورِعجم کا ترجمہ کیاہے۔ایثؔارکو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اقبال کے تمام فارسی کلام کا اردوزبان میں منظوم ترجمہ پیش کیا۔ اس باب میں مضطرمجاز (پیامِ مشرق)عبدالرحمٰن طارق (پیامِ مشرق)اورجسٹس عبدالرحمٰن (اسرارِخودی) کےتراجم کا ایثؔار کےتراجم سےتقابلی مطالعہ پیش کیا گیاہےاور یہ نتیجہ اخذکیا کہ ایثؔار کے تراجم اپنی سادگی اور روانی کے اعتبار سے دیگر مترجمین کے تراجم سے بہتر ہیں ۔آخرمیں بعنوان''ماحصل''ان کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ایثؔار بیک وقت شاعر،ادیب اورمترجم ہیں۔یوں تو ان کی ادبی شخصیت اورتراجم کے حوالے سے چیدہ چیدہ مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اب تک ان کی ہمہ جہت ادبی شخصیت اوران کے کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا یہ مقالہ اس سلسلے کی پہلی کاوش ہے جس میں راقمہ نے ان کی حیات اورادبی خدمات کا بھر پوراعتراف کرنے کی حتی المقدورکوشش کی ہے۔

میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں کہ اس کے سایۂ رحمت وعنایت کی بدولت میرایہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

میں اپنے مقالے کے نگران پروفیسرڈ۔مسعودسراج صاحب کی بےحدممنون ہوں۔مجھےاعتراف ہے کہ میری تحقیق کا یہ کام کبھی پایۂ تکمیل کونہیں پہنچتا اگر استادمحترم پروفیسرڈ۔مسعودسراج صاحب کی رہنمائی اورنگرانی کا شرف حاصل نہ ہوتا۔جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل میں قدم قدم پرنہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ مختلف مواقع پر میری حوصلہ افزائی بھی کی ۔ان کی شفقت،علمی رہنمائی اورعنایت نے اس جادۂ دشوارکو میرے لئے آسان کردیا۔

میں پروفیسررفعت النساءبیگم صاحبہ،ڈاکٹرمحمدضیاءاللہ صاحب،ڈاکٹرشیخ بلال صاحب اورڈاکٹرعتیق الرحمٰن صاحب کی بھی شکرگزارہوں جنہوں نے وقتاًفوقتاًمیری حوصلہ افزائی کی ۔

ممنونِ احسان ہوں اپنے والدین کی محبتوں،عنایتوں،اوران کی قربانیوں کی جن کے سامنےعقیدت سے میری آنکھیں جھک جاتی ہیں۔یہ ان کی دعاؤں ہی کا اثر ہے کہ مجھ ناچیز میں اس تحقیقی مقالہ کو پایۂ تکمیل

تک پہنچانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رکھے۔میں اپنے ساس سسر کی تہہ دل سے ممنون ہوں ان کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔اپنے بھائیوں اور بہنوں کی محبتوں اور پر خلوص تعاون کے لئے میرے پاس تشکر کے الفاظ نہیں ان کی دعاؤں اور چاہتوں کی شبنمی لطافت نے میرے مشکل ترین کام کو آسان کیا۔

میں اپنے رفیقِ حیات محمد سلیم کی ممنون کرم ہوں جنھوں نے میرے لئے حصولِ علم کو ممکن بنایا اور ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد رکھ کر تحقیق کے لئے مطلوبہ یکسوئی عطا کی۔نیز ہر گام اور ہر مقام پر مجھے حوصلہ دیا۔میری خواہشات کو مقدم رکھتے ہوئے ہر مرحلے میں میرا ساتھ دیا۔ان کی بے پایاں خلوص و محبت شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ مقالہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔میں دل کی عمیق گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ساتھ ہی اپنے معصوم فرزند محمد عمر کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ اسے دین و دنیا میں کامیابی عطا کرے۔اس کی معصوم مسکراہٹ اور ننھی شرارتوں نے میری تحقیق کے دوران درپیش مسائل میں بھی ذہنی تازگی اور فرحت وانبساط کا سامان مہیا کیا۔

میں شعبۂ اُردو کے تمام ریسرچ اسکالر کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے میرے اس کام کی تکمیل میں ہر لمحہ میری مدد کی۔

شیخ نور سلمیٰ

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف میسور

باب اول

﴿......سید احمد ایثارؔ۔ حالاتِ زندگی اور شخصیت......﴾

سرزمینِ کرناٹک میں کئی باکمال شعراء ہیں جن کی شاعری اورفنی کمالات پرمختلف تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے اور ان کے کلام کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے ادبی دنیا میں انہیں روشناس کروایا ہے۔انہیں میں سے ایک شخصیت سید احمد ایثآر کی ہے۔سید احمد ایثآر ادیب بھی ہیں شاعر بھی اور مترجم بھی۔ان کے تراجم اورتخلیقات اردوادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔
معروف ادیب سید عابد حسین رقمطراز ہیں کہ:

’’ قدرتی ادب کے پیدا ہونے میں دنیا بھر کے بکھیڑے ہیں۔زرخیز طبیعت کی زمین ہو جو ریاضت کے ہل سے جوتی جائے،اس میں خیال کے بیج پڑے،زندگی کے مشاہدے سے کھاد،ہوا،اور روشنی پہنچے،آرٹ کے ابلتے ہوئے سوتوں سے سینچائی ہو،تب جا کر کہیں شعروادب کی کھیتی اپجے اور اس سے وہ غذا حاصل ہو جس کی ہماری روح کو ضرورت ہو‘‘[1]

ادب کی تخلیق اورنشو ونما کے اس اصول کی روشنی میں ایثآر بالکل کھرے اترتے ہیں۔حقیقتاً ایثآر اپنی فکرو دانش کے روشن زاویوں،یقین کی مستقل گرمی اورعمل کی مسلسل حرارت سے ادب کی مختلف اصناف کی کئی برسوں سے آبیاری کررہے ہیں۔ایثآر ایک اہم تہہ دار شخصیت کے مالک ہیں۔اقبالیات میں انہیں اختصاص حاصل ہے۔اقبآل ان درخشندہ ادباء اورشعراء میں سے ہیں جن کےعلم وفن پرمضامین وکتب کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔اس دانائے راز کے پراسرار رازوں کی کھوج کا کام ان کی حیات ہی سے شروع ہو چکا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہورہا ہے۔ایک صدی سے زائد گزر جانے کے باوجود اقبآل کےفکروفن پر آج بھی

تخلیقی و تحقیقی کام شد و مد سے جاری ہے۔ایک ماہرِ اقبال کی حیثیت سے سید احمد ایثآر ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اقبآل کے نہ صرف ساتوں فارسی شعری مجموعوں کا بلکہ مولانا روم کی مثنوی معنوی کے مکمل چھ جلدوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔اس کے علاوہ فارسی کی مایہ ناز شخصیات مثلاً عمر خیآم کی رباعیات،سعدی شیرازؔی کی رباعیات اور حافظ شیرازؔی کی رباعیات کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان شعراء کے افکار کو اپنے تراجم میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہ تراجم اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

پیدائش:

ایثآر کی ولادت ۲۵ جولائی ۱۹۲۲ء کو ریاستِ کرناٹک کے ادبی و تہذیبی و ثقافتی شہر بنگلور میں ہوئی۔تعلیمی اسناد اور سرکاری ریکارڈ میں جو تاریخِ پیدائش درج ہے وہ خود ایثآر کے نزدیک درست نہیں ہے۔انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ:

> ''اس زمانے میں ان باتوں کا کہاں اتنا خیال رکھا جاتا تھا،ہماری اماں کہا کرتی تھیں کہ میں 7 محرم کو پیدا ہوا تھا۔انگریزی مہینہ انھیں یاد نہیں تھا البتہ سنہ وہی ہے ہوسکتا ہے چند دنوں یا ایک آدھ مہینے کا فرق ہو۔'' [۲]

چونکہ ان کی والدہ کے مطابق ان کی پیدائش ۷ محرم اور سنہ وہی ۱۹۲۲ ہے لہٰذا کلینڈر کے ذریعے کی گئی تحقیق کے اعتبار سے ان کی حقیقی تاریخِ پیدائش ۲۴ اگست ۱۹۲۲ء ہوگی۔

ایثآر کا آبائی وطن بنگلور ہے۔اسی شہر کے ایک بے حد حسین و جمیل خطے منی ریڈی پالیم میں ان کا بچپن گزرا۔بچپن کی زندگی ان کی یادوں کا اہم حصہ ہے۔انہیں خوبصورت حصاروں اور قدرتی نظاروں میں گھرا ہوا یہ شہر عظیم المرتبت نظر آتا ہے۔ان کے دادا کی زندگی اسی علاقے سے وابستہ تھی اور احباب و اقرباء کی آواجاہی نے ان کی زندگی کو اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ان کے پر دادا سید جہانگیر اور دادا سید میر فوجی تھے۔تین پشتوں

سے ان کا پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ان کے نانا محمد موسیٰ خان اور پرنانا عارف خان بھی فوج میں ملازم تھے۔غرض ان کے ددھیال اور ننھیال میں زیادہ تر افراد فوج سے وابستہ تھے۔

والد:

ایثآر کے والد سید جہانگیر نے خاندانی روایات کی مناسبت سے پیشہ اختیار کیا تھا۔وہ فوج میں میسور لانسرس میں ملازم تھے۔شفیق،ملنسار، بردبار، بہادر اور نیک سیرت انسان تھے۔خدا کی عنایت کی ہوئی خوبصورتی اور پھر خوب سیرتی سونے پر سہاگہ تھی۔فوج میں رہتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے ملک وقوم کے لئے اپنی خدمات انجام دیں۔انہوں نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران عرب ملکوں کے مختلف مقامات غزہ، بیت اللحم اور سواحلِ دریائے نیل وغیرہ پر خدمات انجام دی تھیں۔وہ نظم وضبط کے سخت پابند اور سخت گیر مزاج کے حامل تھے۔اپنے والد کا سراپا ایثآر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''میرے والد سید جہانگیر ،ایک راست قد، بلند قامت، لمبے ہاتھ، کشادہ صدر، بہادر اور جانباز سپاہی تھے۔بلند ناک ،گندمی رنگ، آنکھیں اور پیشانی نہ بڑی اور نہ چھوٹی۔۔۔۔آواز نہ کرخت نہ گرجدار مگر بلند پر زور تھی۔طبیعت بردبار، خوددار اور روادار پائی تھی۔'' [۳]

ایثآر نے اپنی خودنوشت ''سراغِ زندگی'' میں اپنے والد کی جرأت، دیانت، شرافت اور غیرت کو سراہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ بظاہر ان کے والد سخت تھے مگر حقیقتاً بے حد نرم مزاج تھے۔اپنی ضروریات سے زیادہ عزیز و اقارب کی ضروریات کو مقدم رکھتے تھے۔ان میں انکساری وجذبۂ خدمت کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔سخی اس قدر کہ مقروضوں کو ان کی پریشانی دیکھ کر قرض معاف کر دیتے تھے اور خوددار اتنے کہ اگر گھر میں اندھیرا ہو تو پڑوس سے تیلی تک لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ان کی سخاوت، دریا دلی اور فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنے پاس جو کچھ ہوتا اسے اللہ کی امانت سمجھ کر دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ہمہ وقت تیار رہتے۔کبھی بھی کسی کی مدد کرنے

سے کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ گھر میں حکم رہتا تھا کہ برتن خالی نہ رہیں نہ ہی کسی مہمان کو بنا کچھ کھلائے جانے دیا جاتا۔ ان کی اس صفتِ خاص سے نہ صرف عزیز و اقارب بلکہ غیر بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ بقول ایثارؔ:

''وہ کافی دریا دل بھی واقع ہوئے تھے، مانگنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا بعض اوقات ہمارے بچپن میں ہم روتے رہ جاتے لیکن ہمارے والد دوسروں کو نواز دیتے تھے۔''[۴]

سراغِ زندگی میں ایثارؔ نے کئی واقعات رقم کیے ہیں۔ جن میں درج ذیل واقعہ کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ایثارؔ رقمطراز ہیں:

''ایک شام کالج سے لوٹ رہا تھا کہ ایک گھوڑا گاڑی پاس سے گزری اور کچھ دور چل کر رک گئی۔ دیکھا تو اس پر ہمارے پڑوسی سید احمد سوار تھے۔ انھوں نے مجھے بھی سوار ہو جانے کو کہا۔ ان کا بدن تپ رہا تھا، سانس زور زور سے چل رہی تھی اور آنکھوں میں سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو تیز بخار ہے۔ فاصلہ خاموشی سے طے ہوا۔ گھر پہنچ کر چابی انھوں نے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ تالا کھول کر انہیں گھر کے اندر پہنچایا۔ ان دنوں منی ریڈی پالیہ اور قرب و جوار کے علاقوں میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بیماری پسوؤں کے کاٹنے سے لاحق ہوتی ہے۔ والد صاحب گھر آئے انہیں اطلاع دی۔ وہ جا کر بیمار کو دیکھ آئے اور بولے وہ طاعون کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بڑی مہلک اور متعدی بیماری ہے والد صاحب نے کہا'' بیمار کی نگہداشت ہمارا فرض ہے جان لو کہ موت آنے تک کوئی نہیں

مرتا۔ان کے گھر والوں کے آنے تک ہمیں دیکھ بھال کرنی
ہوگی۔''۵

ایثآر کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں ان کے والد محترم کا کلیدی رول رہا ہے۔انہیں اپنے والد سے بے حد عقیدت تھی۔وہ جب بھی ان کا ذکر کرتے ہیں تو طرزِ بیان اور گفتار سے والہانہ عقیدت ٹپکتی ہے۔ان کے والد کی کی گئی وصیت حرف بہ حرف آج بھی ان کے ذہن کے نہاں خانے میں موجود ہے۔ان کے والد کے یہ الفاظ زندگی کے ہر قدم پر رہنما بن کر ان کے ساتھ ساتھ رہے۔

''میں نے تجھے پڑھایا ہے۔اب تیرا فرض ہے کہ گھر بار کو سنبھالے۔میں نے اپنے پیچھے تمہارے لئے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔جینے کے لئے ہمت چاہئے ہمت ہو تو کوئی بھی مشکل نہیں رہتی۔ہمت کے بغیر زندگی دشوار ہوجائے گی۔اللہ پر بھروسہ رکھو اور ہمت سے جی کر دکھاؤ۔''۶

ایثآر کے والد اپنی مرحوم بہنوں کی اولاد کی کفالت عمر بھر بحسن وخوبی کرتے رہے۔اور ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کے والد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

والدہ:

ایثآر کی والدہ خدیجہ بی ایک نیک اور دیندار خاتون تھیں۔وہ بھی ان کے والد ہی کی طرح خوبصورت اور خوب سیرتی کی مثال تھیں۔ان کی تربیت کے زیر اثر ایثآر نے ذہن کی بند پرتوں کو کھولا۔ایثآر کی عمدہ تربیت کا اثر ان کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ان کی فیضِ تربیت نے ایثآر کی زندگی کو جلا بخشی۔اپنی والدہ کی تصویر کشی انہوں نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''میری والدہ خدیجہ بی، اپنی مثال آپ تھیں، گوری چٹی، خوب رو
، نازک اندام، نرم دل اوراطاعت شعار تھیں۔ بڑی سمجھدار اور
صابروشاکر ہستی، نازک اتنی کہ انھیں ایک زیور گلے کا پٹہ بھی بوجھ
لگتا تھا۔'' ۷

والد کے ہوتے ہوئے ایثآر کو جوراحتیں وخوشیاں میسر تھیں ان کی آنکھ بند ہوتے ہی سب کھو گئیں انہیں اچانک ہی دنیا بدلی بدلی سی نظر آنے لگی۔ حالات یکدم تبدیل ہوگئے۔لیکن حالات کی ستم ظریفی کے باوجود ان کی والدہ نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ پوری ذمہ داری سے اپنا فرض نبھایا۔بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ ایثآر والدہ کی خوبیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''والدہ صاحبہ اور ہم نے بھی زندگی کے طویل سفر میں بہت نشیب
وفراز، تنگی وکشادگی اور شادی وغم دیکھے ہیں۔ والدہ صاحبہ نے کبھی
شکوہ زبان پر نہیں لایا۔صبر وہمت نے ان کا بہت ساتھ دیا۔وہ
زندگی میں ہمیشہ چلتی پھرتی اور چاق وچوبند رہیں۔'' ۸

ایثآر کی والدہ صبر وشکر کا پیکر تھیں۔ جذبۂ خدمت سے ان کا دل لبریز تھا۔خویش واقارب ہی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی خیال رکھتی تھیں جن سے ان کی شناسائی تھی۔یتیموں کی فراخ دلی کے ساتھ پرورش کی ذمہ داری نبھاتیں ساتھ ہی ساتھ محلے اور پڑوس کے بچوں کی تعلیم وتربیت میں بھی پیش پیش رہتیں۔رقم کے بے جا اصراف سے بھی باز رہتی تھیں۔ کبھی اچھے زیورات کا شوق نہیں رکھا نہ ہی کسی قسم کی بناوٹ کو روا سمجھا۔ان کی زندگی بہت سادہ اور باعزم تھی۔انہوں نے والد کے بعد گھر کو بخوبی چلانے میں بڑااوراہم کردارادا کیا۔ ہمت وشجاعت، صبر وقناعت میں یکتا اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو فرض شناسی کے ساتھ ادا کرتی گئیں کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں۔اپنی والدہ کی سایۂ عاطفت میں ایثآر نے اپنی عمرِ عزیز کر ۶۹ سال گزارے۔۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ایثآر اس عظیم ہستی سے محروم ہوگئے۔ایثآر نے اپنے والدین کی اطاعت کو ہمیشہ اپنے ارادوں اور

خواہشوں پر مقدم رکھا ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والدین کا اہم حصہ رہا ہے۔

بھائی بہن:

ایثؔار کے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ بھائیوں میں سید عبدالغفور، سید اسمٰعیل اور سید عبدالرحمٰن ہیں۔ سید اسمٰعیل ۱۹۸۹ء میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ بہنوں میں سیدالنساء اور چھوٹی بہن بیگم (ان کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا اس لئے ان کا نام انہیں یاد نہیں) کی وفات ہو چکی ہے۔ ایک بہن رحمت النساء حیات ہیں۔ ان کے بھائی بہنوں میں کوئی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ البتہ سبھی برسرِ روزگار ہیں اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

تعلیم وتربیت:

ایثؔار کی ابتدائی تعلیم وتربیت بنگلور میں ہوئی۔ حضرت سید نصیرالدین چشتی القادری سے قرآن شریف ناظرہ کیا۔ پرائمری اور مڈل اسکول کی تعلیم میسور لانسرس (سوارلین اسکول) میں حاصل کی۔ سینٹرل ہائی اسکول، بنگلور سے میٹرک کا امتحان دیا لیکن ناکام ہو گئے، چونکہ اس دوران ان کے والد بھی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے لہٰذا گھریلو ضرورتوں کی تکمیل کے لئے نوکری کی غرض سے ان کے والد انہیں کمانڈنٹ بریگیڈ لیوکاس کے پاس لے گئے جہاں انہیں حوالدار کی نوکری کی پیش کش ہوئی تو ایثؔار کے والد کو بڑی مایوسی ہوئی کہ ان کے ہونہار فرزند کو ان کی امیدوں کے مطابق عہدہ نہیں دیا گیا چنانچہ انہوں نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور ایثؔار کو دوبارہ تعلیم جاری رکھنے کی تاکید کی۔ ایثؔار ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ افسر بنوں۔ اس لئے
> حوالدار کی نوکری کی پیشکش پر انہیں بہت غصہ آیا۔ اور انہوں نے
> اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور مجھے تعلیم جاری رکھنے کا حکم دیا۔'' [۹]

اس واقعہ کے بعد ایثؔار نے اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی اور دوبارہ میٹرک کا امتحان دیا اور ان کی

ذہانت ومحنت اور سچی علمی لگن نے انہیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔اس مرتبہ انہوں نے اچھے نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ان کی تعلیم ہنوز نامکمل تھی مزید تعلیم کا مسئلہ زیرِغور تھا مگر اسی دوران ان کے گھریلو حالات بہت خراب ہوگئے ان حالات میں انہوں نے تعلیم کو خیرآباد کہنا ہی مناسب سمجھا اور ملازمت کے لئے تگ ودو کرنے لگے۔کئی جگہ انہوں نے انٹرویو دیے اور بالآخر ہندوستان ایرکرافٹ لمیٹڈ (HAL) میں پروڈیکشن اسٹاٹسٹک ڈپارٹمنٹ میں کلرک کی ملازمت مل گئی۔ان کی تنخواہ ۶۵ روپے مقرر ہوئی۔ایثؔار اس ملازمت سے مطمئن تھے لیکن جب یہ خبر ان کے والد اور نانا کو ہوئی تو وہ بے حد ناراض ہوئے انہوں نے ایثؔار کو تعلیم جاری رکھنے پر زور دیا چونکہ داخلے کا وقت گزر چکا تھا مجبوراً ایک سال وہیں لازمت کرتے رہے اور پھر ایک سال بعد ملازمت ترک کر کے ۱۹۴۵ء میں دوبارہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۷ء میں سینٹرل کالج بنگلور سے بی ایس سی کی سند حاصل کی۔

ملازمت:

بی ایس سی کی تکمیل کے بعد انہیں ملازمت کا مسئلہ درپیش تھا۔ایک طرف انہیں ان کی قابلیت کے مطابق کوئی ملازمت نہیں مل رہی تھی دوسری طرف معمولی عہدوں پر کام کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔بہت پہلے ہی حوالدار کی ملازمت کو بھی ٹھکرا چکے تھے۔ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ محکمۂ جنگلات میں ملازمت کریں ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کے والد کی غوث نواز خان سے دیرینہ تعلقات تھے۔غوث نواز خان قادر نواز خان (Member of Representative Assembly) کے بھائی تھے۔ایثؔار کی ہمت بڑھی۔غوث صاحب نہایت شفیق ملنسار شخصیت کے مالک تھے وہ انہیں اسمٰعیل شریف کے پاس لے گئے۔اسمٰعیل شریف حکومتِ میسور کے جنرل سکریٹری تھے انہوں نے ایثؔار کی ہمت افزائی کی اور انہیں مختلف مشوروں سے نوازا۔اسی دوران انہیں اپنے والد کی ناگہانی وفات کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔گھر کے حالات جو کہ والد کی زندگی ہی میں مائل بہ زوال تھے انکی رحلت کے بعد مزید ابتری کا شکار ہوگئے۔ایثؔار رقمطراز ہیں:

''والد صاحب کے انتقال سے ہماری زندگی سنبھلتے سنبھلتے اچانک

لڑکھڑا گئی تھی۔ میں اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ایسا حواس باختہ
اور پریشان ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔اب تک تعلیم میرے
لئے ایک بڑا چیلنج تھی جسے میں نے ایک روشن مستقبل کی آرزو
میں ایک آہنی عزم کے ساتھ مکمل کیا تھا۔اب تو پوری زندگی ایک
چیلنج معلوم ہورہی تھی۔اچانک گھر کا بوجھ میرے کندھوں پر آپڑا
تھا۔جو نوکری میرے ہاتھ میں تھی وہ بھی میں نے چھوڑ دی
تھی۔کاش! میں نے استعفانہ دیا ہوتا۔زندگی پلٹ کر اسی موڑ پر
آگئی تھی کہ جو بھی نوکری مل جائے اسے قبول کرلوں۔''[۱۰]

محکمۂ جنگلات میں ملازمت کی عرضیوں کی طلبی کے لئے ابھی وقت تھا لہٰذا انہوں نے اس عرصے معاشی مسئلے سے نمٹنے کے لئے First Service Rehabilitation Centre میں ملازمت کرلی بحیثیت استاد ان کی ماہانہ تنخواہ ۱۲۵روپے تھی یہاں ان کا کام سپاہیوں کو پڑھانا تھا۔ایک سال بعد محکمۂ جنگلات میں رینجری کے لئے عرضیاں طلب کی گئیں اور خوش قسمتی سے ایثارؔ انٹرویو میں کامیاب ہوئے اور انہیں رینجر ٹریننگ کے لئے منتخب کرلیا گیا۔وہ لکھتے ہیں:

''تازہ تازہ گریجویٹ بننے کے بعد سوچتا تھا کہ شاید میری تعلیم ختم
ہے۔مزید کچھ حاصل کرنا ہے تو مجھے اپنے شوق کی تسکین کے لیے
از خود سیکھنا ہوگا۔لیکن خدا نے میری قسمت میں ابھی کچھ رسمی تعلیم
رکھی تھی جس کا مجھے علم نہیں تھا۔[۱۱]

رینجرس ٹریننگ میں تھیوری کلاسیس ہوتی تھی جس میں soil science topographical survey,selviculture,utilization وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔عملی تربیت (Practical) مختلف جنگلات میں ہوتی تھی۔آگمبے، بھدراوتی، کیرالا، کاکن کوٹے وغیرہ مقامات پر ان کی عملی تربیت ہوئی۔اس

عملی تربیت کے دوران اپنے تجربات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''پہلی بار بہت قریب سے جنگل کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد جنگل کے بارے میں میرے تصورات اور خیالات میں تبدیلی آنے لگی۔جنگل قدرتی ہوں یا مصنوعی، صرف پیڑ پودوں، جڑی بوٹیوں، پھولوں، بیلوں کا ایک وسیع و عریض جمگھٹا نہیں۔یہ مختلف قسم کے رنگ برنگے پرندوں کا بسیرا ہے، چرندوں، درندوں اور حشرات الارض کا مسکن بھی ہے۔ان ہی جنگلوں کے اندر کہیں کہیں انسانی قبائل بھی آباد ہیں، جن تک تہذیب و تمدن کی کرنیں ابھی تک نہیں پہنچی ہیں۔جیسے جیسے ٹریننگ آگے بڑھی میری معلومات اور تجربات میں مزید اضافہ ہوا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹریننگ واقعی سخت ہوتی ہے۔بعض اوقات آدمی کو قدم قدم پر اپنی قوت برداشت کا امتحان دینا پڑتا ہے۔''[۱۲]

کڑی مشقت کے باوجود انہوں نے اپنی ٹریننگ کامیابی کے ساتھ مکمل کرلی۔اسی دوران کھڈا آپریشن بھی انجام پایا ایثؔار نے اس مشن کی تفصیل بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنی خودنوشت میں تحریر کی ہے۔ٹریننگ کے بعد امتحان کا مرحلہ تھا۔ایثؔار نے اپنی لیاقت اور کارکردگی کی بنا پر ڈھیر ساری توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ان کے دوستوں کو بھی پورا یقین تھا کہ وہی اول مقام حاصل کریں گے اس لئے انہوں نے دوستوں کے تقاضوں پر سب کی دعوت کردی اور فلم دکھانے کا مطالبہ بھی پورا کیا لیکن نتائج ان کی امید کے برخلاف نکلے۔سفارش اور خانگی تعلقات کام آئے اور پہلا رینک محمد حنیف کو ملا جو عبدالرحیم کمشنر (بنگلور) کے داماد تھے کالج کے پرنسپل اور عبدالرحیم گہرے دوست تھے۔دوسرا رینک ایم۔وی رنگاراؤ کو ملا جو ریاستی وزیر داخلہ ایم۔وی راما راؤ کے رشتہ دار تھے۔اور ایثؔار کے حصہ میں تیسرا رینک آیا۔اس ناانصافی پر ایثؔار بے حد دل برداشتہ ہوئے۔اپنی مایوسی

کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

''اس نتیجے سے میں بہت دل شکستہ ہوا۔میری سادہ لوحی کے ساتھ یہ ایک مذاق تھا۔میری خود اعتمادی کو ٹھیس سی پہنچی تھی۔''۱۳؎

ایثآر کو محمد حنیف کی ماتحتی میں فاریسٹر کی حیثیت سے بھیجا گیا۔انہیں یہ ملازمت پسند نہیں تھی لیکن گھریلو حالات ایسے تھے کہ انہیں یہ عہدہ قبول کرنا پڑا۔اسی دوران ان کے ساس سسر نے ان کی ہمت بندھائی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ یا دہرادون بھیجیں گے۔تقدیر ان پر مہربان تھی وہ محض پانچ ہفتوں ہی میں رینجر بن گئے۔اگر چہ انہیں اپنی توقعات کے مطابق عہدہ نہیں ملا لیکن اس کی تلافی یوں ہوئی کہ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے 1954ء میں حکومت کی طرف سے واشنگٹن یونیورسٹی، امریکہ گئے۔

یونیورسٹی میں داخلے کے بعد ایثآر اپنی تھیسس کی موضوع کے انتخاب کے لئے فکر مند تھے۔ایک مرتبہ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ ہال میں تمام طلباء پروفیسر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ایثآر کھڑکی سے ڈگلس فر کے کراؤن کے مشاہدے میں مصروف تھے یکا یک پروفیسر کی نظر ان پر پڑی انہوں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ایثآر نے جواب دیا کہ ''ڈگلس فر کے کراؤن کو دیکھ رہے ہیں۔ان کے پروفیسر نے فوری طور پر موضوع طے کر دیا جس کا عنوان تھا

"The effect of application to arrtificial fertilizer on height radial branch growth of 35 years old Daglas FIR"

چنانچہ اس موضوع کے متعلق ڈاکٹر فوزیہ چودھری رقمطراز ہیں:

''ڈگلس فر کی نشو ونما پر لکھنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ یہ درخت کئی سال بعد بڑا ہوتا ہے۔چند ماہ میں اس کی نشو ونما پر تھیسس داخل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ڈگلس فر پر تھیسس لکھنے کا ایثآر صاحب کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔ایک وقتی چوک نے انہیں یہ

ذمہ داری سونپی تھی جو انہوں نے پوری کی۔''۱۴؎

اس موضوع کے تعین کے بعد انہوں نے پوری محنت اور لگن سے تحقیق شروع کی۔کئی تجربے کئے، جس میں کئی درخت کاٹے، پتوں کو تولتے، شاخوں اور تنوں کا باریکی سے جائزہ لیتے، درختوں کے ہر ایک حصہ کی سالانہ نشو ونما کا جائزہ لیتے غرض یہ موضوع نہایت باریک بینی، محنت اور توجہ کا متقاضی تھا جسے ایثارؔ نے بحسن وخوبی مکمل کیا۔اس تحقیق کے لئے وہ کالج سے تقریباً ۸۰میل دور یونیورسٹی کے اطراف پھیلے ہوئے گھنے جنگل کے وسط میں تین مہینے تک بالکل تنہا رہے۔اس واقعہ کی منظر کشی ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے یوں کی ہے:

''کوئی انسان تھا نہ جانور، صرف ایک کتا 'بلیکی' آتا جاتا تھا، نہ کھانا ملتا، نہ ہوٹل تھا، ڈیڑھ میل دور چلنے پر کچھ کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔بس صبح سے شام تک ایک ''ہو'' کا عالم ہوتا تھا۔''۱۵؎

اس اقتباس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ حصولِ علم ان کا واحد نصب العین تھا اور اسی نصب العین کے لئے انہوں نے دیگر رعنائیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔غرض بے انتہا اور مسلسل محنت کرتے ہوئے انہوں نے دو سالہ مدت میں اپنی تھیسس مکمل کی اور ۱۹۵۶ء میں یونیورسٹی آف واشنگٹن سے ماسٹر آف فاریسٹری کی ڈگری حاصل کرلی۔

امریکہ سے واپسی کے دوران وہ بے انتہا خوش اور مطمئن تھے۔ہاتھ میں ایم ایف کی ڈگری تھی انہیں یقین تھا کہ اب ان کی زندگی کے خوشگوار دن شروع ہونے کو ہیں۔لیکن ایسا نہ ہوا۔شاید اللہ کو کچھ اور منظور تھا نیز ایثارؔ کی زندگی کا امتحان اب بھی باقی تھا اور ضروری بھی نہیں کہ زندگی میں ہمیشہ آسانیاں ہی مقدر بنیں۔کبھی کبھی مشکلات انسان کے سامنے زندگی کے ایسے بیش قیمتی راز افشا کردیتی ہے جس کا خیال وگماں بھی نہیں ہوتا۔جہاں آسانیاں زندگی میں خوشیاں لاتی ہیں وہیں مشکلات زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتی ہیں۔ایک نیا جوش عزم واستقلال پیدا کرتی ہیں۔باوجود ایم ایف کی ڈگری کے محکمۂ جنگلات میں ایثارؔ کے لئے کوئی اسامی خالی

نہ تھی۔اس دوران ریاستوں کی تشکیل بھی اس کی ایک اہم وجہ تھی ،مگر ایثآر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں میں سے نہ تھے وہ مسلسل کوشش میں لگے رہے ،کئی دفعہ اعلیٰ محکموں کے دفتروں کے چکر کاٹے مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔اکثر لوگ ان کی ڈگری کا مذاق اڑاتے ،مگر وہ ضبط کر جاتے۔کچھ لوگوں نے انہیں ہندوستان سے باہر غیر مما لک میں نوکری کرنے کا لالچ دیا جس پر انہیں بے انتہا غصہ آیا۔اس واقعہ کا ذکر وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ریسرچ سینٹر میں سلوی کلچر سٹ سید حسین صاحب کا تبادلہ ہوگیا تو ان کی جگہ رینجرس گریڈ سے ترقی حاصل کر کے جناب گلواڈی آئے۔خاموشی سے میرا کام چلتا رہا اور دن گزرتے رہے۔گلواڈی صاحب کوئمبتور کالج سے گریجویٹ تھے۔ایک دن ان کا بھی تبادلہ ہوگیا تو دیشمکھ صاحب سلوی کلچر سٹ بن کر آئے۔وہ سید حسین صاحب کی طرح ایڈنبرگ،انگلینڈ کے فاریسٹ گریجویٹ تھے۔وہ ابھی پروبیشنر تھے کہ ریاستوں کی تشکیلِ نوعمل میں آئی تھی۔پتہ نہیں ان کو کیا سوجھی کہ ایک دن بلاوجہ مجھ سے کہا کہ Why dont you go away to west Bengal,because people with your qualification are required there.

یہ بات ایثآر کو بہت ناگوار گزری اور انہوں نے پلٹ کر کہا کہ

Why dont you go back to your state Hyedrabad.I have born and brought up here and would like to be buried here.' [۱۶]

بہت مشکلات کے بعد بالآخر ان کا تقرر بحثیت سلیپر پاسنگ A.S.F شیموگہ میں ہوا۔خوش قسمتی سے یہاں انہیں ادبی ماحول بھی فراہم ہوا۔یہاں ان کی ملاقات اسد اعجاز سے ہوئی۔جو شاعر وادیب تھے

انہوں نے شیموگہ میں ''بزمِ اردو'' کی بنیاد رکھی۔جس میں وہ سکریٹری تھے اور انہوں نے ایثؔار کو صدر بنایا۔اس بزم میں ہر مہینہ مشاعروں کا انتظام کیا جاتا تھا۔شعروادب کا ذوق رکھنے والے افراد کے لئے یہ بزمِ اردو خوشگوار ثابت ہوئی۔

ملازمت کے دوران ایثؔار متعصب لوگوں کی تنگ نظری کا نشانہ بھی بنے لیکن انہوں نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہر قدم ہر موڑ پر ان کے راستے میں رکاوٹیں حائل ہوتی رہیں ،مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہے ،افسروں کے ترش و تلخ رویوں سے کبھی ان کے حوصلے ماند نہیں پڑے۔ان کا عزم کسی مقام پر متزلزل نہیں ہوا ان کا سفر کامیابی کی جستجو میں رواں رہا۔وہ ثابت قدم رہے اور مسلسل ترقی کے زینے چڑھتے رہے۔ملازمت کے دوران انہوں نے بنگلور،شیموگہ،تریکیرے،کندہ پور،ٹمکور، چامراج نگر،ساگر،منگلور وغیرہ مقامات پر اپنی خدمات انجام دیں اور مختلف عہدوں پر فائز ہوئے جیسے،رینج فاریسٹ آفیسر،اسسٹنٹ کنزرویٹر آف فاریسٹ،سلیپر پاسنگ آفیسر،ریلوے سلیپر آفیسر،چیف وائلڈ لائف وارڈن ،مینیجنگ ڈائرکٹر اینڈ کنزرویٹر آف ربر پلانٹیشن اینڈ فیکٹریس وغیرہ۔

ملازمت کے دوران انہوں نے بے لوث خدمات انجام دیں۔ان کی زندگی صاف شفاف آئینے کی مانند رہی۔مالی مشکلوں کا سامنا کیا کبھی عیش وعشرت کی خاطر رشوت نہیں لی نہ کوئی غلط کام کیا۔تمام فرائض ایمانداری کے ساتھ بحسن خوبی انجام دئے اور اگست ۱۹۸۰ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔بقول ایثؔار:

> ''روزگار کے لئے جدوجہد کا آغاز جس مقام سے شروع کیا تھا وہ سفر کئی مرحلوں اور منزلوں سے گزر کر اسی مقام پر آکر بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوا۔محکمۂ جنگلات کی ملازمت میرے لئے ایک مہم سے کم نہیں تھی۔اللہ کی طرف سے صبر وتحمل ،عزم واستقلال اور ایک مثبت فکر ونظر کی بدولت میں یہ مہم سر کرنے میں کامیاب رہا۔'' [۱۷]

اس ضمن میں پروفیسر م ن سعید رقمطراز ہیں:

''رینجری سے چیف کنزرویٹری کے بتیس سالوں کی ملازمت کے دوران ایثآر صاحب پر کیا گزری،کیسی کیسی زیادتیاں سہیں،کیسی کیسی حق تلفیاں جھیلیں، یہ حکایت دراز تو ہوسکتی ہے، اس کے لذیذ ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ معشوق ملازمت کی عشوہ طرازیوں کا قتیل کون نہیں ہے؟ سمجھتا ہر ایک یہی ہے کہ یہ التفاتِ خاص اسی پر ہوا ہے۔ یہ عزت قبلہ ایثآر صاحب کے لئے کیا کم ہے کہ وہ اس دارالمحن سے بے داغ ،سرخرو،اور سر بلند نکل آئے۔''[۱۸]

ایثآر نے اپنے ان محسنوں کا بھی بغیر تکلف کے ذکر کیا ہے جنہوں نے ملازمت کے دوران پیش آنی والی مشکلات کو دور کرنے میں ان کا ساتھ دیا اور ان کی مہربانیوں کے بھی خوب تذکرے کئے ہیں۔جن میں سب سے پہلے سبر امنیم صاحب کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جن کی رفاقت پوری ملازمت میں ان کے لئے کسی سائبان سے کم نہیں تھی۔ یہ وہ شخص تھے جنہوں نے ایثآر کو ان کا حق دلانے کے لئے اپنے افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیاں بھی برداشت کیں لیکن اپنے فرض سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔دراصل رینجروں کی ترقی کے معاملات میں جب بھی ان سے فائل طلب کی جاتی سبر امنیم صاحب اپنا فرض نبھاتے ہوئے پرموشن کے مستحق افراد کی فائل چیف کنزرویٹر کڈامبے کے سامنے رکھ دیتے جن میں ایثآر کا نام بھی شامل ہوتا مگر کڈامبے صاحب ہمیشہ اس فائل کو دیکھ کر برہم ہو جاتے ایک مرتبہ تو انہوں نے حد ہی کر دی اور فائل سبر امنیم کے منہ پر دے ماری جس پر وہ بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ایثآر کہتے ہیں اس قدر ذلت کے باوجود سبر امنیم کے یہ الفاظ تھے:

''میرا فرض ہے کہ محکمہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی موجودگی کا ذکر کروں۔ورنہ فرض سے چشم پوشی متصور ہوگا۔جو سخت گناہ اور کوتاہی ہے۔ مجھے اپنے برے انجام کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے۔''[۱۹]

ایثؔار کے ایک اور ہمدرد ورفیق کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ایس اے رزاق صاحب تھے جنہوں نے بہت ہی صبر آزما حالات میں ان کا ساتھ دیا۔ ایثؔار نے انہیں رحمت کے فرشتہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور ان کے مدد کرنے کا طریقہ بھی منفرد تھا لکھتے ہیں:

''انہوں نے میری پوری کہانی سنی اور ماندانہ رکاوٹوں کو دور کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے ابھی تک اپنے معاملہ میں کسی سیاستدان کی مدد حاصل کرنے سے گریز کیا تھا۔ لیکن بزرگوار جناب رزاق صاحب کی صاف گوئی، ہمدردانہ سلوک اور بے لوث خدمت کا جذبہ دیکھ کر ایک گونہ کشش محسوس کی اور دل سے ان کی حمایت حاصل کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ بھی عجیب آدمی نکلے۔ میرے کیس کو قبول کرنے سے قبول کرنے سے پہلے درج ذیل شرائط پیش کر کے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ ۱۔ جب تک تمہارے کیس میں کامیابی نہ ملے مجھے اپنے گھر بلانے کی زحمت نہ کرنا۔ چائے وائے کی پیش کش بھی نہ کرنا۔ ۲۔ جب بھی میرے ساتھ کہیں جانا پڑے تو بس کا ٹکٹ میں خریدوں گا۔ ۳۔ جب بھی میری موجودگی کی ضرورت محسوس ہو تو صرف بارہ آنے کا ٹیلی گرام کر دینا میں باسط سرائے میں ملوں گا۔ ۴۔ جب تمہارا کام ہو جائے تو اپنے گھر پر میری ضیافت کرو، پھولوں کا ہار پہناؤ اور میرے بچوں کے لئے ایک ڈبہ مٹھائی دو۔''[۲۰]

یقیناً رزاق صاحب ایثؔار کے لئے کسی فرشتہ سے کم نہ تھے۔ انہوں نے ایثؔار سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور ایثؔار نے بھی ان کی شرطوں کو پورا کیا۔ اس طرح کی بے لوث اور بنا غرض کی خدمت کرنے والے افراد کسی بھی

دور میں مشکل ہی سے میسر آتے ہیں۔ایثاؔر محکمۂ جنگلات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے لیکن حاکمانہ انداز ان کے مزاج میں نہ تھا۔انہوں نے ہمیشہ اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔اورضرورت مندوں کے مسائل کوحل کرنے کی کوشش کی۔

ازدواجی زندگی:

اپنے والد کی وفات کا ایثاؔر پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔روشن مستقبل کے خوابوں میں گم ایثاؔر پر یہ حادثہ قیامت بن کر گزرا۔انہیں اپنی دنیا ہی تاریک نظر آنے لگی۔وہ بے حد دلبرداشتہ حالات سے گزر رہے تھے۔ایسے میں شادی کے لئے لڑکی والوں کی طرف سے پیام وصول ہوا۔ایثاؔر ایک طرف والد سے ابدی جدائی کے دکھ اور دوسری طرف اقتصادی حالات سے پریشان تھے۔ایسے حالات میں رشتۂ ازدوج میں منسلک نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن والدہ کی منشاء کے آگے سر جھکا دیا۔چنانچہ منگنی رسم طے پائی اور تقریباً ایک سال وقفے کے بعد ۱۹ جون ۱۹۴۹ء کو ان کا نکاح آصفہ بیگم سے ہوا۔آصفہ بیگم کے والد صدیق خاں ریاستِ میسور میں محکمۂ صنعت وتجارت کے صدر دفتر میں سپریٹنڈنٹ تھے۔دادا احمد علی خان میسور میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے نانا عثمان کا شمار بنگلور کے رؤسا میں ہوتا تھا اور پرنانا شیر خان بڑے زمیندار تھے۔آصفہ بیگم کے دو بھائی اور چار بہنیں تھیں۔آصفہ بیگم سب سے بڑی تھیں انہوں نے معاشی خوش حالی،خوش سلیقگی اور خوش مزاجی کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔نکاح سے قبل ایثاؔر کو آصفہ بیگم سے متعلق کافی خدشات تھے جو غلط ثابت ہوئے۔وہ رقمطراز ہیں:

> ''پہلے اپنی ہونے والی بیوی کے بارے میں بھی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا تھا۔بڑے باپ کی کھاتے پیتے گھر کی بیٹی اور ایک رئیس کی نواسی ہے۔کھاتے پیتے گھر کی لڑکی ہے،نازونعم میں پلی ہوئی،غریب خانے میں،ہم غریبوں کے ساتھ خوش رہے گی بھی یا نہیں وغیرہ وغیرہ،لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری بیوی نے ہر حالت میں میرا ساتھ دیا،ہر جگہ قریہ ہو کہ قصبہ جنگل ہو کہ

شہر، میرے ساتھ رہی میری خدمت کی۔ نہ انقباض میں گھبرائیں
اور نہ انبساط میں پھولیں، ہمارے آپسی وقار کو کبھی دھکا لگنے نہیں
دیا۔''[۲۱]

ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ شادی کے دوسرے سال جب انہیں ماہانہ تنخواہ جو ۷۰روپے تھی ملی۔انہوں نے ۲۲روپیوں کی ساڑی انہیں بطور تحفہ خرید کر دی۔ایثؔار کو امید تھی کہ وہ خوشی کا اظہار کریں گی مگر نتیجہ امید کے برخلاف نکلا۔آصفہ بیگم نے وہ ساڑی اٹھا کر پھینک دی۔چنانچہ دوسرے ماہ جب انہیں تنخواہ ملی تو وہ خود آصفہ بیگم کو خریداری کے لئے ساتھ لے گئے جہاں انہیں نہ صرف تنخواہ کے علاوہ اور پیسے خرچ کرنے پڑے بلکہ دکاندار کے پاس کچھ قرض بھی لینا پڑا۔وہ کہتے ہیں:

''اس کے بعد اگلے مہینے پوری تنخواہ میں نے بیگم کے ہاتھ میں
رکھ دی اور کہا 'یہ میری تنخواہ ہے ہر مہینے اسی طرح آپ کو مل جائے
گی اگر اس کے علاوہ ٹی۔اے (سفری بھتہ) ملا تو بھی آپ کو لا کر
دے دوں گا۔آج کے بعد پورے گھر کی ذمہ داری آپ کی
ہے۔جو بھی کھلائیں گی کھا لوں گا جو بھی پہنائیں گی پہن لوں گا۔
سگریٹ، چائے یا پان وغیرہ کا شوق نہیں۔صرف مطالعے کا شوق
ہے شاید ایک آدھ کتاب کی ضرورت ہو۔اگر عزت اور خودداری
کے ساتھ زندگی گزارنا ہو تو اسی رقم میں گزارا کرنا ہوگا اور مستقبل
کے لئے کچھ پس انداز بھی کرنا ہوگا۔''[۲۲]

ایثؔار کے یہ الفاظ ان کے دل میں اتر گئے اور ساری زندگی انہوں نے بڑی ہی خوش اسلوبی سے اس نصیحت پر عمل بھی کیا۔انہیں ایثؔار کے ادبی مشغلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ایثؔار کی کامیابی میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ذاتی معاملات ہوں یا ملازمت کے مسائل ہر قدم پر انہوں نے ایثؔار کا ساتھ دیا۔زندگی میں آنے والے نشیب و فراز میں وہ ہمیشہ ثابت قدم رہیں زندگی کے ہر سکھ دکھ بخوشی برداشت کرتی رہیں مگر کبھی حرفِ

شکایت زبان پر نہ لائیں ۔ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''تڑسا کو جب تبادلہ ہوا تو نقشہ ہی بدل گیا۔گھر بالکل جنگل کے کنارے، دو تین پختہ مکانات اور آس پاس چند گھاس پھوس کے مکانات پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں ،سو دو سو فیٹ کے فاصلے سے گھنا جنگل شروع ،شہر کی لڑکی پھر بھی نہ گھبرائی ، گود میں چھوٹی بچی اور ساتھ میں آصفہ بیگم کی چھوٹی بہن ایک نوکر۔معلوم نہیں اس مقام پر آ کر کیسا محسوس کیا لیکن کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔''۲۳؎

آصفہ بیگم نہایت سنجیدہ، نیک اور سلیقہ شعار تھیں انہوں نے اپنے شوہر اور اولاد کے آرام کا ہمیشہ خیال رکھا۔ایثآر کا ہر معاملے، ہر حال میں ساتھ دیا۔انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں اور سلیقہ مندی سے نہ صرف گھر کو سنبھالا اور سنوارا بلکہ ایثآر کو گھریلو ذمہ داریوں سے یکسر آزاد کر دیا۔شہر ہو یا جنگل، راحت ہو یا مشکلات آصفہ بیگم ہمیشہ ثابت قدم رہیں۔ایثآر کی فقید المثال کامرانیوں اور عدیم النظیر فتوحات میں ان کی اہلیہ کا تعاون کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ان کا ساتھ باہمی اعتماد، خلوص و مروت اور ایثار کی عمدہ مثال ہے۔۵۶ برسوں کا حق رفاقت ادا کرتے ہوئے جون ۲۰۰۵ء کو طویل علالت کے باعث آصفہ بیگم خالق حقیقی سے جاملیں۔

اولاد:

ایثآر کو قدرت نے پانچ بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا تھا۔جن میں ایک بیٹی بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئیں اور بقیہ سبھی شادی شدہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔پہلی بیٹی سیدہ حمیدہ بانو ان کے شوہر سید نعیم الدین ہیں گلبرگہ کے رہنے والے ہیں ۔انہوں نے محکمۂ جنگلات میں بحیثیت ڈپٹی کنزرویٹر اپنی خدمات انجام دیں۔اب ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔دوسری بیٹی سیدہ سعیدہ بانو ان کے شوہر ڈاکٹر شیخ

ثناور باشا ہیں انہوں نے اگری کلچر کالج بنگلور میں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں اس کے علاوہ بنگلور میں ’’بنگلور اکیڈمی‘‘ کے نام سے ٹیٹوریل چلارہے ہیں۔تیسری بیٹی سیدہ آفتاب بانو ان کے شوہر ڈاکٹر سعید الرحمٰن صدیقی امریکہ میں مقیم ہیں۔امریکہ کے نامور ڈاکٹروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔چوتھی بیٹی سیدہ فردوس ان کے شوہر محمد امتیاز B.E اسلامیہ کالج بنگلور میں ملازم ہیں۔سبھی خوشحال ہیں۔بڑے بیٹے سلطان احمد انجینیر نگ کے پیشے سے وابستہ ہیں ان کی اہلیہ B.A خاتونِ خانہ ہیں۔دوسرے بیٹے نورالہدیٰ نے گریجویشن کے بعد ڈائری فارمنگ اور جانوروں کی افزائشِ نسل کا پیشہ اختیار کیا۔ان کی اہلیہ سیدہ یاسمین نے بی فارمہ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ایثآر کے بچے ان کی فیضِ تربیت سے نہایت خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔

اساتذہ:

انسانی شخصیت و کردار کی تکمیل میں جہاں انسان کے گھریلو حالات ،بچپن کا ماحول،والدین کی تربیت،سماجی ومعاشرتی حالات،ذات کے جذباتی ونفسیاتی دھارے اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں شخصیت کی تعمیر میں وہ شخصیات اور ہستیاں بھی موثر کردار ادا کرتی ہیں جن کی انگلی تھام کر انسان تعلیمی مدارج طے کرتا ہے۔خوش قسمتی سے ایثآر کو ابتداء ہی سے بے حد مخلص اور باصلاحیت اساتذہ کرام کی رہنمائی نصیب ہوئی جنھوں نے ان کی شخصیت میں رسوخ اور علمی پختگی پیدا کردی۔ایثآر اپنے اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے ہیں اوران کے فضل ومحاسن کا دل کھول کر اعتراف کرتے ہیں۔ان کے اساتذہ میں اول الذکر اور اہم نام حضرت عبدالواسع عصری کا ہے۔جو اپنے عہد کے ممتاز شاعر بھی تھے۔عصری صاحب تمنا تخلص کیا کرتے تھے۔ان کے کلام کے چند اشعار پیش ہیں۔

تبسم نہیں یہ گل افشانیاں ہیں
تکلم نہیں یہ غزل خوانیاں ہیں

ترے گھر کی جانب نمازوں میں رخ ہے
ترے در پہ سجدوں میں پیشانیاں ہیں

تمنا نہ راحت ہے ہم کو جہاں میں
پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں

ایثؔار کو مطالعے کا شوق، فارسی سے لگاؤ، شعر وادب کا ذوق، اسلامیات سے شغف عصری صاحب کی تعلیم وتربیت کی بدولت ہی پیدا ہوا۔ وہ کہتے ہیں:

''مطالعے کا شوق تو مجھے مڈل اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں پڑ گیا تھا۔ میری ابتدائی تربیت اور شعر وادب کا ذوق میرے محترم عبدالواسع عصری صاحب کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنے شاگردوں میں پوشیدہ جوہرا جاگر کرنے میں ماہر تھے۔''۲۴؎

ایثؔار کی ذہنی تربیت میں عصری صاحب کا اہم کردار رہا ہے۔ اس زمانے میں اساتذہ بچوں کی محض تعلیم ہی نہیں بلکہ ان کی ذہنی واخلاقی تربیت میں بھی پورا پورا حصہ لیتے تھے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''راتوں کو گلی گلی گھوم کر دیکھتے کہ کون پڑھائی میں مشغول ہے اور کون کھیل کود میں۔ کھیل کود میں پکڑے جانے والوں کا سخت مواخذہ ہوتا۔ امتحانوں کے قریب سب بچوں کو بستروں کے ساتھ اسکول آکر راتیں گزارنی پڑتی تھیں۔ وہ بھی ہمیں آکر پڑھاتے اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ اپنا آرام چھوڑ کر بچوں کی پڑھائی میں اس قدر دلچسپی لینے والے اساتذہ 'النادر کالمعدومؔ' کے برابر ہیں۔''۲۵؎

ایک اور استاد مولوی محمد خاں کے متعلق رقمطراز ہیں:

'' مولوی محمد خاں صاحب اردو کے لکچرر تھے۔ ان کا طریقۂ

تعلیم بہت پرلطف ہوا کرتا تھا۔زبان شستہ اور اندازِ بیاں نہایت
سلجھا ہوا ہوتا کہ باتیں دل میں کھب جاتیں۔قدم قدم پر لطیفوں
کی بوچھاڑ، لکچر ایک خوان نعمت کی طرح ہوتا تھا۔پڑھائی کبھی
بوجھ محسوس نہیں ہوئی۔'' ۲۶

ان کے علاوہ آغا محمد صالح، منشی احمد شریف آزاد، اور سید نصیرالدین صاحب حسینی چشتی القادری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سفرِ امریکہ:

جب ایک مسافر کسی سفر کے لئے روانہ ہوتا ہے تو اس کے دل میں خوشی وغم کے ملے جلے جذبات کا ایک عالم ہوتا ہے۔ایک طرف اپنے وطن اور گھر الوں کی جدائی کا احساس، ان کی خیر وعافیت کی فکر تو دوسری طرف اپنے سفر کے مراحل کا خیال، نیا ملک، نئ جگہوں کے متعلق مختلف اندیشے وخیالات ہوتے ہیں۔سید احمد ایثاؔر ۱۹۵۴ء میں پہلی مرتبہ امریکہ کے لئے روانہ ہوئے۔اس سفر کی غرض وغایت M.F ماسٹر آف فاریسٹری کی ڈگری حاصل کرنا تھا۔اس کے بعد بھی وہ کئی مرتبہ اپنی دختر سے ملنے گئے۔انہوں نے دورانِ سفر پیش آئے اپنے تمام مشاہدات و واقعات، تجربات، اور قلبی تاثرات کو تفصیل کے ساتھ سراغِ زندگی میں تحریر کیا ہے۔انہوں نے اپنی تحریر میں جہاں اپنی تعلیم کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بیان کیا ہے وہیں امریکہ کی تہذیب وتمدن ثقافت ومعاشرت، رہن سہن، رسم ورواج وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔انہوں نے مغربی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ان کے مطابق شہر کا معیارِ زندگی بلند ہے۔یہاں کے باشندوں کی تمدنی سہولت فراہم کرنے میں جس محنت اور حسنِ انتظام سے کام لیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین وستائش ہے۔عام طور پر امریکی عوام دیانت دار ہوتے ہیں اور فرض شناسی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ایثاؔر رقمطراز ہیں:

''بعض امریکی اپنی کمائی میں اضافہ کی غرض سے راستوں پر سیب
،اخبار جیسی اشیاء فروخت کرتے تھے۔ٹوکرے میں چیزیں رکھ کر

قیمت کی ادائیگی کے لئے ایک ڈبہ رکھ دیتے، مال کی قیمت ایک لیبل پر لکھی ہوئی، وہ اپنے اصل کام پر روانہ ہو جاتے اور شام میں بقایا مال اور رقم اٹھالے جاتے۔'' ؁۲۷

ہر طرح کے سامان اور سہولتوں کے باوجود یہاں قلبی سکون کی کمی ہے۔ خاندانی تعلقات کا نظام درہم برہم ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ محبت و الفت کا فقدان ہے۔ امریکی معاشرے میں بڑھاپا موت سے بدتر عذاب ہے۔ بوڑھوں کے لئے الگ مراکز قائم ہیں۔ جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہوتا ہے مگر وہ اس محبت کو ترستے ہیں جو صرف خون کے رشتے کی خاصیت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امریکہ میں بچوں کا 15 سال کی عمر کو پہنچ کر آزادانہ زندگی بسر کرنا ایک عام بات ہے۔ وہ اپنی تعلیم و ترقی کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہاں ایک لحاظ سے یہ بچوں کو اپنے قدموں پر کھڑے ہونے، اپنی صلاحیتوں کا اجاگر کرنے، اور امتیازات کو سنبھالنے کا موقع ضرور ہوتا ہے لیکن رشتوں کے تانے بانے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ خاندان میں محبت اور انسیت کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ طریقۂ فطرت کے خلاف تقاضوں کو دبانے کے مصداق ہے۔ میں نے اپنے روبرو بڑھیا کو اپنوں اور مرحوم خاوند کی یاد میں آنسو بہاتے کئی بار دیکھا۔ کہتی تھی ''میرا خاندان مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اونچائی پر کھڑا کر دیتا اور خوش ہو کر مجھے دیکھا کرتا'' اس بے کسی کے عالم میں صرف ایک ٹیلی فون بڑھیا کا ہمدم و غمگسار تھا جس پر وہ گھنٹوں اپنے شناساؤں سے باتیں کرتی اور اپنی تنہائی کا ازالہ کر لیتی تھی۔'' ؁۲۸

ایثآر نے امریکہ کے دورانِ قیام میں مختلف مقامات کی سیر کی جیسے ''فوڈ میوزیم، ڈزنی لینڈ، نیاگرا فالس آب فشار وغیرہ کا تفصیل سے اس طرح ذکر کیا ہے گویا ہم خود ان جگہوں کی سیر کر رہے ہوں۔ اس کے علاوہ امریکہ میں موجود علمی و ادبی اداروں جیسے امیر خسرو اور اقبال سوسائٹی، اقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کا دورہ بھی کیا اور ادبی شخصیتوں جیسے ڈاکٹر خورشید خضر، جناب امین حیدر، ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی، ڈاکٹر صادق نقوی وغیرہ سے ملاقات کی۔

عمرہ و حج:

ارشاد باری تعالیٰ ہے (ترجمہ) ''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''[۲۹]

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اللہ رب العزت نے یہ استطاعت دی اور حج و عمرہ کے لئے چن لئے گئے۔ ایثآر بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جنہیں اللہ نے یہ استطاعت دی اور انہوں نے اللہ کی آواز پر لبیک کہا۔ انہوں نہ صرف عمرہ و حج کا فریضہ ادا کیا بلکہ ان ایام میں اپنی مصروفیات کو بھی قلم بند کیا۔ چونکہ حج و عمرہ کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں ہوتی ہے چنانچہ ایثآر کے دل میں بھی یہ تمنا کروٹیں لیتی تھی وہ کہتے ہیں۔

''1956ء میں امریکہ میں ایم ایف کی ڈگری لینے کے بعد ہندوستان واپسی کے دوران میں نے عرب کی سرزمین کی مقدس خاک کو چومنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس بحری جہاز کا رخ بدل جانے کی وجہ سے یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ تیس برس بعد عمرہ و زیارتِ بارگاہ نبوی ﷺ کی سعادت کا موقع ہاتھ آیا تو دل خوشی

سے جھومنے لگا۔'' ۳۰؎

۱۹۸۶ء میں ایثآر نے اپنی اہلیہ کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کی ۲۰۱۳ء میں ایثآر کو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ کعبۃ اللہ کی عظمت کو ایثآر والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

''اے بیتِ عتیق ہزاروں سال سے تیرا طواف کیا جا رہا ہے۔ کتنے پیغمبر ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے جور و ستم سہہ کر تیرے سایہ میں راحت پائی، کتنے ہیں جو تیرے اطراف آخری نیند سو گئے، یہود، شعیبؑ بھی یہیں پہنچ کر زیرِ خاک ہو گئے، اللہ کے خلیل اور ذبیح اللہ نے تیرے گھر کی تجدید کی اور از سرِ نو قدیم بنیاد پر دیواریں اٹھائیں۔ تیرا چشمۂ زم زم نشانی ہے ذبیح اللہ کی تشنگی بجھانے کی، صفا مروہ کی سعی اسی پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہؑ کی یادگار ہے۔ ممتا کی فطری تڑپ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ پسند آیا کہ اسے مناسک حج و عمرہ میں شامل کر دیا۔ حجرِ اسود کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوا کہ لبِ مصطفوی اور دیگر انبیاء اور اقطائے عالم کے مسلمانوں نے اس کا بوسہ لیا۔ اور لے رہے ہیں۔ مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم نے کھڑے ہو کر خاتم المرسلین کی ولادت اپنے اخلاف میں چاہی تو پتھر نے پگھل کر آپ کے قدموں کے نشان یادگار بنا دیا۔'' ۳۱؎

حلقۂ احباب:

ایثؔار کی فنکارانہ عظمت اور شخصیت کی جاذبیت کا ہی اثر ہے کہ ان کے احباب میں محض ان کے اعزاو اقرباء ہی نہیں بلکہ کئی علمی وادبی شخصیات شامل ہیں۔اس ضمن میں ایثؔار کا یہ بیان بے حداہمیت رکھتا ہے:

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ''ادبی سفر'' میں اللہ تعالیٰ نے چند ایسے احباب سے نوازا جو نہ ہوتے تو شاید میں بھی وہ نہ ہوتا جو آج ہوں۔اس سفر میں ایسے ہمراہی بھی ملے جن کے سبب یہ سفر زیادہ پر لطف اور خوشگوار ہوگیا۔ایسے عالموں ،فاضلوں، شاعروں،ادیبوں سے شناسائی بھی ہوئی جن کی ادبی دنیا میں پہلے سے ایک مسلمہ حیثیت تھی۔ایسے حضرات کی کرم فرمائیوں اور نوازشوں سے میری ادنیٰ کاوشوں کو ایک شناخت ملی اور پذیرائی ہوئی۔''۳۲

ذیل میں ایثؔار کے چند احباب کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

آغا مرزا محمود سروشؔ:

آغا مرزا محمود سروشؔ کی ولادت ۱۵ جون ۱۹۲۳ء کو میسور کے علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ان کے والد آغا رحمت اللہ عتیقی ایران کے ایک گاؤں میں عالمِ دین اور فارسی شاعر تھے۔۱۹۶۰ء میں میسور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی تعلیم حاصل کی۔اردو و فارسی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر اور نثر نگار تھے۔شاعری اور مضمون نگاری کے علاوہ اقبالیات میں خاصی دلچسپی تھی۔ایک سال تک ودھان سودھا میں مترجم کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔پھر اپنے والد کے ہمراہ چار برس تک تلاشِ معاش کے سلسلے میں

ایران میں مقیم رہے۔اسی دوران مغربی ومشرقی فنکاروں کا گہرا مطالعہ کیا۔انگریزی ادب پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔سروشؔ نے گورنمنٹ کالج چکمگلور،مہارانی کالج میسور،آر۔وی کالج بنگلور،فرسٹ گریڈ کالج چتر درگہ وغیرہ میں بحیثیت لکچرر اپنی خدمات انجام دیں۔گورنمنٹ آر،ایس،کالج بنگلور سے بحیثیت اردو ریڈر وظیفہ یاب ہوئے۔وظیفہ یابی کے بعد کچھ عرصے تک بنگلور یونیورسٹی میں گیسٹ لکچرر کی حیثیت سے فارسی پڑھاتے رہے۔۱۵/اپریل ۲۰۰۹ءکو سروشؔ اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

سروشؔ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنفِ ادب میں ان کی لیاقت وقابلیت کے جوہر نمایاں ہیں۔غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے۔ان کی غزلیں فکروفن کے نئے در وا کرتی ہیں۔مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

غمِ زیست حد سے جو بڑھ گیا ہوئے اس طرح سے حواس گم
ترے آستاں کی تلاش میں ترے آستاں سے گزر گیا

نئی منزلوں کی تلاش تھی نئے رہبروں کی تھی جستجو
میرا رہبر وہیں لے گیا میں جہاں جہاں سے گزر گیا

کیوں نہ بجھتے چراغوں کو غنیمت جانوں
کیا پتہ اپنے مقدر میں سحر ہو کہ نہ ہو

میں اپنی مٹی کے گھر سے کبھی نہیں نکلا
یہ لوگ کہتے ہیں میں آسماں پہ رہتا ہوں

خالد عرفان:

خالد عرفان کی پیدائش ۳۰ نومبر ۱۹۳۲ءکو بنگلور شہر میں ہوئی۔ان کے والد کا نام محمد امیر احمد اور والدہ کا نام شمس النساء بیگم تھا۔۱۹۵۹ءمیں سنٹرل کالج بنگلور سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔خالد

عرفان ادیب اور مترجم تھے۔انہوں نے بچوں کی کہانیاں،تنقیدی مضامین،اور ڈرامے لکھے۔ملک اور بیرون ملک کے اردو اور انگریزی رسائل و جرائد،اور اخباروں میں آپ کے کئی معلوماتی،سائنسی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے رہے۔سینٹ جوزف کالج بنگلور میں بحیثیت پروفیسر اپنی تدریسی خدمات انجام دیں۔اس کے علاوہ سماجی،ادبی،ملی وفلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔''مسلم لائبریری'' جو بنگلور کی سب سے قدیم لائبریری ہے اس میں بحیثیت صدر اپنی خدمات انجام دیں۔کرناٹک وقف بورڈ کی جانب سے حمید شاہ کامپلیکس کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن رہے۔نیز ادارۂ ادبِ اسلامی کی شاخ کرناٹک و گوا کے صدر رہے۔ان کی تصانیف میں ''جذب واحتساب'' (مضامین کا مجموعہ) اہم ہے۔

محمد اقبال:

محمد اقبال کی پیدائش ۱۰ جنوری ۱۹۵۲ء کو شہر بنگلور میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالقادر اور والدہ کا نام خیرالنساء تھا۔اقبال نے بحیثیت کاتب اور ایڈیٹر روز نامہ سالار،بنگلور میں اپنی خدمات انجام دیں۔محمد اقبال ایثآر کے قریبی رفقاء میں سے ایک ہیں۔ایثآر کی حیات اور ادبی خدمات کو اردو دنیا وادب میں متعارف کرانے کا سہرا محمد اقبال کے سر جاتا ہے۔جس کا اعتراف ایثآر نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''انہوں نے نثر نگاری کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔انہیں کا فیض ہے کہ میں نے نہ صرف چند مضامین لکھے بلکہ اپنے تراجم کے مقدمے بھی لکھنے میں کامیاب رہا۔۔۔۔اردو ادب کا قاری میرے کام اور کلام سے ناواقف تھا۔اسی سال اکتوبر میں انہیں ''سالار'' کے ابی ایڈیشن کا مدیر بنایا گا تو انھوں نے ایک طرح سے مجھے بحیثیت شاعر اور مترجم متعارف کرایا۔''سراغِ زندگی'' کی تنقیح وترتیب بھی انہیں کی مرہونِ منت ہے۔اللہ نے مجھے میرے ادبی سفر میں جناب محمد حسین کے عوض اقبال صاحب کے

روپ میں دوسرا مخلص دوست عطا کیا۔میں اس کا شکر گزار
ہوں۔''۳۳؎

محمد اقبال نے ۲۰۱۷ء میں ایک کتاب بعنوان ''وارداتِ ایثار'' مرتب کی۔اس کتاب میں متعدد اہل علم وقلم کے ذریعہ سید احمد ایثآر کی ادبی کاوشوں پر کئے گئے تنقیدی تبصرے یکجا کئے گئے ہیں۔اس سے قبل اقبال صاحب نے ایک کتاب ''واردات ایثار اور جہات اقبال'' ۲۰۰۶ء میں مرتب کی تھی جس میں ''پیام مشرق''، ''زبور عجم'' اور ''جاوید نامہ'' کے منظوم اردو تراجم پر لکھے گئے تبصرے، مضامین کے علاوہ ترانہ وترنگ پر رقم تبصرے، اور منظوم اردو ترجمہ ''جاوید نامہ'' کی رسم اجراء کے موقع پر منعقدہ سیمنار میں پڑھے گئے مقالات بھی شامل ہیں۔وارداتِ ایثار میں محمد اقبال کا ایک مضمون بعنوان ''ایثار صاحب سے ربع صدی کی رفاقت'' انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون میں انہوں اپنی اور ایثآر کی رفاقت کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ایثآر سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر وہ بہت ہی عمدہ انداز میں یوں تحریر کیا ہے۔

''میں نے اللہ کا نام لے کر ماہ ربیع الاول میں ایک ''سیرت سمینار اور نعتیہ مشاعرہ'' کی تیاری شروع کر دی۔سیمینار کے لئے پانچ چھ موضوعات اور مقالہ نگاروں کے نام تجویز کئے۔محسن صاحب کے اصرار پر ایک موضوع ایثار صاحب کے لئے مختص کر دیا گیا۔لیکن ان سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔۔۔یہ اپنی نوعیت کا بڑا پروگرام تھا۔وقت سے کافی پہلے مقالہ نگاروں کی عنوانات کی تقسیم، تاریخ کا تعین، ہال کی بکنگ، بجٹ اور پروگرام کی دیگر تفصیلات طے کرنی تھیں۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔آخر کا صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کیا گیا۔تھوڑی دیر تک کورم کا انتظار کر

کے اجلاس شروع کردیا گیا۔مختلف امور پر غور وخوض ہونے لگا۔ پروگرام کے لئے ۱۹ستمبر کی تاریخ مقرر ہوئی ۔۔۔درمیان میں ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کر کے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے سب کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ اور میں حیران !محسن صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''ملو بھئی ! یہی ہیں حضرت سید احمد ایثار۔۔۔'' ۳۴؎

محمد اقبال ایثآر کی زندگی میں ایک دوست سے زیادہ رہنما بن کرآئے۔

محمد طیب انصاری:

محمد طیب انصاری ۲۳ستمبر ۱۹۴۱ء الند شریف، ضلع گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام مشائخ انصاری اور والدہ حفیظہ بی بی تھا۔انہوں نے اردو سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔مختلف مقامات پر لکچرر کے فرائض انجام دیئے گورنمنٹ فرسٹ گریڈ ڈگری کالج ،گلبرگہ میں بحیثیت پرنسپل اپنی خدمات انجام دیں۔محمد طیب انصاری ایک معتبر محقق ،نقاد اور خاکہ نگار ہیں۔ان کی تصانیف میں تحریر و تنقید، ادراک معنی ،میرا شہر میرے لوگ ، یارانِ شہر،قطب دکن ،گلبرگ سے گلمرگ تک ،حیدرآباد میں اردو صحافت، نصرتی کی شاعری، خانقاہی نظام، آباد رہے حیدرآباد رہے، قطب مشتری، داستان ادب گلبرگہ، حضرت چراغ دہلوی، خیالات اقبال، ردوقدح، میری تحریریں وغیرہ شامل ہیں۔محمد طیب انصاری بہت سے اہم علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہے ہیں۔آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرس اسوسی ایشن دہلی میں سکریٹری کی خدمات انجام دیں۔اس کے علاوہ یونیورسٹی ، پی یو سی ، بورڈ اور سیکنڈری اسکولس (کرناٹک) کی نصابی و تعلیمی کمیٹیوں کے ممبر و چیئرمن تھے۔

طیب انصاری کی شخصیت ایک استاد، نقاد اور مقرر کی حیثیت سے مسلم ہے۔ انہوں نے تنقید، تحقیق، خاکہ نگاری، تبصرہ نویسی میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔جوش ملیح آبادی کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''انسانی ذہن کی یہ خوبی ہے کہ وہ لچکدار ہو اس میں قوتِ جذب بلا کی موجود ہو، وہ ہر نئی بات اگر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ کسی بھی مقام پر جمود کا شکار نہ ہو لیکن اگر یہ لوچ اور لچک عمر کے آخری حصہ تک باقی نہ رہے اور کسی بھی بہتر اور افضل چیز کو دائمی طور پر قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اچھے اور برے کی پہچان نہ کر پایا ہو اور حق و باطل کو ردو قبول کرنے کی جرات پیدا نہ کر سکا ہو تو پھر یہی خوبی برائی ہی نہیں عذابِ جان بن جاتی ہے۔ جوش کی جان کچھ اس عذاب میں مبتلا نظر آتی ہے۔'' ۳۵

کرامت علی کرامت:

کرامت علی کرامت ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو بمقام اڑیہ بازار کٹک (اڑیسہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام رحمت علی اور والدہ کا نام وزیرالنساء تھا۔ اتکل یونیورسٹی سے علمِ ریاضی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اور سنبل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ کورٹ کالج ہرہم پور گنجام میں بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اپنی خدمات انجام دیں۔ دو ماہی ''شاخسار'' میں بحیثیت ایڈیٹر کام کیا۔ ان کی تصانیف میں آبِ خضر (شعرائے اڑیسہ کا تذکرہ)، شعاعوں کی صلیب (شعری مجموعہ)، اضافی تنقید (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، لفظوں کا آسمان (اڑیا نظموں کا منظوم اردو ترجمہ)، لفظوں کا آکاش (سیتا کانت مہا پاتر کی اڑیہ نظموں کا اردو ترجمہ)، شاخِ صنوبر اہم ہیں۔ کرامت علی کرامت ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں انہوں نے اردو ادب میں بحیثیت شاعر اور نقاد اہم کردار ادا کیا۔ ان کا تنقیدی رویہ غیر جذباتی اور عالمانہ و دانشورانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ علمِ ریاضی کے ماہر استاد اور اسکالر ہیں۔ نفسیاتی تنقید کے اصولوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں، جدید شاعری اور اس کا پس منظر، جدید

شاعری کا بحران، جدید شاعری مین وزن اور آہنگ کے مسائل ، وغیرہ اہم ہیں۔ نئے تنقیدی مسائل اور امکانات اس تنقیدی مضامین کے مجموعے میں انہوں نے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو شعر و ادب کی تفہیم میں معاون و مددگار ہیں ۔ یہ مضامین ان کی منفرد اور متوازن سوچ کی مظہر ہیں ۔علاوہ ازیں بحیثیت شاعر انہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو شعری سرمایہ کو بھی مالا مال کیا ہے۔ذیل میں ان کی شعری سرمایے سے چند مثالیں پیش ہیں:

ایک تتلی ہوں مجھے چھونے کی کوشش نہ کرو
میں پھسل جاؤں گا اڑتے ہوئے لمحے کی طرح

گوندھ کر الفاظ کی مٹی بنایا اک گھڑا
بھر لیا احساس کا پانی، بنا معنی شناس

یوں کرامت اک طوفانی ہوا کی زد میں ہوں
اڑ رہی ہے ہر طرف میرے خیالوں کی کپاس

ان کے کلام میں روانی، زبان کی شستگی، خیالات کی ندرت، جذبات کی گہرائی، اورفن کی پختگی نمایاں ہے جو اس بات کی غماز ہے کی رموزِ شاعری پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ان کے اشعار میں مشاہدہ، احساس اور جذبے کے ساتھ ساتھ فکر و فلسفہ کی بھی آمیزش موجود ہے۔

پیوست ہیں زمین سے سچائیوں کے پیڑ
چھوتی ہے آسمان کو ہر آرزو کی شاخ

سورج کو ہم طلوع نہ کر پائے ذہن میں
لفظوں میں کائنات سمونے کے باوجود

ندی جو پیاس بجھاتی تھی سب کی صدیوں سے
خود اس کی پیاس بجھانے سراب اترا تھا

کرامت علی کرامت کی شاعری محسوسات کی شاعری ہے۔جو ان کی ذاتی تجربات کی آئینہ دار ہے۔ان کے اشعار میں باطنی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ملتی ہے۔ان کے ہاں فکری اور تخلیقی قوتوں کا نہایت متوازن امتزاج ملتا ہے۔لہٰذا انہوں نے اپنی غزلوں میں جدید مضامین و افکار کے ساتھ تشبیہات اور استعارات کا خوبصورت استعمال کیا ہے وہ سادہ اور دلچسپ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ کرامت علی کرامت نے بحیثیت شاعر و نقاد اردو ادب کی جو خدمات کی ہیں اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

وہاب عندلیب:

وہاب عندلیب کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ضلع گلبرگہ میں ہوئی۔ان کے والد کا نام محمد صاحب پٹیل اور والدہ کا نام احمدی بی تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم شہر گلبرگہ میں حاصل کی۔عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔۔اور بی ایڈ کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔بعدازاں اردو زبان و ادب سے دلچسپی کے باعث کرناٹک یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ملازمت کی ابتداء نیشنل ہائی اسکول گلبرگہ سے ہوئی۔گورنمنٹ پی یو کالج گلبرگہ میں بحیثیت پرنسپل اپنی تدریسی خدمات انجام دیں۔وہاب عندلیب ایک محقق، خاکہ نگار اور مبصر ہیں۔ان کی تصانیف میں ''قامت و قیمت''(خاکے) تحقیق و تجزیہ (مضامین) اور افکار و نظریات اہم ہیں۔وہاب عندلیب کا مطالعہ وسیع ہے۔اردو ادب میں بحیثیت خاکہ نگار ان کی اہمیت مسلم ہے۔وہ جس کسی بھی شخصیت کو موضوعِ خاکہ بناتے ہیں بہت ہی شگفتہ انداز میں اس شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بھرپور روشنی اس طرح ڈالتے ہیں کہ ایجاز و اختصار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ان خاکوں میں وہ نہ صرف اپنے ممدوح کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ شخصیت کی سوانحی حالات کو بھی رقم کر دیتے ہیں۔ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ قامت و قیمت میں ۱۴ شخصیت پر خاکے لکھے ہیں۔سبھی خاکے ان کے احباب

پر رقم ہیں۔گفتار و کرداران کا دوسرا مجموعہ ہے جو خاکوں پر مشتمل ہے۔اس میں انہوں نے علمی،ادبی،سماجی، سیاسی اور مذہبی شخصیتوں پر مبنی ۱۵ خاکے ہیں۔ان دونوں مجموعوں کا خاص وصف اختصاراور جامعیت اور ہے۔ان کی تحریر میں دلکشی،روانی اور سادگی ہے۔ذیل میں ان کے خاکوں سے چند اقتباس پیش ہیں۔

سلیمان خطیب کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''گندمی رنگ،دہرا جسم،داڑھی منڈھی ہوئی،مونچھ ہٹلری،ایک عرصے تک لیڈی کٹ،عینک کے شیشوں سے بڑی بڑی آنکھیں جھانکتی رہیں۔مگر اب رفتار زمانہ کے باعث عینک بدل گئی ہے،سر کے بال تفکرات کی نذر،رہے سہے بال ٹوپی کے کناروں پر جھالر کی شکل میں آویزاں،کبھی جناح کیپ تو کبھی آزاد کیپ،کبھی فیلٹ ہیٹ تو کبھی سفید سمور کی ٹوپی زیب سر کئے کشمیر سے واپسی کا اعلان کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔شکم تیزی سے قبہ بننے کی طرف مائل۔قد میانہ،چال مستانہ،وضع دلبرانہ،شاعری تن دانا تا نا تانا۔لیجئے یہ ہیں خطیب محمد سلیمان المعروف بہ سلیمان خطیب جو پہلی نظر میں فسانۂ آزاد کا کردار یا شنکر ویکلی کا کارٹون معلوم ہوتے ہیں۔''۳۶

سید احمد ایثار پر بھی انہوں نے ایک خاکہ رقم کیا ہے۔جس میں انہوں نے ایثار کی شخصیت ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔

''حضرت ایثار کی شخصیت کی کئی جہتیں اور پرتیں ہیں۔باکمال شاعر،بلند پایہ مترجم،محقق و دیدہ ور عاشق اقبال،غم خوار ملت اسلامیہ،ماہر اقبالیات ہونے کے باوصف ظاہری شان وشوکت

سے اجتناب برتتے ہیں۔مزاج میں سادگی،انکساری،شگفتگی اور
سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔سنجیدہ اور متین،قدیم قدروں
کے امین،مہمان نوازاخلاق واخلاص کا پیکر،عزم وارادے کے
پکے،عمر کے نو دہے مکمل ہونے کو ہیں مگر ہیں آج بھی چاق و
چوبند،اندیشہ سودوزیاں سے بے نیاز ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ
منزل کی جانب رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔خدائے بزرگ و
برتر ان کے سن وسال میں اضافہ کرے اور وہ بہ صحت اپنی عمر کی
سنچری مکمل کریں۔وہ اسی طرح افکار و عالیہ واعلیٰ ادب کا حصہ
بنے رہیں۔(آمین)''۳۷

وہاب عندلیب نے خاکہ نگاری کے علاوہ اچھے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور تبصرے کیے ہیں۔
''تحقیق و تجزیہ'' ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں مختلف موضوعات پر ۱۴ تنقیدی و تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں ''کنڑ ا ادب کے اہم رجحانات''،''اردوزبان وادب کی ابتداء اور حضرت خواجہ بندہ نواز''،''امیر خسرو اور ہندوستانیت''،''دکنی ہم عصر شعراء''،''مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری''،''قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو صحافت کا حصہ'' وغیرہ اہم ہیں۔

سید ابوتراب خطائی ضامن:

سید ابوتراب خطائی ضامن ادیب،شاعر،اور مترجم ہیں۔ان کی پیدائش ۱۸ااگست ۱۹۲۸ء کو ٹمکور میں ہوئی۔ان کے والد کا نام یوسید میر،اور والدہ کا نام سیدہ فاطمہ تھا۔انہوں نے بی اے آنرس میسور یونیورسٹی سے اور ایم اے کی ڈگری ناگپور یونیورسٹی سے حاصل کی۔انٹرمیڈیٹ کالج چکمگلور میں چودہ سال تک بحیثیت لکچرر اپنی خدمات انجام دیں۔۱۹۶۴ میں گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور میں تبادلہ ہوا۔اس کے بعد مہارانی کالج میسور میں چار سال تک بحیثیت لکچرار کام کیا۔۱۹۷۶ میں گورنمنٹ سائنس کالج بنگلور میں بحیثیت ریڈر اپنے فرائض انجام دیے۔۱۹۸۴ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ان کی تصانیف میں

زعفران زار (لطائف کا مجموعہ)،ضرب الامثال اور ان کا پس منظر، ماسٹر (ناول)،دکنی لغات،فنِ شاعری ایک جائزہ،تصوف اورصوفیائے کرام،تصوراتِ اقبال اہم ہیں۔بحیثیت مترجم انہوں نے بھیرپا کے ناول واٹو کا اردو ترجمہ کیا ہے۔جو بعنوان ''پار'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ابو تراب خطائی ضامن نے بڑی مہارت کے ساتھ اصل ناول کی تمام کیفیات کومن وعن پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔واٹو میں ہندو مذہب کے طبقات اور رسم ورواج کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔مترجم نے ان تمام رسوم اوران کی جزئیات کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا اوران کو اسی پس منظر میں بڑی مہارت کے ساتھ ترجمہ میں منتقل کردیا۔ترجمہ کی زبان نہایت دلکش، پراثر ہے۔روانی اورسلاست اس ترجمہ کی اہم خوبی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنا تحریر کردہ ناول ''ماسٹر'' کا کنڑا میں ترجمہ کیا جو ۲۰۰۴ میں منظرِ عام پر آیا۔چنانچہ ۲۰۰۲ میں ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں کرناٹکا اردو اکیڈمی نے انہیں اعزاز سے نوازا۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

شمس الرحمٰن فاروقی کی ولادت ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پرتاب گڑھ اودھ کے ایسے گھرانے میں ہوئی جس کی تاریخ علم وادب کے حوالے سے صدیوں پر محیط ہے۔ان کے دادا حکیم محمد اصغر بھی عالم تھے۔اورشعروادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔آپ کے والد مولوی خلیل الرحمٰن فاروقی نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن اکثر شعر کہا کرتے تھے۔فاروقی کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں ہوئی۔ایم اے امتیازی پوزیشن کے ساتھ الہٰ باد یونیورسٹی سے کیا۔یہیں انگیزی ادب سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔تعلیم کے بعد بحیثیت لکچرر انہوں نے ستیش چند ڈگری کالج ۔شبلی کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں۔اس کے علاوہ IAS کا امتحان میں کامیابی حاصل کرکے پوسٹل سرویز کی ملازمت اختیار کی۔پہلے وِیجِنلس آفیسر کی حیثیت سے کام کیا بعدازاں پوسٹل سروس بورڈ ممبر کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں۔اوراسی عہدے سے جنوری ۱۹۹۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

فاروقی ایک شاعر اورنقاد کی حیثیت سے اردوادب میں معروف ہیں۔ان کی شخصیت میں بیک وقت نقاد،شاعر،مدیر،خطیب اوردانش ور کی خوبیاں یکجا ہیں۔اردو زبان وادب میں فنِ تنقید کی ایک نئی روایت اور ادبی منظرنامے میں تفہیمِ شعر کے معروضی طریقے کی دریافت شمس الرحمٰن فاروقی کا اہم کارنامہ ہے۔ان کی

تصانیف میں،لفظ و معنی، فاروقی کے تبصرے،شعر، غیر شعراور نثر،تنقیدی افکار، تفہیم غالب،شعر شور انگیز،عروض آہنگ اور بیان ،افسانے کی حمایت میں،اردو غزل کے اہم موڑ، تفہیمِ غالب، غالب پر چار تحریریں، غالب کے چند پہلو وغیرہ قابلِ قدر ہیں۔انہوں نے غالب پر خصوصاً اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔وہ مشرقی اصولِ نقد اور شعریات سے بھی بھر پور واقفیت رکھتے ہیں۔اور مغربی ادب اور اس کے رجحانات سے بھی با خبر ہیں۔کلاسیکی شعراء سے متعلق فاروقی کی علمیت اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ان کی تصنیف ''شعر شور انگیز'' سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کلامِ میر کی شرح مدلل اور تجزیاتی انداز میں کی ہے۔جبکہ ''تفہیم غالب'' میں غالب کی بلند و بالا اور پیچیدہ تر شعری کاوشوں اور تخلیقی ہنر مندیوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے کا رجحان نمایاں ہے ۔انہوں نے اقبال پر باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود اقبال فہمی میں ان کی شناخت منفرد ہے۔ان کی تصنیف ''شعر، غیر شعراور نثر میں انہوں نے کیٹس ،اقبال،اور ایلیٹ ان تینوں کے درمیان مماثلت کے چند پہلوتلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ ''اثبات ونفی میں اقبال کے لفظیاتی نظام اور عروضی نظام جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو وہاں بھی اپنا امتیاز برقرار رکھا۔شعری تصانیف میں گنج سوختہ، سبز اندر سبز، چار سمت کا دریا، آسمان محراب وغیرہ اہم ہیں۔انہوں شاعری کی تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کی شاعری جدید شعری رویے سے عبارت ہے۔کلاسیکی ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ان کی غزلوں، رباعیوں میں برجستگی، بے ساختگی اور روانی ہے۔

فاروقی نے اجمال، مناسبت لفظی، رعایتِ لفظی، تشبیہ واستعارہ، پیکر تراشی، ابہام گوئی وغیرہ کو شعر کی خصوصیات قرار دیا ہے۔ان کے اپنے کلام میں بھی ان خوبیوں کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گذشتہ رات مجھے پڑھتے وقت وہم ہوا

ورق پہ حرف نہیں ہیں یہ ہیں کتاب میں سانپ

بس اک رشتہ ہے جس میں پر وگئی ہوگی
وہ اشک خواب سے چہروں کو دھوگئی ہوگی

بنا ئے بنتی نہیں منہدم بنا ئے د ل
کدھر ستوں ہے کہاں کرسی اور کہاں محراب

علیم صبانویدی:

علیم صبا نویدی کو ریاستِ تمل ناڈو کے ادیبوں میں ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ان کا اصل نام سید علیم الدین حسین ہے ۔والد کا نام سید عبدالعظیم تھا۔ان کی ولادت ۲۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو امبور (شمالی ارکاٹ) مدراس میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مدراس میں حاصل کی ۔اور علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے (انگریزی) کی سند حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد مدراس پورٹ ٹرسٹ میں اسٹور سپر وائزر کی ملازمت اختیار کی۔علیم صاحب مختلف الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں،تنقیدی بصیرتوں اور تحقیقی کاوشوں کے ذریعے اردو ادب کے سرمایے کو مالا مال کیا۔بحیثیت شاعر انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔جس میں غزل،آزاد غزل،نظم،آزاد نظم،سانیٹ،ہائیکو،نعت وغیرہ شامل ہیں۔ان کی تصانیف میں روشنی کا بھنور(افسانوی مجموعہ)،طرح نو (غزلیں)،لمس اول (ٹیپ بند نظمیں)،ردکفر(آزاد غزلیں)،شگاف در شگاف (افسانوی مجموعہ)،قید شکن(آزاد غزلوں کا انتخاب)،شناخت کی حدوں میں(آزاد غزل پر مضامین)،نقش گیر(غزلیں)،ترسیلے(ہائیکو)شعاع مشرق (ہائیکو)،اثرِ خامہ (غزلیں) وغیرہ اہم ہیں۔

ان کی شاعری کا کینوس کافی وسیع ہے انہوں نے متنوع خیالات و افکار کو شعری لباس پہنایا ہے۔ان کی غزلیں اسلوب کی تازہ کاری،ندرتِ خیال،اور پیکر تراشی کا مرقع ہیں۔انہوں نے غزل کی روایت کو استوار کرتے ہوئے جدیدیت کو اپنایا ہے۔ان کے یہاں زندگی کا شعور ملتا ہے۔ایک حساس،مخلص فنکار کی طرح انہوں نے اپنے معاشرے اور گرد و پیش کے مسائل کی صحیح عکاسی کی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

سب رشتوں کے خواب ادھورے
جینے کے اسباب ادھورے

ہر اک ذہن کھوکھلا ہے نور ہے نہ نار ہے
نظر نظر خموش ہے جمود سا ہے دور تک

چہرہ چہرہ الجھنوں کا ہم سفر
سینہ سینہ درد کا انبار ہے

سیاسی وسماجی اقدار کی شکست وریخت، افراد کی بے کسی و بے چارگی، فرد کے داخلی کرب واضطراب کو اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے:

اک عمر سے سپنوں کی سڑک پر وہ اکیلا
ٹوٹا ہوا آئینہ لئے ہوئے گھوم رہا ہے

میں نے کیا ہے دفن ستاروں کے آس پاس
ہر ایک آرزو کو بدن سے نکال کر

ہماری آنکھ کی ٹپکی ہوئی سیاہی نے
تمہارے گھر کی تباہی کی ابتداء لکھ دی

آج کی تیز رفتار زندگی میں انسانی ذہن کو تہہ در تہہ مختلف حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔علیم نے

انہی واردات و کیفیات کا اظہار بڑی شائستگی کے ساتھ یوں کیا ہے:

ہر لمحہ سسکتے ہوئے چہروں کا سمندر
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

میرے اندر کا نظارہ کیجیئے
میرے اندر کا سفر دشوار ہے

جسم مٹی کا ڈھیر ہے لیکن
ذات کا دائرہ منور ہے

وہ ایک پل جس کا رشتہ لاسند ہے
عبادت میں بہت مشغول نکلا

ایک اچھی اور بہترین غزل کہنے کے لئے جو صاف و شستہ زبان، مضمون کی ندرت وجدت، احساسات کی تازگی، اور تخیلات کی سر بلندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ علیم صبا نویدی کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مختصر یہ کہ علیم صاحب ریاستِ تامل ناڈو کی ایک قد آور ادبی شخصیت ہیں اور اردو ادب میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔

گوہر تریکیروی:

گوہر تریکیروی ریاستِ کرناٹک کی ایک نامور شخصیت ہیں۔ ان کی ولادت ۱۵ مئی ۱۹۳۸ء کو ضلع چکمگلور کے نرسمہا راج پور میں ہوئی۔ والد کا نام محمود خان تھا۔ اور والدہ کا خدیجہ بی تھا۔ ابتدائی تعلیم چکمگلور میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج سے منشی کا کورس کیا اور میسور یونیورسٹی سے بی ایڈ اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج اور گورنمنٹ کالج کرگاول (منڈیا) میں تدریسی خدمات انجام دیں اور وہیں

سے وظیفہ یاب ہوئے ۔وظیفہ یاب ہونے کے بعدبھی گوہؔر کی ادبی وتعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں ۔CIIL کے لسانیاتی پروجیکٹس میں اور ڈی یس ای آر ٹی (DSERT) کی نصابی کتب کی تیاری میں، سیمیناروں اورمشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔

گوہؔر ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ان کے دوشعری مجموعہ کلام ''متاعِ گوہر''اور گوہر'' مثرگاں'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکرداد وتحسین پا چکے ہیں۔گوہؔر کی شاعری احساسات وجذبات کی شاعری ہے۔بنیادی طور پران کی غزلوں میں اخلاقیات کے گہرے مشاہدات کا احساس ملتاہے۔صاف وشستہ زبان،احساس کی ملائمت اوراظہار کی بے ساختگی ان کے اشعار کودلکش بنا دیتی ہے۔چنداشعارملاحظہ ہوں:

غمِ حیات کے شکوے نہ صبح شام کرو
اگر ہوعزم تو جینے کا انتظام کرو

گوہر خدا کا خوف عبادت کی جان ہے
شامل اگرریاہے ہوتو سارے عمل گئے

متاعِ غم سے میسر ہے آگہی گوہر
وہ آئینہ ہے جس میں خودی کو دیکھا ہے

اور پختہ ہوگیا عزم سفر
پاؤں کا ہرآبلہ اچھالگا

رہبر سے کچھ غرض ہے نہ منزل کا کچھ پتہ
ہم اپنی جستجو میں کہاں تک نکل گئے

رؤف خیر:

رؤف خیّر ریاستِ حیدرآباد کے ممتاز ادیب و شاعر ہیں ۔ان کا اصلی نام محمد عبدالرؤف اور قلمی نام رؤف خیّر ہے۔ ان کی ولادت،۵؍نومبر ۱۹۴۸ء ، حیدرآباد دکن میں ہوئی ۔ ان کے والد کا نام محمد ابو بکر تھا۔ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں حاصل کی ۔عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔اس کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے اور اردو میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد بحیثیت لکچرار حیدرآباد یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔انہوں نے ہندو پاک اور کل ہند شاعروں کے علاوہ انڈین ایمبسی کی دعوت پر جدہ ،ریاض ،مکہ اور مدینہ کے مشاعروں میں بھی شرکت کی ۔ان کی تصانیف میں اقراء(۱۹۷۷ء شعری مجموعہ)،ایلاف (۱۹۸۲ء شعری مجموعہ)،شہداب (۱۹۹۳ء شعری مجموعہ)، حیدرآباد کی خانقاہیں (۱۹۹۴ء تحقیقی مقالہ)،خطّ خیر(۱۹۹۷ء ،تنقیدی مضامین)،قنطار ۲۰۰۱ء(علامہ اقبال کے۱۶۳ فارسی قطعات ''لالہ طور'' کا منظوم اردو ترجمہ)،سخنِ ملتوی (۲۰۰۴ء شعری مجموعہ)،دکن کے رتن اور اربابِ فن(۲۰۰۵ء تنقیدی مضامین)،بچشمِ خیر (۲۰۰۷ء تنقیدی مضامین)،خیریات (۲۰۱۰ء شعری مجموعہ)،حق گوئی و بے باکی(۲۰۱۲ء تنقیدی مضامین)،دکن کی چند ہستیاں(۲۰۱۴ء تنقیدی مضامین)،اقبال بہ چشمِ خیر(۲۰۱۷ اقبالیات)وغیرہ اہم ہیں۔

رؤف خیر کی ادب اور تنقید پر گہری نظر ہے۔عصر اور روایت کے امتزاج نے ان کی تنقیدوں میں ایک منفرد رنگ پیدا کر دیا ہے۔نیز ماضی وحال کی یکساں طور پر دلچسپی نے انہیں ایک خوش فکر شاعر اور اچھا نقاد بنایا ہے۔ان کی تحریریں ادبی وتہذیبی مسائل پر مبنی ہیں۔وہ ایک خوش فکر اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ان کی شاعری کا خمیر ان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے سے گوندھا ہوا ہے ۔انہوں نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی مگر ان کے جوہر غزل میں زیادہ کھلتے ہیں۔ان کی غزلوں میں غزل کے تمام رنگ وروپ اور تقاضے

بدرجہ اتم موجود ہیں۔غزل کا کوئی ایسا پہلو نہیں جوان کی نظروں سے اوجھل رہا ہو۔انہوں نے لفظوں سے فکرو احساس کے خوبصورت پیکر تراشے ہیں ان کے کلام میں جہاں لفظوں کی نزاکت کا خاص خیال رکھا گیا ہے وہیں قلبی وادات اور داخلی کیفیات کا نہایت عمدہ بیان ملتا ہے۔ان کے کلام سے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

ہر ایک بات مدلل نہیں ہوا کرتی
کبھی تو دل کی بھی سن لو دماغ کے بدلے

رستے سے بھید بھاؤ کے پتھر ہٹایئے
کوئی لہولہان نہ ہو خیر کی طرح

ہر بات کا ثبوت نہ مانگا کرو یہاں
کچھ بے نشان ہوتے ہیں گھاؤ بھی مان لو

تمام دن ترا چہرہ ورق ورق پڑھنا
وہ رت جگا وہ مرارات بھر فقط لکھنا

آنکھ جھپکی تھی کہ سورج تھا سوا نیزے پر
خواب دیکھا کہ مسافت نے برا مان لیا

شخصیت

کچھ شخصیتیں اتنی وضع داراور محبتوں سے لبریز ہوتی ہیں کہ ان سے ہوئیں ملاقاتیں ان کی باتیں اور ان کے مزاج کا انوکھا پن ہمیشہ کے لئے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔سید احمد ایثارؔ ایسی ہی خصوصیت کے مالک ہیں۔خدانے انہیں ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی خوب سیرتی سے بھی نوازا ہے۔دراز قد، کشادہ جبیں، چہرہ بارعب وسنجیدہ ،پرکشش و پروقار آواز نہایت شیریں وصاف ،طبیعت شگفتہ وشاداب، بظاہر سنجیدہ مزاج کے حامل نظر آتے ہیں۔لیکن کچھ ہی دیر میں اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں جیسے ان سے برسوں کی شناسائی ہو۔غرور تکبر سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ان کے احباب کے مطابق بھی ایثارؔ سادہ و پرخلوص شخصیت کے مالک ہیں۔بقول اسد اعجاز:

''سادگی کا یہ عالم کہ دیکھنے والا ان کو کچھ نہیں سمجھتا ملاقات بھی اس انداز میں کرتے ہیں کہ مخاطب پر کوئی اثر نہ ہو اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے نہیں دیتے کہ یہ ان سے قابل ہیں جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔''۳۸؎

محمد اقبال نے ایثارؔ کے خدوخال کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''ایثارؔ صاحب پانچ فٹ، سات انچ اونچے، دبلے، پتلے متوسط جسامت والے شخص، سانولا کھلتا ہوا رنگ، کھڑی صورت، ستواں لمبی ناک، پتلے ہونٹ پر باریک ترشی ہوئی مونچھیں، چوڑی

ٹھوڑی پر گوشت گال ابھرے رخسار بھنویں گھنی نہیں مگر ہلکی سی سفید ی لئے ہوئے،آنکھیں بڑی نہ چھوٹی،نظر تیز گہری روشن،کشادہ پیشانی پر سجدوں کا واضح نشان،بڑے بڑے کان،سر کے بال چھدرے نوے فیصد سفید،سلیقے سے پیچھے کی طرف جمائے ہوئے۔''۳۹؎

ڈاکٹر فوزیہ چودھری ان کا سراپا یوں پیش کرتی ہیں:

''ستواں ناک،سنجیدہ آنکھیں ،بے ریش کھڑا چہرا،پور پور تصوف میں رچی خودی،مشرقی اقدار کی دلدادہ، روحانیت پرور،اخلاقی رنگ میں ڈوبی معصوم شخصیت ،کچھ غیرت ،کچھ شجاعت،کچھ تحمل ،کچھ بے صبری بھی،بظاہر خارج سے جڑی،مگر باطن میں دبی،کچھ داخلیت اور کچھ خارجیت کا امتزاج،ظاہر اور باطن میں قہقہوں کی برات ہفت رنگ دنیا سے ناآشنا مزاج مگر عشقِ اقبال میں مد ہوش ،روایت پسند،اکہرا بدن،درمیانہ قد،کبھی پینٹ شرٹ،کبھی شیروانی،کبھی ماڈرن سوٹ بوٹ زیب تن کئے ہوئے ،فطرت انسان دوست ، یہ ہیں ہمارے سید احمد ایثار آئی ایف ایس،سابق چیف وائلڈ وارڈن''۴۰؎

مجموعی طور پر ایثارؔ کی شخصیت پرکشش اور جاذب ہے۔فطرتاً تنہائی پسند ہیں طبیعت میں سادگی و انکساری ہے۔

عادت واخلاق:

ایثؔار ایک بے لوث شریف النفس شخصیت ہیں۔عمدہ اخلاق وآداب کانمونہ ہیں۔بڑے خلیق اور ملنسار ہیں۔ان کی زندگی تکلفات سے بری اور سادہ ہے حتیٰ کہ عادات واطوار رہن سہن، ملنے جلنے کے انداز غرض کسی بھی طرح غرور وتمکنت کا اظہار نہیں ہوتا۔ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں۔متانت، وضع داری،قول وفعل میں ہم آہنگی،شائستگی، مستقل مزاجی ان کے اہم اوصاف ہیں۔وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔بزرگوں کا ادب واحترام کرنا چھوٹوں سے شفقت ومحبت اور فراخ دلی سے پیش آنا ساری زندگی ان کا شعار رہا ہے۔وہ غیر متعصب ذہن کے مالک،نہایت وسیع القلب،روشن خیال اور انصاف پسند شخصیت ہیں۔بقول محمد اقبال:

> ''ایثار صاحب بڑے فراخ دل،اعلیٰ ظرف اورمحسن شناس ہیں۔انہوں نے زندگی میں بہت نشیب وفراز دیکھے ہیں ،نا انصافیوں کا سامنا کیا لیکن اپنی عزتِ نفس کی قیمت پر نہیں۔۔۔صبر وتحمل اور توکل کے ساتھ جدوجہد جای رکھی۔''[۱۴]

ان کی شخصیت کی ایک اور عمدہ خصوصیت صداقت پسندی ہے۔انہیں جھوٹ مبالغہ آرائی اور خوشامد پسندی سے سخت نفرت ہے۔تصنع اور بناوٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔نمود ونمائش سے دور رہتے ہیں۔اپنا ہر کام پوری محنت اور لگن سے کرنے کے عادی ہیں،کسی کی غیبت نہیں کرتے ۔ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔ان کا اسلوبِ حیات ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو کسی کو ان کی ذات سے کوئی شکایت نہ ہو۔نظم وضبط کے پابند ہیں وقت کی قدر وقیمت سے بخوبی واقف ہیں۔ہر جگہ وقتِ مقررہ پر پہنچنا ان کی عادت ہے۔منشیات، پان،سگریٹ وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں۔

لباس:

ایثآر خوش لباس ہیں۔ عموماً پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اکثر کرتا اور شیروانی بھی زیب تن کرتے ہیں۔ خاص موقعوں پر جیسے شادی یا دیگر تقاریب میں سوٹ پہنتے ہیں۔ البتہ گھر میں آرام دہ کپڑوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اور وصف ان کا خوش سلیقہ ہونا بھی ہے۔ یہ خوبی نہ صرف ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے بلکہ ان کے رہن سہن میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

غذا:

ایثآر کے ہاں کھانے پینے کا خاص سلیقہ اور قرینہ ہے۔ وہ وقت پر کھانا کھانے کے عادی ہیں۔ کھانے میں خوش ذائقہ غذا پسند کرتے ہیں۔ تیز اور مصالحے دار پکوان پسند ہیں۔ خصوصاً گوشت اور مرغی کے پکوان انہیں زیادہ پسند ہیں۔ میٹھے کے شوقین ہیں۔ خاص موقعوں پر بریانی، پلاؤ اور میٹھے پکوان پسند کرتے ہیں۔ مچھلی بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ بقول سید ابوتراب خطائی ضامن:

> ''آپ خوش خوراک ہیں، خود بھی لذیذ کھانوں کے شیدا ہیں اور مہمانوں اور دوستوں کو روک کر انہیں دعوتیں کھلاتے ہیں۔ آپ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ آپ میٹھے کے رسیا ہیں۔ شیرینی چاہے گھر میں بنی ہو کہ حلوائی کے ہاں سے آئی ہو کھانے کے بعد نوش ضرور کرتے ہیں اگرچہ ان کی صحت کے مدنظر گھر والوں نے میٹھا استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے پھر بھی چوری چھپے میٹھا نوش کر جاتے ہیں۔''[۴۲]

اس سلسلے میں محمد اقبال یوں رقمطراز ہیں:

''ایثآر صاحب بلاشبہ خوش خوراک اور خوش ذائقہ ہیں ذرا تیز
مصالحے دار پکوان پسند کرتے ہیں ۔عموماً گوشت کا سالن ہوتا
ہے۔اگر سالن کوئی دوسرا بھی ہوتو اس کے ساتھ تلا ہوا گوشت
ضرور ہوتا ہے۔کبھی کبھی تلا یا ابلا ہوا انڈا ہوتا ہے، بریانی بھی پکتی
ہے،اب چند برسوں سے گوشت سے پرہیز کرنے لگے
ہیں،لیکن روزانہ مرغی پکتی ہے، ڈائننگ ٹیبل پر دو چار قسم کے اچار
بھی ہوتے ہیں ایثار صاحب آخر میں دو چار نوالے دہی میں
کھانے کے عادی ہیں، میٹھے کے شوقین ہیں۔کھانے کے بعد
تھوڑا سا میٹھا کھاتے ہیں، گھر میں پکا ہوا نہ ہوتو حلوائی کی دکان
سے کچھ نہ کچھ آتا ہے،اب بیٹے اور بہوئیں پرہیز کراتی ہیں،لیکن
دل کہاں مانتا ہے۔''[۴۳]

معمولات ومشاغل:

ایثآر نے اپنی زندگی میں جن معمولات ومشاغل کو اختیار کیا ان پر اب تک بھی بڑی پابندی سے عمل
کرتے ہیں ۔ان کا معمول رہا ہے کہ علی الصبح اپنے وقتِ مقررہ پر بیدار ہو جاتے ، فجر کی نماز ادا کرتے اور اپنی
دن بھر کی سرگرمیوں میں مصروف ہوجاتے ۔انہیں کتب بینی کا بے حد شوق رہا ہے۔ذہانت کے ساتھ ساتھ
شوقِ علم انہیں قدرتی طور پر ودیعت ہوا ہے۔دورِ طالب علمی ہی سے ان میں معلومات میں اضافہ کرنے کی
سخت لگن تھی ۔راتوں کو بلا ناغہ مطالعہ کرتے ۔اکثر دیر رات تک مطالعہ میں غرق رہتے ہیں۔

طرزِ رہائش:

شیر خان اسٹریٹ نگرتھ پیٹ بنگلور میں ایثآر سکونت پذیر ہیں۔ان کا گھر چار منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔پہلی منزل ان کی رہائش گاہ ہے۔مکان کافی پرانا ہے۔ایک بڑا کمرہ ہے جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دونوں کا کام کرتا ہے۔اسی کمرے میں ایثآر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔دائیں طرف کتابوں سے بھری ان کی ذاتی لائبریری ہے جس میں کتابیں نہایت سلیقے سے سجی ہوئی ہیں۔دوسری طرف شوکیس میں ان کے تمام انعامات واعزازات قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ایک طرف کونے میں کھانے کی میز اور اس کے اطراف چھ کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔اسی کمرے سے منسلک ایک باورچی خانہ اور دوسری طرف بیڈ روم ہے۔ایثآر نفاست پسند ہیں انہیں گھر میں ہر چیز سلیقے اور قرینے کے ساتھ درست چاہئے۔وہ صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں کام کے عادی ہیں۔صفائی عمدگی ان کے مزاج کا خاصہ ہیں۔ان کی نفاست پسندی ان کی طرزِ رہائش میں نظر آتی ہے۔چونکہ ان کے مزاج میں نمائش کا شائبہ نہیں ہے اس لئے ان کے رہن سہن میں سادگی ونفاست جھلکتی ہے۔

اندازِ گفتگو:

ایثآر کا اندازِ گفتگو نہایت مؤثر اور دلکش ہے۔وہ اس قدر خوش مزاجی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ مقابل نہ صرف ان کے اندازِ گفتگو سے متاثر ہوتا ہے بلکہ خوش ومطمئن بھی ہوجاتا ہے۔الفاظ کا موزوں ومناسب استعمال کرتے ہیں۔غیر ضروری الفاظ اور باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ان کی گفتگو سے نہ صرف ان کی علمیت بلکہ ان کی ہموار وشفاف شخصیت کا عکس صاف جھلکتا ہے۔صاف گوئی کے ساتھ ان کا اندازِ گفتگو نہایت دلچسپ،مہذب اور اپنائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔آواز بلند اور صاف ہے۔گفتگو کے انداز میں مخلصانہ رویہ ہوتا ہے۔اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کسی بات سے دل آزاری نہ ہو۔اپنی ہر بات کو مدلل،پرمعنی اور بااثر انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کی انہیں خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے محمد اقبال اپنے ایک مضمون ''ایثار صاحب سے ربع صدی کی رفاقت'' میں رقمطراز ہیں:

''گفتگو میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے ،اظہار نپا تلا اور معقول ہوتا ہے۔وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں۔متنازعہ فیہ پر اکثر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔یا بڑی معصومیت سے'' میں کیا جانوں حضرت'' یا ''معلوم نہیں حضرت'' کہہ دیتے ہیں ۔لیکن غلط اور جھوٹ کی بر ملا تردید کرتے ہیں بڑے با مروت ہیں۔''۴۴

مجموعی طور پر ان کی گفتگو میں تہذیب وشرافت کے تمام اقدار عیاں ہیں۔

قناعت وخودداری:

ایثاؔر کی شخصیت کا ایک روشن پہلوان کی قناعت اور خودداری ہے۔انھوں نے دنیاوی ومعاشی آسودگی کے مقابلے ہمیشہ دیانت داری کو ترجیح دی۔اس لئے انہیں کبھی بھی اپنی خودداری کا سودا نہیں کرنا پڑا۔خود نوشت ''سراغِ زندگی'' میں ایک واقعہ کا ذکر کیا جو ان کی بے مثال دیانت داری ،رشوت سے پرہیز اور ایمانداری کی عمدہ مثال ہے۔

''تڑسا کو آئے ہوئے مجھے صرف دو دن ہوئے تھے میں کہیں باہر گیا ہوا تھا، واپس گھر آیا تو ایک بھرا ہوا تھیلا رکھا دیکھا، میں نے بیگم سے پوچھا ''یہ کیا ہے'' بولیں کہ کوئی پٹیل ایرے گوڈا نامی شخص نے ایک تھیلا چاول بھیجے ہیں ۔مجھے بہت برا لگا ،فوراً صابجان صاحب کو آواز دی اور ایک بیل گاڑی لانے کو کہا وہ تھیلا اس گاڑی میں ڈال کر پٹیل ایرے گوڈا کے گھر واپس بھیج دیا۔کچھ

عرصہ بعد ایرے گوڈا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایت کی
کہ میں نے ان کا تحفہ کیوں ان کے منہ پر دے مارا لیکن کیا
کرتا، کسی صورت ایسے تحفے قبول کرنا میرے مزاج کے خلاف
ہے۔ یہ گویا اپنی قیمت آپ گرا لینے کے مترادف ہے جو مجھے گوارا
نہیں تھا۔'' ۴۵؎

ایثآر کی مستقل مزاجی اپنی مثال آپ ہے۔ بے شمار الجھنوں، پریشانیوں کے باوجود انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ درحقیقت ایثآر میں زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کی زبردست قوت تھی۔ انہوں نے مشکلات، حالات کی ناہمواریوں کے باوجود کبھی شکست قبول نہ کی بلکہ صبر وتحمل سے کام لیکر مسلسل جدوجہد کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی سعی کرتے رہے۔ غرض یہ کہ نہ تو وہ کبھی حالات سے شکست خوردہ ہوئے اور نہ ہی ان کی زندگی کبھی کسی قسم کی بے راہ روی کی شکار ہوئی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زندگی میں پیش آنے والی یہی دشواریاں انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا کام کرتی ہیں۔ ایثآر نے بھی ان دشواریوں کا سامنا کیا زندگی کے نشیب وفراز کو دیکھا سمجھا جس سے ان کے مشاہدے اور تجربات میں ہمہ گیری اور فکر ونظر میں وسعت پیدا ہوئی۔

صاف گوئی اور اصول پرستی:

صاف گوئی، حقیقت پسندی اور اصول پرستی ان کی شخصیت کے لازمی جزو ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کو کسی کی خاطر قربان نہیں کرتے۔ روزمرہ کے معاملات ہوں یا علم وادب کے مسائل، جب بھی گفتگو کرتے ہیں ان کی باتوں میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں کوئی چیز بھی تہہ در تہہ لبادہ پہنے نہیں ہے۔ تنگ نظری اور تعصب پرستی کے خلاف ہیں۔

مہمان نوازی:

ایثآر مثالی میزبان ہیں۔ مہمانوں کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع

میں اپنی توفیق واستطاعت سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔میز بانی کے فرائض بہتر طور پر ادا کرتے ہیں۔خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں ہونے دیتے،مہمانوں کی پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ان کے آرام و آسائش میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔بقول محمد اقبال:

''ہم مزاج اور ہم مذاق دوستوں کی آمد پر ایثار صاحب بہت خوش ہوتے ہیں ۔دل و جان سے خاطر مدارات کرتے ہیں۔ پہلے بسکٹ ہلدی رام کا کھٹا میٹھا اور چائے سے تواضع کرتے ہیں۔الا پچی کیلے (موز) تو موجود ہوتے ،درمیان میں کوئی پینے پانی مانگے تو خود ہی گلاس بھر کر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے پیش کریں گے اسی طرح اپنی کتابیں بھی ادب کے ساتھ نذر کرتے ہیں۔اب چند برسوں سے خشک میوے جیسے ۔۔۔انجیر ،پستہ ،بادام،کاجو اور منقہ پیش کرتے ہیں۔پھر دوپہر کا کھانا دوبارہ چائے کا دور''[۳۶]

ان کا دسترخوان اہلِ علم اور صاحب قلم کے لئے ہمیشہ وسیع رہتا ہے۔اکثر ان کے گھر میں ان کے ادبی احباب کی خاص نشست ہوتی ہے۔جن میں محمد اقبال،وہاب عندلیب،ڈاکٹر راہی فدائی،ڈاکٹر فاطمہ زہرا،محمودہ خانم،فیاض شکیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان کی آمد ایثاؔر کے لئے باعثِ مسرت ہوتی ہے۔

احساسِ ذمہ داری:

ایثاؔر نہایت ذمہ دار انسان ہیں۔انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا۔چاہے ان کی ذاتی زندگی ہو یا ملازمت کی ذمہ داریاں کہیں بھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہے۔ان کی احساسِ ذمہ داری کے تعلق سے ایک واقعہ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جب وہ

اندھیری رات میں تنہا جنگل میں سفر کرتے ہیں محض اس لئے کہ ان کے خسر صاحب ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ناراض نہ ہو جائیں۔ وہ رقم فرما ہیں کہ:

''ایک دن اتفاق سے جب ہم لکولی پہنچے تو بس جا چکی تھی، اب تڑسا پہنچنے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ فضل الرحمٰن صاحب نے رات وہیں گزارنے کی صلاح دی جو مجھے مجبوراً مان لینی پڑی رات کا کھانا کھا کر دونوں اپنے بستروں پر چلے گئے، میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، نیند نہیں آئی، گھر پر خسر صاحب آئے ہوئے تھے اور صبح بنگلور واپس جانے والے تھے روانگی کے وقت میں موجود نہ ہوں تو نہ جانے کیا سوچیں گے! یہ خیال آتے ہی میں نے کسی بھی قیمت پر گھر لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا، فضل الرحمٰن صاحب کو آواز دی اور انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کرنے کے بعد لاٹھی اور ٹارچ مانگی، انہوں نے بہت منع کیا، رک جانے پر اصرار کیا، کہا کہ ہاتھی جنگل چلے گئے ہیں اور کوئی ایسا بھی نہیں جو ہم سفر ہو سکے، لیکن میری ضد اور بے چینی دیکھ کر انہوں نے ہتھیار ڈال دئے لاٹھی اور ٹارچ فراہم کی اور رات تقریباً 10 بجے میں تڑسا کے لئے روانہ ہو گیا۔'' ۴۷

ہمدردی:

ایثارؔ نہایت رحم دل انسان واقع ہوئے ہیں۔ ملازمت کے دوران چند واقعات ایسے ہیں جو ان کی انسانی ہمدردی کی عمدہ مثال ہیں۔ سرنگیری کے جنگل سے شیموگہ واپسی کے دوران سڑک کے کنارے کسی کی کراہنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اس شخص کو اپنی ویان میں پیچھے لٹایا۔ وہ شخص پیچش کا شکار تھا جس سے پوری گاڑی بدبو سے بھر گئی۔ اور حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ وقفے وقفے سے ویان روک کر کھلی فضا میں سانس

لینا پڑ تا۔اس تکلیف کے باوجود وہ بیزار نہ ہوئے بلکہ اس شخص کو اس کے گھر تک پہنچانے کے بعد اپنی منزل پر روانہ ہوئے۔اسی طرح ان کے دفتر کے سپر نٹنڈنٹ کی بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ایثؔار رقمطراز ہیں:

> ''میگن ہسپتال میں ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر بنگلور کی کسی بڑی ہسپتال میں داخل کرنا ہوگا ورنہ جان کی خیر نہیں۔فوری طور پر کسی گاڑی کا انتظام نہیں ہوسکا۔ہماری ویان ہی ایک ذریعہ رہ گئی تھی۔میں نے کہا ''حکومت کو جو بھی فیس ادا کرنی ہوگی کردیں گے ڈرائیور آنند کو ہدایت دی کہ بیمار اوراس کے نگرانوں کو جلد اور بحفاظت بنگلور پہنچا کر واپس آجائے۔سرکاری گاڑی کا اس طرح غیر سرکاری کاموں میں استعمال ہونا قابلِ اعتراض ہوتو ہو۔لیکن ایک انسانی زندگی بچانے کی راہ میں وہ کونسی حد ہے جو پار نہیں کی جاتی۔'' ۴۸

یادداشت/قوتِ حافظہ:

ایثؔار کا حافظہ قوی ہے۔ان کی زندگی کی ہر بات، ہر حادثہ، ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ ان کے ذہن پر جوں کے توں مرتسم ہے۔برسوں کے وقوع پذیر واقعات کو من وعن پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ہزاروں جزئیات ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں موجود ہیں جسے انہوں نے اپنی خود نوشت ''سراغِ زندگی'' میں محفوظ کیا ہے۔اس خودنوشت میں انہوں نے برسوں پرانی باتیں مکمل اعتماد کے ساتھ سلسلہ وار معمولی معمولی جزئیات کے ساتھ یوں بے ساختہ رقم کیا ہے۔گویا یہ کل کی باتیں ہوں تازہ و شگفتہ اور صاف واضح اندازِ بیان، چاہے شخصیت ہو یا کوئی واقعہ پوری طرح ابھر کر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

کثرتِ مطالعہ:

ایثآر کو بچپن ہی سے مطالعہ کا بے حد شوق رہا ہے۔اوران کا یہ شوق کتب خانے کی کتابیں پورا کیا کرتی تھیں۔طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ مستقل مطالعہ نگاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔وہ درسی اور غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ساتھ ساتھ معنی و مطالب پر بھی غور وخوض کرتے۔اپنے شوق کی آبیاری کے لئے مختلف رسائل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے۔مطالعے کا یہ عمل ان کی صلاحیتوں کے نکھارنے میں بہترین معاون ثابت ہواملازمت کے دوران بھی یہ شوق کسی حد تک قائم رہااوراسی شوق نے انہیں ایک کامیاب مترجم بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ذوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کی مصروفیات کے باوجود مطالعہ کے لئے وقت نکال ہی لیتے۔خصوصاً کلامِ اقبال سے انہیں بے حد رغبت تھی۔ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''ایک دن لائبریری میں ایک کتاب پر اقبال کا نام دیکھا ،طبیعت للچائی ،کتاب اٹھالی دیکھا تو اس کا نام جاوید نامہ تھا اور اس کی زبان فارسی ،میرا عالم'' زبان یارمن ترکی،نمی دانم ،نمی دانم'' کے مصداق تھا،فارسی سے ناواقفیت کے خیال سے دل بجھ گیا پھر بھی کتاب واپس رکھنے کو جی نہیں چاہا گھر لے آیا،سخن فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تاہم وزن سے پڑھنا آتا تھا،پڑھتا چلا گیا،معنی ومفہوم سے نہ سہی لیکن زبان کی موسیقیت سے دل ضرور محظوظ ہوا'' انٹرمیڈیٹ میں علامہ اقبال کی ایک اور فارسی کتاب ''اسرارِخودی'' یوسف سلیم چشتی کی مختصر شرح کے ساتھ ملی،گھر لاکر شوق سے پڑھی اور کتاب مجھے بہت پسند آئی پاس رکھنے کو جی چاہا، قیمت چھ روپیہ میری سکت سے باہر تھی،ایک ترکیب سوجھی گھر میں مشق کے لئے جو کاغذات تھے انہیں جوڑ کر

ایک کاپی بنائی اور کتاب نقل کر لینے کے بعد واپس لوٹا دی۔''۴۹؎

ایثؔار بیگ وقت شاعر اور مترجم ہیں زندگی بھر ادبی سرگرمیوں میں مصروف بہ عمل رہے۔قلم اور کاغذ ان کا متاعِ حیات ہیں۔اگر یوں کہا جائے کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ کتابوں کے لئے وقف ہے تو بے جا نہ ہوگا۔وسیع مسلسل اور متنوع مطالعے کی وجہ سے معلومات کا بیش قیمتی خزانہ ان کے حافظے میں محفوظ ہے۔انہیں اردو،انگریزی،فارسی اور کنڑا زبان پر ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔انہوں نے اردو کی پوری ادبی تاریخ سے حسبِ ضرورت کسبِ فیض کیا۔کئی شخصیات سے علم و ہنر کے موتی حاصل کئے۔جن میں اقبال،غالب،میرا ہم ہیں۔انہوں نے قدیم وجدید تمام رنگوں کو باہم آمیز کر کے اپنا الگ لہجہ واسلوب تیار کیا۔اور علم وحکمت کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔عموماً کہا جاتا ہے کہ پیڑ جتنا پھل دار ہوتا ہے اتنا ہی جھک کر رہتا ہے۔ایثؔار پر یہ مثال صادق آتی ہے۔وسیع مطالعہ اور ذخیرۂ معلومات کے باوجود انہوں نے کبھی علمی تفاخر یا برتری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی انکساری ان کی تحریروں سے صاف جھلکتی ہے۔ایسے منکسر المزاج ادیب کی مثال بہت کم ملتی ہے جو کبھی بھی اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا بلکہ خاموشی سے کامیابی کے جھنڈے گاڑتا چلا جاتا ہے۔یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان کی اردو سے بے لوث محبت کا ثبوت دیکھیں کہ اپنی ماہانہ پنشن کو اردو تحریک پر خرچ کرتے ہیں آپ نے ایک پبلیکیشن ہاوز بنام ایثؔار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ بھی قائم کی۔اس کے علاوہ آپ بنگلور شہر کی مساجد اور کرناٹک وقف بورڈ کے صدر اور ممبر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔

لائبریری:

مطالعہ کلام اقبال سے انہیں بے حد شغف ہے۔مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا اور اپنے گھر کی ذاتی لائبریری میں ہر طرح کی دینی و ادبی کتابوں کو جمع کرنا ان کا اہم مشغلہ ہے۔ان کی لائبریری میں بے شمار کتابیں ہیں۔جن میں قرآن مجید کے ترجمے و تفاسیر،احادیث کے مجموعے،سیرتِ نبی پر مختلف کتابیں، دینیات و اسلامیات کی کتابیں بھی موجود ہیں۔فارسی و عربی زبان کی کتابیں،مختلف قسم کی ڈکشنریاں، جیسے

آکسفورڈ ڈکشنری، فیروزاللغات،نوراللغات،لغاتِ کشوری وغیرہ موجود ہیں۔اس کے علاوہ لاتعداد قدیم رسائل اوران کے خصوصی شمارے دستیاب ہیں۔ان کا کتب خانہ ان کی خوش ذوقی و وسیع النظری کی دلیل ہے۔

سیرت وکردار کے اس تفصیلی جائزے کے بعد جوتصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جس نے ساری زندگی نہایت شرافت ،پاک بازی،اوروضعداری سے بسر کی۔انکساری کے باوجود خودداری کوکبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ایثآر ہمت وحوصلہ اورعزم کا پیکر مجسم ہیں ان کی پوری زندگی صبر و استقلال اورثابت قدمی کی ضامن رہی۔انہوں نے اپنی انتھک اور مسلسل کوششوں سے یہ ثابت کردکھایا کہ:

مشکلیں آتی ہیں ہمت آزمانے کے لئے
قوتِ پنہاں بروئے کارلانے کے لئے

ان کی ساری زندگی آنے والی نسلوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔اس وقت ایثآرعمر کے۹۵ سال مکمل کر چکے ہیں لیکن اپنی فعال طبیعت،مصروفیت،قابلیت کے اعتبار سے نوجوانوں کوبھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ان کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ چندلفظوں میں سمونا مشکل ہے۔محض یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ ایک نہایت سچے، وضعدار،مخلص،منکسرالمزاج شخصیت کے مالک ہیں۔حقیقت میں وہ صبروتحمل،فکروفراست،اورمسرت کا ایک ایسا سرچشمہ ہیں جوتشنگانِ ادب کومدتوں سے سیراب کررہاہےاورکرتا رہے گا۔

حوالے

۱۔ادب کا مطالعہ،ڈاکٹر سید عابد حسین،ص 165،اردو گھر علی گڑھ

۲۔وارداتِ ایثار اور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص 72،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۳۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 29،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۴۔وارداتِ ایثار اور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص 72،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۵۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 45،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۶۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 48،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۷۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 26،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۸۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 50،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۹۔شخصی انٹرویو،۱۲ستمبر۲۰۱۳ء

۱۰۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 51،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۱۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 57،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۲۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 63،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۳۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 85،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۴۔بھرپور شخصیت،سید احمد ایثار (مضمون)،ڈاکٹر فوزیہ چودھری،مشمولہ وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص،62ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۵۔بھرپور شخصیت،سید احمد ایثار (مضمون)،ڈاکٹر فوزیہ چودھری،مشمولہ وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص،61ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۶۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 145،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۷۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 236،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ،بنگلور

۱۸۔حقیقی دشتِ نوردی کا اولین مرقع (مضمون)،م ن سعید،مشمولہ وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص، 62 ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۱۹۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 146،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۰۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 143،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۱۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 77،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۲۔شخصی انٹرویو،۲۲ دسمبر ۲۰۱۳ء
۲۳۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 324،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۴۔شخصی انٹرویو،۲۴ فروری ۲۰۱۴ء
۲۵۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 34،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۶۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 41،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۷۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 116،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۸۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 109،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۲۹۔ضیاء دارالامور، ڈاکٹر محمد حاذق ندوی،ص 67،مرکزی دفتر دارالامور ٹیپو سلطان ریسرچ سنٹر سینٹ مارکس روڈ، بنگلور
۳۰۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 243،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۳۱۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 244،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ، بنگلور
۳۲۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 258،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ
۳۳۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 286،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ
۳۴۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص ۷۱،ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ، بنگلور
۳۵۔تحریر و تنقید،طیب انصاری،ص ۱۱۰، پرویز بک ایجنسی،حیدرآباد
۳۶۔ قیمت و قامت، وہاب عندلیب،ص ۲۹،اعجاز پرنٹنگ پریس،چھتہ بازار،حیدرآباد
۳۷۔گفتار و کردار، وہاب عندلیب،ص ۱۱۹،انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ

۳۸۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص 47،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۳۹۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص 71،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۰۔بھرپور شخصیت،سید احمد ایثار (مضمون)،ڈاکٹر فوزیہ چودھری،مشمولہ وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص، 57 ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۱۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص 76،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۲۔شاعر شیریں مقال،سید احمد ایثار (مضمون) سید ابوتراب خطائی ضامن،مشمولہ وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص 135،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۳۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص 72،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۴۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص 74،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۵۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 93،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۶۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص 75،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۷۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 96،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۸۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 155،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

۴۹۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 249،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ، بنگلور

باب دوم

﴿......سید احمد ایثارؔ کا ادبی سفر......﴾

ادب اور زندگی کا تعلق ناگزیر ہے۔تاریخ کی ناقابلِ فراموش صداقتیں، انسانی شعور میں جدت طرازی اور فکر وخیال کی وسعتیں پیدا کرتی ہیں۔اس شعور کی روشنی میں انسان جہاں بے شمار نت نئے خواب دیکھتا ہے وہیں اچھوتے تخیل وجود میں آتے ہیں۔اور علم وعمل کے اشتراک سے دل ودماغ میں ہمہ گیر خیالات اور بالغ نظری پیدا ہوتی ہے نیز نئے ادبی افق منصۂ شہود پر آتے ہیں۔یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک انسان اس کرۂ ارض پر اپنے فکر وتخیل اور زندہ شعور کے ساتھ موجود رہے گا۔چنانچہ فنکار کے لئے لامحدود فکری مواد ضروری ہے کیونکہ نظریۂ حیات اور تصورِ حقیقت محض خوبصورت لفظوں کی ساحری نہیں بلکہ ایک مسلسل ریاضت کا نام ہے۔چونکہ ادیب سفر کی ابتداء یہ سوچ کر نہیں کرتا کہ اسے کیا ڈھونڈنا ہے بلکہ بہتر سے بہترین کی تلاش اسکے سفر کی معراج ہوتی ہے۔ادب کی خصوصیات کی بدولت انسانی تاریخ میں بڑے بڑے معرکے اور تحیر کن واقعات رونما ہوئے۔اسی ادب کی وجہ سے دل کی شگفتگی، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری نصیب ہوئی نتیجتاً انسان مسرت سے بصیرت کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اپنی زندگی میں غیر محسوس تبدیلیوں کو قبول کرتا چلا آیا۔مثلاً خوابیدہ احساسات وجذبات کو بیدار کرنا،مصائب ومشکلات میں ثابت قدم رہنااور استقلال واستحکام کا مظاہرہ کرنا وغیرہ۔ادب کی انہی خصوصیات نے زندگی میں نئی روح پھونکی ہے۔ایثاؔر اردوادب کے ایک ایسے مسافر ہیں جنہوں نے اردوادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کے تجربات اور خدمات ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید احمد ایثاؔر ادبی دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔ریاستِ کرناٹک میں سید احمد ایثار کی شناخت ایک منفرد شاعر سے بڑھکر ایک معتبر مترجمِ اقبال کی ہے۔یہ بات قابلِ رشک ہے کہ محکمۂ جنگلات جیسے غیر ادبی ماحول میں رہتے ہوئے ادب سے نہ صرف وابستگی پیدا کی بلکہ اردو ادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ادب کے متعلق ایثاؔر رقمطراز ہیں کہ:

''ادب کی دنیا ایک نرالی دنیا ہے۔ یہ انسان کے دل کی جذبات و محسوسات کی دنیا ہے۔ انسان کب اور کس راستے سے اس دنیا میں داخل ہوتا ہے ان سوالوں کا جواب دلچسپ بھی ہے اور مسرت انگیز بھی۔''[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''ادب کو انسانی زندگی کی سچی، اعلیٰ اور آفاقی قدروں کا حامل ہونا چاہیئے، انسان کے روحانی ارتقاء اور مادی ترقی میں ایک توازن و اعتدال قائم کرنا ہے۔ انسانی جذبات واحساسات کو ہیجان اور انتشار کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ حیات انسانی مسلسل اصلاح یا تزکیہ ہی سے خوبصورت ہوتی اور نکھرتی چلی جاتی ہے اسے ایک اعلیٰ وارفع مقصد کا تابع ہونا چاہیئے۔''[2]

ان کی ادبی دلچسپی کا آغاز بھی دلچسپ ہے۔ اقبال کی مشہور تصنیف ''جاوید نامہ'' مطالعہ کی غرض سے لائبریری سے لی لیکن دیکھ کر معلوم ہوا کہ فارسی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ عجب کشمکش میں گرفتار ہوئے کیوں کہ فارسی زبان سے نابلد تھے لیکن واپس کرنے سے توہین محسوس ہوئی۔ اس سے ان کے ذوق کا پتہ چلتا ہے اتنی چھوٹی عمر میں ایثآر کو لائبریری سے کتاب ہاتھ میں لے کر واپس کرنے میں عار محسوس ہوئی۔ لہٰذا انھوں نے مطالعہ کرنا بہتر سمجھا اور یہیں سے تفہیمِ ادب کا آغاز ہوا۔ ایثآر کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۰ء سے ہوا۔ کم وبیش ۷۵ سال سے وہ شعر وسخن کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ایثآر شعر وسخن کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں ان کا تخلص ایثار اسی ذوقِ سخن کا عطا کردہ ہے۔ اوائل عمری ہی سے انہیں شعر گوئی سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ مڈل اسکول میں وہ نظمیں ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی غزل ۱۸ سال کی عمر میں کہی۔ اکثر وبیشتر کسی نہ کسی جلسہ میں وہ اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے جس سے آپ کے اساتذہ خوش ہوکر آپ کی حوصلہ افزائی

کرتے۔ان کی ابتدائی نظموں میں طرزِ اظہار، جدت و برجستگی اتنی نہ تھی لیکن رفتہ رفتہ طرزِ بیان کو بھی رفعت و بلندی ملی اور ان کی شاعری میں معنویت اور تخیل کی کارفرمائیاں نظر آنے لگیں۔اپنے کلام کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

> ''میرا کلام ایک عام فرد کا کلام ہے کسی دانشور اور مصلح قوم کا نہیں۔ہاں میرے کلام میں تھوڑی رجائیت اور نبرد آزمائی کی جو کیفیت ہے وہ شروع سے میرے اپنے مزاج ،طبیعت اور حالات کی دین ہے''۳؎

ایثآرکو سب سے پہلے جس شخص کی صحبت سے شعروادب سے روشناس ہونے کا موقع ملا وہ ان کے ماموں سید اسمٰعیل تھے جنھوں نے ان کے اندر پوشیدہ فنکار کو دریافت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔سید اسمٰعیل اپنے زمانے کے خوش فکر شاعر تھے اور اختر تخلص کیا کرتے تھے۔تصوف سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ایثآر رقمطراز ہیں:

> ''انہیں کی صحبت میں مجھے نہ صرف خدا کی ذات وصفات کے بارے میں کچھ شدبد ہوئی بلکہ خدا کی ذات سے کبھی مایوس نہ ہونے اور غم واندوہ کو انگیز کرنے کا درس بھی ملا تھا۔''۴؎

بعدازاں ان کے اساتذہ نے ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔اس ضمن میں حضرت عبدالواسع عصری کا نام اہم ہے۔یہ ایثآر کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں عبدالواسع عصری جیسی شخصیت کے دامنِ علم وفضل سے کسبِ فیض کرنے کا موقع ملا۔عصری ان اساتذہ میں سے تھے جو طالبِ علم کی محض تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت کی ذمہ داری بھی اٹھاتے تھے اور جن کی حوصلہ افزائی اور تعاون شاگرد کے لئے خوش بختی کا زینہ بن جاتا تھا۔آج کے دور میں ایسے اساتذہ نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں۔عصری اپنے عہد کے نہ صرف ایک اچھے اور قابل استاد تھے بلکہ ایک عمدہ اور قادرالکلام شاعر بھی تھے۔وہ طلباء میں بے حد مقبول تھے۔اپنے شاگردوں سے انہیں

بہت محبت تھی۔طلبہ کی ذہنی تربیت کا انہیں اچھا سلیقہ تھا نیز معاملہ فہمی اور اصابتِ رائے کے بھی مالک تھے۔انہیں افہام وتفہیم میں خداداملکہ حاصل تھا۔زبان وبیان کی باریکیوں پران کی گہری نظرتھی۔وہ طلباء میں علمی ذوق واستعداد پیدا کرنے کے لئے اپنے مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی ان کی رہبری کرتے تھے۔ان کا سمجھایا ہوا سبق بچوں کے ذہن میں ایسے نقش ہوجاتا تھا جیسے پتھر کی لکیر۔ایثآرعصری کے طریقۂ درس اوران کے اندازِ تفہیم پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کس طرح انہوں نے اقبآل کے ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے مختلف نکات کی طرف توجہ دلائی جس سے ایثآرکو جہاں شعرفہمی میں مدد ملی وہیں ان کی شاعری کا ذوق پروان چڑھا۔وہ کہتے ہیں کہ:

> ''مڈل اسکول کے زمانے میں حضرت عبدالواسع عصری نے علامہ اقبال کے اشعار کی گہرائی اور گیرائی سے آشنا کرایا۔نصاب میں علامہ کی ایک نظم ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' شامل تھی۔ہمیں تشبیہ واستعارہ وکنایہ اورتمثیل جیسے شعری لوازمات سے کہاں شناسائی تھی؟لیکن عصری صاحب نے شعر کے مفہوم تک پہنچنے کے لیےلوازماتِ شعری کی پرتوں کوکھولنے کا طریقہ سمجھایا۔ایک آیتِ قرآنی کے حوالے سےنظم کی تشریح تین چار صفحے لکھوادی۔اس سے نہ صرف طبیعت متاثر ہوئی بلکہ قوتِ فہم کو تقویت حاصل ہوئی۔''۵؎

ایثآرکی یہ خوش قسمتی ہے کہ عصری کے علاوہ حضرت منشی احمد شریف آزاد جیسےفکر پروراوربصیرت افروز استاد کی شفقت ورہنمائی سے مستفید ہوئے۔۱۹۴۲ء میں ایثآرکے ماموں محمد اسمٰعیل نے ان سے ملاقات کروائی۔آزاد صاحب شیواجی نگر بنگلور میں مقیم تھے۔ان کا ایک مدرسہ تھا جہاں وہ بچوں کو اردو عربی اور انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔درس وتدریس ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا اسی لئے وہ اس کام کو پوری دیانت داری سے اورذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔اس کے علاوہ وہ ایک خوش اخلاق اورایک خوش فکر شاعر

تھےان کی شاعری بہترین احساسات کی عکاسی کرتی تھی۔ان کے متعلق ایثؔار کہتے ہیں کہ:

''ان کا کلام بھی بہت اچھا تھا اور بہت زیادہ بھی۔ پتہ نہیں کس کے ہاتھ لگا۔حضرت صاحبِ اولاد نہیں تھے۔اخباروں اور رسالوں میں چھپتے تھے۔مشاعروں میں آکر پڑھتے تھے۔لیکن ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ادھر تحت اللفظ کلام پڑھا اور سیدھے چل دیئے۔دادو تحسین سے یکسر بے نیاز۔''[٦]

ایثؔار آزادصاحب سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔آزادصاحب کا اصلاحِ کلام کا انداز نرالا تھا۔وہ کسی بھی شعر کی اصلاح کرنے کی بجائے اسکی خامیوں کی طرف اشارہ کردیتے تھے نیز اسی موضوع پر اساتذہ کے بیسیوں اشعار سناتے جس سے ایثؔار کو شعر کی اصلاح میں مدد ملتی۔آزادصاحب کے علاوہ ایثؔار نے اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ذاتی محنت اور وسیع مطالعے کے ذریعے اپنے شوق کو پروان چڑھایا۔ادبی سرگرمیوں نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔وہ اکثر شعروسخن کی مجلسوں میں شرکت کرتے۔مشاعروں میں اپنا کلام سناتے۔کبھی صدائے تحسین بلند ہوتی تو کبھی اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔۱۹۵۸ء میں مجلسِ ادب میں ایک ادبی جلسے کا اہتمام کیا گیا جہاں ایثؔار نے بھی شرکت کی وہاں ان سے بھی اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی گئی انہوں نے درج ذیل رباعی سنائی،جس پر کئی اعتراضات ہوئے۔

پھولوں کے لئے پھول کا رس دشمن ہے
یا آتشِ دامانِ مگس دشمن ہے
کیا کہتے ہو انسان کی ہے دولت دشمن
دولت نہیں دولت کی ہوس دشمن ہے

ایثؔار نے وضاحت بھی پیش کرنی چاہی مگر کسی کی تسلی نہیں ہوئی۔اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ کبھی مجلسِ ادب نہیں گئے۔لیکن انہوں نے اپنی مشق جاری رکھی۔انہوں نے فارسی اور اردو کے کلاسیکی شعراء کا گہرا

مطالعہ کیا۔فن شعراور زبان کی باریکیوں سے واقف ہوئے۔اوراپنے کلام میں گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کے لئے مطالعہ کو ناگزیر سمجھا۔ذوقِ مطالعہ نے ان کے ذہن اور دل کے سارے دریچے روشن کر دیے۔ان کی شاعری میں برجستگی بھی ہے بلند خیالی بھی۔سادگی بھی ہے اظہار کی خوش سلیقگی بھی۔ان کی شاعری دلنشیں بھی ہے فکر انگیز بھی۔فلسفیانہ تفکر کی وجہ سے ان کی شاعری پر سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ایثاؔر کا پہلا شعری مجموعہ ''ترانہ وترنگ'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔یہ شعری مجموعہ رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔اس کے بعد'' آبفشار'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں حمدیہ نظمیں،غزلیں،قطعات اور رباعیات اپنی تمام تر فکری تہہ داریوں اور وجدانی کیفیتوں کے ساتھ روشنیاں بکھیر رہی ہیں۔ڈاکٹر فرزانہ فرح ان کے کلام کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''دریا کے راستے میں کوئی نشیب وفراز نہ آئے،رکاوٹ نہ ہوتو اس کی روانی میں کوئی شائبہ نہیں ہوتا مگر جہاں رکاوٹ کے آثار نمودار ہوئے،دریا کی رفتار مدہم ہوجاتی ہے،یہ سست رفتاری ایک لحاظ سے فطری امر ہے تاہم ایثار صاحب کے معاملے میں قاری یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ یہاں فکر وفن کا دریا بہتے بہتے یکلخت مڑ گیا مگر اس کی روانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔پہلے اس نے بستی کو شاداب کیا تھا پھر وہ صحراؤں کی پیاس بجھانے لگا۔بہ الفاظِ دیگر یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس نے عمر عزیز کا ایک تہائی حصہ جنگلات کی نذر کیا۔انسانوں سے اور اپنوں سے دوری نے،صبر آزما حالات نے تنہائی نے اور خطرات نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں میں کوئی قدغن نہیں لگایا۔ان کے خارجی اور داخلی حالات نے ایک دوسرے میں خود کو اس طرح ضم کرلیا کہ اس کے انجذ اب کے عمل نے ایک نئی کیفیت اور ایک

نئے رنگ کو جنم دیا جس کے شیڈز جہاں تہاں ان کے اشعار میں
جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ ؎

ایثآر نے اپنی شاعری میں مختلف و متعدد موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے جہاں سیاسی موضوعات کو منظوم کیا ہے وہیں تاریخی و مذہبی شخصیات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔انکی شاعری ان کے دلکش و دلنشیں اور دل آسا تاثرات،محسوسات،اور جذبات کی مظہر ہے۔اسی سبب ان کے اشعار اپنے آہنگ اور ترنم سے قارئین کے دلوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فکر سخن میں رفعتِ افلاک چاہیئے
لے آئیں گے زمینِ غزل آسماں سے ہم

جو ہوسکتا تو سینہ چیر کر دل رکھ دیا ہوتا
ثبوت اپنی صفائی کا مقابل رکھ دیا ہوتا

روتی ہے شمع بزم تو ہنستی ہیں بجلیاں
اک طرفہ اہتمام ہے بارش میں رات کا

دو عالم کی حقیقت فاش ہوسکتی ہے دم بھر میں
ذرا خود آشنا ہو جا کہ تو ہی رازِ ہستی ہے

پہنچ جاتا ہے بس اک جست میں یہ آسمانوں پر
سمندِ فکر کے آگے بلندی ہے نہ پستی ہے

ایثآر نے کلاسیکی شعراء سے لیکر اقبال تک اثرات قبول کئے اور شعری روایات سے پورا استفادہ کیا۔انہوں نے اپنے تجربات واحساسات کو فنی حسن میں تحلیل کر دیا ہے۔،پیکر تراشی،مناظرِ قدرت کی

ساحرانہ تصویر کشی اوران کا شدتِ احساس ان کے کلام کا جوہر ہے۔

واہ رے موسمِ گل اف یہ حسینانِ چمن
کھنچ گئی آنکھ میں تصویر پری خانے کی

باغ و بہار، حسرتِ پرواز بے بسی
پر مارنا کبھی کبھی زنجیر دیکھنا

پوچھیں جو خضر سے بھی ملے گا یہی جواب
مدت فقط دو روزہ ہے عمرِ دراز کی

دے دے کے پیچ زلف کو سلجھا رہے ہیں وہ
گتھی سلجھ رہی ہے نشیب و فراز کی

ایثؔار کی منظومات زندگی، کائنات کے حسن، انسانی احساس و جذبات، اور سماج کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔ انہوں نے ان سچائیوں کو بے نقاب کیا جنہیں دیکھا اور محسوس کیا۔ یہ سچائیاں اقدار کی پامالی کی بھی تھیں، اور کھوئی ہوئی تہذیب کی تلاش کی بھی۔ انہوں نے اس معاشرے کے پرآشوب حالات وکوائف کو اپنی ذات کا جز و بنایا جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ اسی لیے ان کا فن کسی نہ کسی انسانی مسئلے سے جڑا ہوا ہے، جو زندہ رہنے کا گر سکھانے، غیر معتبر حرف تسلی سے اجتناب کرنے اور زندگی کے ہزار پہلوؤں کی تفسیر و تعبیر بیان کرنے سے عبارت ہے۔ ان کی نظمیں داخلی اور خارجی حالات کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے ایک نئی کیفیت ابھرتی ہے کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگلات کی رنگینی و خاموشی میں گزرا تو وہی اندازِ نظر ان کی نظموں کا خاصہ ہے۔ زندگی کی تپش اور دنیا کی سفاکیوں کی آگ میں جھلسے چہرے ان کے اشعار کے آئینے میں پوری دردمندی کے ساتھ منعکس ہوتے ہیں۔ آبفشار میں شامل نظم ''پاپا کی سرگذشت'' اس کی بہترین مثال ہے۔ ایثؔار نے یہ نظم ۱۹۴۸ء میں

لکھی۔عبدالرحمٰن عرف پاپا اس شخص کو ایثؔار نے چکنا یکن ہلی میں دیکھا تھا۔بقول ایثؔار وہ شخص محنت ومزدوری کرکے اپنا گزارا کرتا تھا مگر چیچک کی وجہ سے اس کی بینائی چلی گئی اور اب وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔

اک زمانہ تھا سہارے کی تجھے حاجت نہ تھی
کم تھی بینائی مگر تیری کبھی یہ گت نہ تھی
تیری دنیا میں بھی تھی دورنگیِ لیل ونہار
تیری آنکھوں نے بھی دیکھے جلوہ ہائے بے شمار
زیرِ پا تو نے زمیں دیکھی فلک بالائے سر
خشک وتر دیکھے ادھر،اور چاند تارے چرخ پر
آنکھ کرسکتی تھی تیری امتیازِ خوب وزشت
تو نے دیکھی ہے طبیعت خار کی،گل کی سرشت
تجھ کو بھی بھاتا تھا ہر نظارۂ حسن وجمال
تجھ کو بھی معلوم ہو جاتے تھے سب نقص وکمال
پھر بھی آرام وخوشی سے دور رہنا تھا تجھے
عمر بھر افسوس! اک مزدور رہنا تھا تجھے
سخت کوشی میں تو اپنی جان کو کھوتا رہا
گرد ماتھے کے عرق سے رخ کی تو دھوتا رہا
راہ ناہموار،کمزور آنکھ،سر پر اک وبال
مشکلوں پر ہنس رہی تھی پھر بھی تیری تیز چال
شیوۂ مردانہ آخر وجہ خواری بن گیا
کھو کے آنکھیں آج تو بھی اک بھکاری بن گیا

ان کی شاعری میں متانت اور سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے وہ اس دور کے انسانوں کے درد وکرب کا گہرا

ادراک رکھتے ہیں۔اور دورِحاضر کے سنگین حقائق نیز صوفیانہ خیالات کو بڑی خوش اسلوبی اور برجستگی کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔وہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں اسے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور اس کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے مختلف اصناف میں کر دیتے ہیں۔ان کے حقیقی جوہر غزل اور رباعی میں کھلتے ہیں۔مثال کے طور ترانہ وترنگ سے چند رباعیات پیش ہیں۔

سب روح وبدن،کلام اسرارِحیات
در پیش ہیں صبح وشام اسرارِحیات
صرف ایک بصیرت کی کمی ہے ورنہ
پیدا ہیں جہاں تمام اسرارِحیات

اے کون ومکاں کے نوردرغیب حضور
مطلوب کلیم اے سبب جلوۂ طور
ہم کووہ بصارت وہ بصیرت ہو نصیب
ہر شئے میں جو دکھلائے عیاں تیرا ظہور

چہرے کی صباحت پہ گلابی رنگت
خوشبو وہ پسینے میں نمکین صورت
وہ زلفِ سیہ، وہ قدِ رعنائے رسولؐ
خود ڈھال کے حیراں ہے خدا کی قدرت

اے بحرِ معانی یہ تعمق ، یہ ترنگ
آئینہ صفت رنگ ترے،خود بے رنگ
بے مثل، بلا عیب،تو ایک چیز عجیب
اے ہوش ربا بربطِ فردوس آہنگ

مایوس ہے تو کس لئے اے دل، اے دل
کیا چاہئے اب اس سے سوا اے غافل
ٹل جائیں گی مشکلیں جو ہو رو بہ عمل
آسانی ہو، مشکل نہ رہے گی مشکل

پتھر سے نکلتے ہوئے دھارے دیکھے
ظلمت میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے
ایثارؔ کئی حوصلہ مندوں نے یہاں
پستی سے بلندی کے نظارے دیکھے

لو چیر کے سینہ رکھ دیا دل ہم نے
آئینے کو کر دیا مقابل ہم نے
ایثارؔ جو بدظن تھے وہ بدظن ہی رہے
ہر چند دیا ثبوت کامل ہم نے

زندگی کی حقیقتوں کا عرفان آسان نہیں ہے۔ اتنے تضادات اور پیچیدگیاں ہیں کہ انسانی ذہن کے لئے ان کا سلجھانا مشکل ہے۔ معاشرتی زندگی پر بے حسی کے منڈلاتے عفریت کو دیکھکر ایثارؔ بہت مایوس ہیں۔ مادی دور کی لعنتوں نے لوگوں سے سماعتیں اور گویائی سلب کر لی ہے۔ حق گوئی اور بے باکی اب خواب وخیال بن چکے ہیں اور زندگی اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ نتیجتاً افراد انسانیت کی سطح سے گرتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی تخلیقی صلاحیت کو مقصدیت سے مزین کر کے ایثارؔ نے اپنے خیالات نظم کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

بہتات پہ دولت کی اکڑنے والو
ہڈی کے لئے اپنوں سے لڑنے والو

دولت کو اکٹھا کئے جاؤ گے کہاں
پتوں کی طرح سوکھ کے جھڑنے والوں

''ترانہ وترنگ'' کی رباعیات ایثآر کے ہمہ جہت خیالات، جذبات واحساسات کی ترجمان ہیں۔وہ مشکل سے مشکل خیالات کو ادا کرنے میں ماہر ہیں۔سادہ اسلوب، گہری فکر ووسعتِ نظر اور مناسب الفاظ نے ان کی رباعیات کے حسن میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔بقول علیم صبا نویدی:

> ''سید احمد ایثآر نے رباعیات کو ''ترانہ وترنگ'' میں پیش کرتے ہوئے موزوں افتادِ طبع کی داد حاصل کی ہے۔رباعی جیسی نازک صنف میں جہاں لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں وہاں سید احمد ایثار نے جرات مندی سے کام لیا ہے اور بڑی کامیابی سے اس صنف میں اپنے خیالات کو اجاگر کیا ہے۔''۸؎

ایثآر کی شاعری میں زندگی کے مختلف رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔اوران تمام رنگوں کے امتزاج سے ان کی شاعری کا رنگ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ان کی شاعری نے انکی جہاتِ علمی کو روشنی دے کر اسے رنگِ بصیرت سے نوازا اوران کے علمی سفر کی راہوں میں مرحلۂ شوق ثابت ہوئی۔

ایثآر کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ بالکل شعروسخن سے کنارہ کش ہوگئے۔اورشعروسخن کی جگہ دینیات واسلامیات اور قرآن مجید کی تفہیم وتفسیر کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔یہ کیفیت ہنوز باقی ہے۔اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی ادبی زندگی کو ایک نیا رخ دے دیا۔رمضان کا مہینہ تھا ایثآر دن بھر کی مصروفیت کے خیال سے آرام کرنا چاہتے تھے کہ ان کی نظر مولانا آسی کی مرتب کردہ نسخۂ رباعیاتِ خیام پر پڑی۔انھوں نے یوں ہی پڑھنے کے لئے کتاب کھولی تو درج ذیل رباعی ان کے سامنے تھی۔

روزے کہ شوداذ السماء انشقت

واں دم کہ بود اذ النجوم کدرت
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات
گویم صنما ! بای ذنبٍ قتلت

اس رباعی کو پڑھتے ہوئے ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔اس شعری اسلوب اور قرآنی سوچ نے ان کی سوچ کا رخ موڑ دیا۔اسی کیفیت میں انھوں نے اس رباعی کا منظوم اردو ترجمہ کر دیا۔ترجمہ ملاحظہ ہو:

جس روز یہ آسمان شق ہوتا ہے
منہ تاروں کا جس وقت یہ فق ہوتا ہے
پوچھوں گا گریباں پکڑ کر اے صنم !
معصوم کا خوں بھی کہیں حق ہوتا ہے

انہیں اپنا ترجمہ اچھا لگا انہوں نے عمر خیام کی مزید رباعیات کا ترجمہ کیا اور سب سے پہلے سید حسین کو دکھایا۔سید حسین ایثآر کے ماموں کے دوست تھے۔محکمۂ آب رسانی میں ملازم تھے۔انہوں نے ایثآر کی کوشش کو سراہا۔ایثآر لکھتے ہیں کہ:

''یوں ہی چند منتخب رباعیوں کا ترجمہ کر کے بنگلور لے آیا۔شولہ کے مارکھم روڈ پر جیپ رکوا کر ڈرائیور کو سید حسین کو لانے بھیجا۔وہ آئے رباعیات کا ترجمہ ان کے حوالے کیا۔انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کاغذ کو سیٹ پر پھینک کر گھر کی طرف دوڑے۔میں آوازیں دیتا رہ گیا، مگر وہ گھر میں داخل ہوگئے۔کچھ دیر بعد پاکٹ ایڈیشن دو کتابیں لائے۔دیکھا کہ یہ

بھی رباعیات عمر خیام کا پروفیسر واقف صاحب کا ترجمہ
ہے۔ مجھے دے کر بولے کہ ان کتابوں کو رکھ لوں اور اپنے طور پر
الگ ترجمہ کرکے انہیں لا دوں۔''[9]

ایثآر کو اس واقعے کے ذریعے ترجمے کے لئے تحریک ملی۔ اور انہوں نے عمر خیام کی ۲۷۷ رباعیات کا اردو میں منظوم ترجمہ کردیا۔ یہ دلچسپی اس قدر بڑھتی گئی کہ اسی رو میں شمس تبریز کی ۴۳۶ رباعیات اور سعدی شیرازی کی ۱۶۱ اور حافظ شیرازی کے ۸۸ رباعیات کا ترجمہ کردیا۔ اور سید حسین ان تراجم کو اپنی خوش نویسی سے سجاتے رہے۔ جس سے ان کے تراجم محفوظ رہے۔ سید حسین نے اپنی استطاعت کے مطابق ہر گام پر ان کی مدد کی۔ مسلسل تراجم اور سید حسین کی حوصلہ افزائی سے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ بڑھتا گیا۔ ایثآر نے سید حسین کے احسانات کا بہت جگہ ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا شعری مجموعہ ''ترانہ وترنگ'' ان کے نام معنون کیا ہے۔ زمانہ طالبِ علمی ہی سے کلامِ اقبال ان کے دل و ذہن کا مرکز و محور رہا۔ وہ اکثر وقت لائبریری میں کلامِ اقبال کے مطالعے میں گزارتے جہاں وہ اقبآل کے فارسی کلام کو پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ انٹرمیڈیٹ میں تعلیم کے دوران اسرارِ خودی ان کے ہاتھ لگی۔ قیمت چھ روپے تھی لیکن خریدنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے پوری کتاب نقل کرڈالی جس سے انہیں بیشتر اشعار ازبر ہوگئے۔ وہ اکثر گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر آنے جانے کے دوران اقبال کے اشعار گنگناتے جاتے۔ فارسی زبان سے مکمل آگہی نہ ہونے کے باوجود اقبال کے کلام میں انہیں ایسی دلکشی نظر آئی کہ اقبال کے کلام کی طرف ان کا میلان بڑھتا گیا۔ شروع میں فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر وہ اشعار کے معنی و مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے تھے لیکن اپنی ذاتی محنت و لگن اور آمدن سی لفظی کے ذریعے انہوں نے فارسی زبان پر عبور حاصل کرلیا۔ اسی زمانے میں ان کے نانا کے گھر رسالہ پیشوا آتا تھا جس میں رباعیاتِ خیام اور گلستان و بوستان کے اشعار اور تراجم و تشریحات نظم ہوتی تھیں۔ ایثآر اس رسالے کا باقاعدہ مطالعہ کرتے۔ اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے استاد سید نصیرالدین چشتی نے فارسی سیکھنے میں ایثآر کی رہنمائی کی۔ سید نصیرالدین چشتی مسجد میں امام تھے۔ ان کے خطبے بڑے دلچسپ ہوتے تھے انہیں مولانا جلال الدین رومی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ایثآر کلامِ اقبال سے بے

انتہا متاثر تھے۔کلامِ اقبال کے ذریعے جہاں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا وہیں ان کے ادبی جوہر بھی کھل کر سامنے آئے۔اقبال کے حکیمانہ اندازِ فکر،حسنِ بیان اور نظریات سے ایثاؔر بے انتہا متاثر ہیں۔ انہوں نے ایک نظم بعنوان ''علامہ اقبال پیام وشخصیت''،لکھی جس میں ایثاؔر نے اقبال کی شخصیت ،سیرت و کردار،علم وفن،دانش وبصیرت اور فکر وفن کی جس خوبصورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ عکاسی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔وہ ایک بلند قامت اور جامع الکمالات شخصیت ہیں۔وہ اپنے عہد کی جدید فکری تحریکات سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔اقبال اوران کے کلام کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایثاؔر یوں رقمطراز ہیں:

> ''اقبال کی شاعری زندہ کلام ہے۔اس میں زندگی کی ہنگامہ آرائی موجزن ہے۔ہماری تہذیب وثقافت کا ایک گراں بہا خزانہ موجود ہے۔اس کے اندر ملک وقوم بلکہ ساری انسانیت کی رہبری کے لئے کافی روشنی اورقوت پائی جاتی ہے۔نہ صرف اس کا فلسفہ بلکہ ادبیت بھی آپ اپنی مثال ہے۔''[۱۰]

کلامِ اقباؔل کی انہی خصوصیات نے نہ صرف ان کی ادبی وفکری ذوق میں تلاطم برپا کردیا بلکہ ان کے ذہن کو اس قدر مسحور ومسخر کردیا کہ انھوں نے اپنی بقیہ زندگی اقباؔل کے جملہ فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے میں صرف کردی۔اور ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک اقبال کے تمام فارسی کلام (اسرارِ خودی،رموزِ خودی، پیامِ مشرق،ارمغانِ حجاز،زبورِ عجم،جاوید نامہ،پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق) کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔جب تمام ترجمے مکمل ہوئے تب اشاعت کا مرحلہ درپیش تھا۔ان کے احباب اشاعت پر زور دینے لگے۔چونکہ اشاعت سے قبل نظرِ ثانی کا مرحلہ تھا اس سلسلے میں خالد عرفان نے ایثاؔر کی حسبِ استطاعت مدد کی۔خالد عرفان ادیب بھی تھے مبصر بھی،انگریزی اور اردو ترجمہ نگاری میں انھیں عبور حاصل تھا۔انہوں نے ایثاؔر کے تراجم کو سراہا اوران کی ملاقات آغا مرزا محمود سروش سے کروائی۔سروؔش بنگلور کالج میں شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے انہوں نے تمام تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد اشاعت پر زور دیا۔سروؔش سے ملاقات اوران کے مشوروں اور تراجم سے متعلق ان کی حوصلہ فزائی نے ایثاؔر کو کسی حد تک مطمئن کردیا۔اور وہ اشاعت کی طرف

متوجہ ہو گئے لیکن معاشی مسئلہ ہنوز درپیش تھا اسی دوران ان کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ محمد اسمٰعیل جو پیشے سے الیکٹریکل چیف انجینئر تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ ایثآر کے تراجم کے متعلق جان کر انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ نیز وہ بھی کلامِ اقبال کے شیدائی تھے انہوں نے ایک دن ۵۰۰۰ روپے ایثآر کے ہاتھوں میں رکھ دیے اور کتابت شروع کروانے پر زور دیا تو ایثآر شش و پنج میں پڑ گئے۔ حالانکہ اس رقم سے اشاعت ممکن نہ تھی مگر اس واقعہ نے ان میں حوصلہ بخشا۔ چنانچہ ایثآر کی بے انتہا اور مسلسل کاوشوں کے باعث آخر کار کتابت کا کام شروع ہوا تب پیش لفظ کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس دوران خالد عرفان نے روزنامہ سالار کے چیف ایڈیٹر مقصود علی خان کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ خالد عرفان اور ایثآر نے مقصود علی خاں سے رابطہ کیا۔ مگر مقصود صاحب نے پیش لفظ لکھنے سے احتراز کیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ پیش لفظ لکھیں گے تو یہ کتاب محض ریاستِ کرناٹک تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ایثآر کے اس عظیم کارنامے سے پوری ادبی دنیا واقف ہو۔ لہٰذا انہوں نے کرناٹک کے گورنر خورشید عالم کے توسط سے جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خان تک رسائی حاصل کرلی۔ اور پروفیسر مسعود علی خان نے پیامِ مشرق (منظوم ترجمہ) میں پیش لفظ لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''سید احمد ایثآر نے ایک ایسے شعری شاہکار کے ترجمے کا بیڑا اٹھا کر اردو زبان پر احسان کیا ہے۔ شعر کا ترجمہ یوں بھی جان لیوا ہوتا ہے، خاص کر جب دوبدو اقبال جیسا قادرِ کلام شاعر ہو۔ شعر کا ترجمہ کرنے میں اگر مکھی پر مکھی ماردی جائے تو یہ تضیعِ اوقات اور سعیٔ رائیگاں ہوگی۔ اسے پڑھنے سے بہتر ہے کہ اس کا ترجمہ نثر میں پڑھ لیا جائے۔ اگر فٹز جیرالڈ کی رباعیاتِ عمر خیام کی مانند یہ ضرورت سے زیادہ آزاد ہے، تو یہ اعلیٰ شاعری میں شمار کئے جانے کے باوجود، ترجمہ کے زمرے سے خارج ہوجاتا ہے۔ اچھے شعری ترجمے کی کیفیت ''اسیری و رہائی'' کے مابین

ہوتی ہے۔یعنی ترجمہ ہوتے ہوئے اپنے اصل سے صورت و معنی
دونوں لحاظ سے قریب ہو۔اس طرح کے ترجمے کے لئے ضروری
ہے کہ مترجم نہ صرف اپنی زبان کے شعری نکات ومحاورات سے
پورے طور پر واقف ہو بلکہ شعر کے تخلیقی عمل پر قدرت رکھتا ہو، یہ
کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کرر ہا ہواس سے
بھی اس کی واقفیت کمال درجے کی ہونا چاہیئے ۔۔۔مجھے یہ کہنے
میں ذرا باک نہیں کہ سید احمد ایثآر کی سعی اس بارے میں مشکور
ہوئی ہے۔''[۱۱]

لہٰذا کتاب کی تکمیل،تصحیح اوراشاعت ہر مرحلے میں خالد عرفان نے ایثآر کا تعاون کیا۔اورآخر کار یہ کتاب ۱۹۹۷ءکوکرناٹک اردو کیڈمی ، بنگلور کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آئی ۔شیدائیانِ اقبال اورادبی حلقوں نے اس کی خوب پذیرائی کی ۔اس کتاب پرکئی ادیبوں نے تبصرے لکھے جس میں ایثآر کی اس کوشش کو خوب سراہا گیا۔چنانچہ ترجمۂ پیامِ مشرق کی اشاعت کے بعد باقی تراجم کی اشاعت کی راہ بھی ہموار ہوگئی اور ۲۴ مئی ۲۰۰۹ءتک یکے بعد دیگرے فارسی کلامِ اقبال کے تمام اردو منظوم تراجم زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پرآگئے ۔اقبالیاتی ادب میں ایثآر کے ان تراجم کی اہمیت مسلم ہے۔حالانکہ کسی بھی عبقری شخصیت کے فکروفن اور کلام کوصحیح تناظر میں سمجھنا اور پھر موثر انداز میں دوسروں تک پہنچانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور جب بات علامہ اقبآل جیسی شخصیت کے کلام کوسمجھنے اور سمجھانے کی ہوتو بڑے بڑے علماء وفضلاء بھی اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر قدوس جاوید کے یہ الفاظ یقیناً صد فی صد درست ہیں:

''اقبال ایک ایسے غیر معمولی شخص اور شاعر کا نام ہے کہ عرفان و
ادراک ،مطالعہ ومشاہدہ،تخلیقی زرخیزی اور شاعرانہ فنکاری کے
اعتبار سے اقبال کی سطح تک پہنچ کر اقبالیات کی روح کو پہچان پانا

ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔اقبال کی نادرالوجود فکری وتخلیقی
لہروں کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب، ہمارے نقاد کسی ایک لہر کسی
ایک رنگ کو اپنی بساط بھر گرفت میں لیکر اقبال پر کچھ نہ کچھ لکھ تو
لیتے ہیں لیکن (انہیں) فوراً ہی اپنی تہی دستی کا احساس بھی ہوتا
ہے۔''[۱۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لئے کئی علوم کی ضرورت ہے
مشرق ومغرب کے عام علوم کے ساتھ اسلامی علوم بھی سیکھے
جائیں تو بات بنتی ہے۔محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا نہیں
کرسکتی۔''[۱۳]

کلامِ اقبالؔ کو سمجھنے کے لئے شاعر کا دل، فلسفی کا ذہن ہونا بھی ضروری ہے۔اگر اس میں اسلامی فکر کا بھی اضافہ کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور یہ تمام خصوصیات ایثارؔ میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ایثارؔ شاعر بھی ہیں، مشرقی ومغربی روایات کے رمز شناس بھی اور اسلامی فکر وفلسفہ سے آشنا بھی ہیں۔ایثارؔ ایک اہم اقبال شناس اور ماہر مترجم ہیں۔ایثارؔ کے یہ تراجم افکارِ اقبال کی تفہیم میں معاون ہیں۔انہوں نے اقبالؔ کے خیالات واحساسات اور پیغام کو بڑی ہنرمندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے تراجم میں پیش کیا ہے۔اقبالؔ کی فکر اور پیغام کے پیش نظر انہوں نے کوشش کی ہے اصل متن کے قریب رہتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔اس ضمن میں انہوں نے یہ تراجم اصل بحور ہی میں کیا ہے تاکہ ان مخصوص بحور کے استعمال سے اقبالؔ نے اپنے کلام میں جو فضا تخلیق کی ہے وہ ان تراجم میں بھی ہو بہو محسوس ہو۔اور ان کا مخصوص آہنگ اسی طرح برقرار رہے۔اسی سلسلے میں چند مثالیں پیش ہیں:

اسرارِ خودی

اقبالؔ:

راہ شب چوں مہر عالم تاب زد
گریہ من بر رخ گل آب زد

ترجمہ:

آیا سورج خرمن شب لوٹتے
میں نے رو کر پھول پر چھینٹے دیے

اقبالؔ:

نغمۂ من از جہانِ دیگر است
ایں جرس را کاروانِ دیگر است

ترجمہ:

میرے نغموں کا جہاں ہی اور ہے
اس جرس کا کارواں ہی اور ہے

اقبالؔ:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشم ما کشاد

ترجمہ:

کتنے شاعر پائے مر کر زندگی
موندی آنکھ اپنی ہماری کھول دی

اقبالؔ:

خامۂ اونقشِ صد امروز بست

تا بیارد صبحِ فردائے بدست

ترجمہ:

نقش کھینچے اس نے صد امروز کے

صبحِ فردا تا کہ حاصل کر سکے

رموزِ بے خودی

اقبالؔ:

در جہانِ کیف وکم گردید عقل

پے بہ منزل برداز توحید عقل

ترجمہ:

عقل سرگرداں جو تھی شام و پگاہ

پا گئی توحید سے منزل کی راہ

اقبالؔ:

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما

رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

ترجمہ:

لا الٰہ سرمایۂ اسرار ہے

اس سے ہی شیرازۂ افکار ہے

اقبالؔ:

مرگ راساماں زقطعِ آرزوست
زندگانی محکم از ''لاتقنطوا'' است

ترجمہ:

موت کا سامان ہے قطعِ آرزو
زندگی کو محکمی ''لاتقنطوا''

پیامِ مشرق

اقبالؔ:

قبائے زندگانی چاک تا کے؟
چوں موراں آشیاں درخاک تاکے؟
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاش دانہ درخاشاک تا کے؟

ترجمہ:

ترے ہستی کا دامن چاک کب تک؟
یوں ہی چیونٹی سا زیرِ خاک کب تک؟
سبق پرواز کا شاہین سے لے
تلاشِ دانہ درخاشاک کب تک؟

اقبالؔ:

اگر آگاہی از کیف وکم خویش
یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش

دلا دریوزۂ مہتاب تا کے
شبِ خودرا برافروز دمِ خویش

ترجمہ:

اگر واقف ہے اپنے بیش وکم سے
تو کر تعمیرِ یم شبنم کے یم سے
اے دل یوں چاند کامحتاج کب تک
کر اپنی شب کو روشن اپنے دم سے

اقبالؔ:

زمقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے، نہ فرازِ من فرازے

ترجمہ:

میں ہوں دل کے ہاتھ قیدی مرا حال کچھ نہ پوچھو
نہ گرا ئے مجھ کو پستی نہ اٹھا سکے بلندی

اقبالؔ:

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم
از بادۂ شوقِ تو ہشیارم و مستم من

ترجمہ:

ہشیار بھی بیخود بھی تیری مئے الفت سے
باتوں میں ہوں فرزانہ، کردار میں دیوانہ

ارمغانِ حجاز

اقبالؔ:

روم راہے کہ اورا منزلے نیست
ازاں تخمے کہ ریزم حاصلے نیست
من از غمہا نمی ترسم ولیکن
مدہ آں غم کہ شایانِ دلے نیست

ترجمہ:

وہ راہی ہوں نہیں ہے جس کی منزل
جو بویا ہے نہیں کچھ اس کا حاصل
مجھے غم سے نہیں ڈر کوئی لیکن
نہ دے وہ غم نہیں جو دل کے قابل

اقبالؔ:

تب وتابِ دلِ از سوزِ غم تست
نوائے من ز تاثیرِ دم تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

ترجمہ:

جلا بخشے مرے دل کو ترا غم
کرے نغمہ سرا مجھ کو ترا دم
ہوں نالاں کشورِ ہندوستاں میں
نہیں پاتا کسی کو تیرا محرم

اقبالؔ:

یکے انداز کن سود و زیاں را
چو جنت جاودانی کن جہاں را
نمی بینی کہ ما خاکی نہاداں
چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

ترجمہ:

سمجھ تو خود ذرا سود و زیاں کو
بنا جنت سا لا فانی جہاں کو
نظر آتا نہیں ہم خاکیوں نے
سجا رکھا ہے کیسا خاکداں کو

جاوید نامہ

اقبالؔ:

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دم او کعبہ را گل شد چراغ

ترجمہ:

ہے محمد سے یہ سینہ داغ داغ
گل ہے اس کے دم سے کعبہ کا چراغ

اقبالؔ:

پاش پاش از ضربتش لات و منات

انتقام از دے بگیرے کائنات

ترجمہ:

چور چور اس نے کیئے لات ومنات

بدلہ اس کا تو ہی لے اے کائنات

اقبالؔ:

صحبت گل دانہ را ساز درخت

آدمی از صحبت گل تیرہ بخت

ترجمہ:

صحبت گل سے بنے دانہ شجر

خاک کی صحبت سے انساں خوار تر

اقبالؔ:

آرزوئے ہم نفس می سوزدش

نالہ ہائے دلنواز آموزدش

ترجمہ:

شوق ہم دم کا جلاتا ہے اسے

دل نواز آہیں سکھاتا ہے اسے

اقبالؔ:

در نگاہ او یکے بالا و پست

با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

ترجمہ:

اس کے ہاں ہے ایک ہی سب کا مقام

ایک دسترخواں پہ آقا اور غلام

زبورِعجم

اقبالؔ:

درطلب کوش ومدہ دامنِ امید زدست
دولتی ہست کہ یابی سرراہے گاہے

ترجمہ:

کوشش اپنی سی کیئے جا کبھی نومید نہ ہو
وہ بھی دولت ہے جو حاصل ہے سرراہ کبھی

اقبالؔ:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمزآشنائے روم وتبریزاست

ترجمہ:

مری ہستی غنیمت ہند میں مجھ سا نہیں کوئی
برہمن زادہ آگاہِ رموزِ رومی وتبریز

اقبالؔ:

نشیمن ہردوررادرآب وگل لیکن چہ رازاست ایں
خرد راصحبتِ گل خوشتر آید، دل کم آمیزاست

ترجمہ:

مکاں دونوں کا ہے خاک ہی، سمجھ میں کچھ نہیں آتا
خرد مسرور کیوں، دل کس لئے ہے اس سے کم آمیز

اقبالؔ:

کنشت و کعبہ و بت خانہ و کلیسا را
ہزار فتنہ از آن چشم نیم باز آور

ترجمہ:

کنشت و کعبہ و بت خانہ میں کلیسا میں
نگاہِ مست سے فتنے قدم قدم پہ جگا

اقبالؔ:

تکیہ بر عقل فلاطون جہاں بیں نکنم
در کنارم دلکے شوخ و نظر بازے است

ترجمہ:

اعتبار عقل فلاطوں کی پہنچ کا نہ کروں
دل چالاک کو معلوم ہے اس کی پرواز

پس چہ باید کرد

اقبالؔ:

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب!

ترجمہ:

اے نہاں خود سے سمجھ اپنا مقام
ہے حجاب اندر مسلمانی حرام

اقبالؔ:

فطرتِ او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

ترجمہ:

فطرت اس کی بے جہات اندر جہات
گرد اس کے طوف میں کل کائنات

اقبالؔ:

مرغک اندر شاخسارِ بوستاں
بر مرادِ خویش بند د آشیاں

ترجمہ:

شاخ پر جب ایک مرغِ بوستاں
اپنی خواہش کا بنائے آشیاں

اقبالؔ:

گفتم اے بینندۂ اسرارِ جاں
بر تو روشن ایں جہاں وآں جہاں

ترجمہ:

بولا میں اے واقفِ اسرارِ جاں
تجھ پہ روشن یہ جہاں اور وہ جہاں

اقبالؔ:

یک زماں خود را بدریا در فگن
تا روانِ رفتہ باز آید بہ تن

ترجمہ:

اک گھڑی دریا میں خود کو ڈال دے
جسم میں تا جانِ رفتہ آ سکے

اقبالؔ:

در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات
مردہ زایند از بطونِ امہات

ترجمہ:

بے ثبات ان کے دلوں کی آرزو
مائیں دیتی ہیں جنم بے جان کو

ایثارؔ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان فارسی تصانیف کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان تراجم کے دوران انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں مضامین کی فکری و فلسفیانہ پیچیدگی تو کہیں تلمیحات و اشارات کی بوقلمونی اور سب سے اہم اقبالؔ کے کلام کی رفعت ہے۔ لیکن یہ ایثارؔ کی خوش نصیبی اور اقبالؔ سے عقیدت و محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ اس مہم سے سرخرو نکلے۔ ترجمے کے فنی محاسن اور شعری لطافتوں نے اقبالؔ کے مضامین کی پیش کش میں حسن و تاثیر کا جو اضافہ کیا ہے اس سے مترجم کی تخلیقی صلاحیت نکھر کر سامنے آئی ہے۔ اردو اور فارسی زبان کی آمیزش نے ان تراجم کو زبان و بیان کے اعتبار سے اصل تخلیقات سے قریب تر کر دیا ہے۔ لہٰذا فارسی زبان و ادب سے نا آشنائی کے اس دور میں اقبالؔ کے پیغام کی عصری اہمیت اور زماں و مکاں سے ماورا اسلامی اقدار کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے نقطۂ نظر سے یہ منظوم تراجم اقبالؔ کے پیغام کو اردو

میں خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔

مشاہیرِ اردو کے تاثرات:

ایثارؔ مشاہیرِ ادب کی نظروں میں ایک ادبی دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو کے اکثر نقادوں اور انشاپردازوں نے ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔اور اپنی نگارشات میں ان کی دل کھول کر تعریف کی اور ان کے کارناموں کو سراہا ہے۔ان ادیبوں میں شمس الرحمٰن فاروقی،مسعود حسین خان،بی شیخ علی،ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط،علیم صبا نویدی،جیسی شخصیات شامل ہیں۔ذیل میں پیش کردہ تاثرات کے بعض اقتباسات درج کیے جارہے ہیں۔

پروفیسر بی شیخ علی:

پروفیسر بی شیخ علی نے ایثارؔ کے تراجم کے متعلق اپنے خیالات کو یوں ضبطِ تحریر لایا ہے۔

> ایثارؔ صاحب منظوم اردو ترجمے کے رستم زماں ثابت ہوئے ہیں۔انہوں نے صرف علامہ اقبال کے کلام کا ہی منظوم ترجمہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ رباعیاتِ عمر خیام،رباعیاتِ شمس تبریز،رباعیاتِ سعدی و مثنوی مولانا روم کے منظوم اردو ترجمہ کا کام بھی مکمل کر دیا ہے۔ جو منتظرِ اشاعت ہیں۔مولانا روم کی مثنوی ہی ہزار ہا اشعار پر چھ دفتر میں محفوظ ہے۔اگر کوئی شخص علامہ اقبال کے صرف جاوید نامہ کا ایک ترجمہ کر دے تو میں اس کو علامہ دہر سمجھوں گا۔اب جبکہ علامہ اقبال کا سارا فارسی کلام ہی نہیں بلکہ عمر خیام،شمس تبریزی،سعدی و رومی کے کلام کو بھی جو ہستی منظوم اردو ترجمے کی شکل میں پیش کر دے اس کو میں علامہ

دہرِ (TO THE POWER OF n) کہوں گا۔جو کام ایک
اکیڈمی کے کئی ادیب یا شعراء نہیں کر سکتے ،ایک فردِ واحد نے کر
دکھایا۔'' [۱۴]

مسعود حسین خان:

مایہ ناز ادیب پروفیسر مسعود حسین خان رقمطراز ہیں:

''میرے دل پر آپ کے کامیاب مترجم ہونے کا گہرا نقش
ہے۔اور کہاں بیٹھ کر آپ نے یہ کارنامے انجام دئے ہیں۔دور
دکن میں ایہ آپ کی ادبی اور اس کے نام سے عقیدت کا وافر
ثبوت ہے۔'' [۱۵]

شمس الرحمٰن فاروقی:

معروف ادیب شمس الرحمٰن فاروقی ایثّار کی محنت شاقہ اور ریاضتِ کاملہ کو سراہتے ہوئے ایک خط میں
رقمطراز ہیں:

''ترجمے پر آپ کا دیباچہ اقبالیات کے میدان میں ایک مستقل
کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ترجمہ بھی تقریباً ہر جگہ رواں دواں اور صحیح
ہے ۔بعض بعض مصرعوں میں زبان ذرا خلاف محاورہ ہوگئی ہے
لیکن اتنے بڑے ترجمے میں اور ایسی کتاب کے ترجمے میں اتنی تو
آزادی تو ملنی ہی چاہئے ۔اصل بات یہ ہے کہ فارسی کی روانی اور
شاعری کی بصیرت اور اس کی شاعرانہ قوتوں کا مناسب اندازہ

ترجمے کے ذریعے حاصل ہو سکے۔میرا خیال ہے آپ اس کٹھن
وادی سے اکثر بخوبی گزر سکے ہیں۔''۱۶

ڈاکٹرسید یحییٰ نشیط:

ڈاکٹرسید یحییٰ نشیط نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

''سید احمد ایثار موظف کنزرویٹر آف فاریسٹ ،صحرا نشینی کے
عادی ہیں لیکن چمنستانِ ادب کے خنک جھونکوں سے لطف
اندوزی کا نہایت پاکیزہ ،مطہر ومعطر سلیقہ رکھتے ہیں۔یہی وجہ
ہے کہ فارسی کلام کے ان کے تراجم ایک خاص مقام رکھتے
ہیں۔برصغیر میں اقبال کے تمام فارسی کلام کو علاوہ سید احمد ایثار
کے شاید ہی کسی نے اردو میں پیش کیا ہے۔''۱۷

ڈاکٹر رؤف خیر:

ڈاکٹر رؤف ایثاؔر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:
''سید التر جم کا ایثارِ سخن تو دیکھئے کہ طبع زاد تخلیقات سے اپنے
آپ کو منوانے کے بجائے مستند تخلیق کاروں کے فارسی
شاہکاروں کو مادری زبان اردو کے ذریعے کروانے کا جتن کرتے
رہے اور وہ بھی منظوم۔ظاہر ہے شعر کے ترجمے کا مزہ تو شعر ہی
میں آتا ہے۔اچھے سے اچھے شعر کا اگر نثری ترجمہ ہو تو اس کی
روح مجروح ہو جاتی ہے۔محترم سید احمد ایثار صاحب نے جس

عرق ریزی سے نایاب فارسی شاہکاروں کو منظوم اردو کا جامئہ
دلکش پہنایا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ داد ہے۔''۱۸؎

پروفیسر عبدالمنان طرزی نے بعنوان ''سید احمد ایثار کی کاوشِ حسنہ'' ایک بے حد خوبصورت نظم لکھ کر منفرد انداز میں ایثآر کے کارنامے کو سراہا ہے۔ اس نظم سے چند اشعار پیش ہیں:

اک خیال ایسا دلِ ایثار میں پیدا ہوا
لانے جوئے شیر وہ فرہادِ دانش چل پڑا
پورا کرنے کے لئے اپنی یہ خواہش چل پڑا
اس کی خواہش کا بجالاتا ہے طرزی احترام
کاوشِ حسنہ کو اس کی کرتا ہے طرزی سلام
مملکت میں فن کی ثابت کی ہے اپنی سروری
ترجمہ منظوم کی دکھلائی ایسی خسروی
عقل ہے حیران اس کی علمی دولت دیکھ کر
عقل ہے حیران کچھ خامے کی طاقت دیکھ کر
عقل کچھ حیران ہے فنی لطافت دیکھ کر
ترجمے کی سادگی، لطفِ سلاست دیکھ کر
طبعی جودت دیکھ کر، ذہنی فراست دیکھ کر
گوہر اشعار اور دامن کی وسعت دیکھ کر
جیسی کرتے آج بھی محنت مشقت دیکھ کر
بخشی کیا اظہار پر قدرت نے قدرت دیکھ کر
گلستانِ ترجمہ کی دیکھ کر ان کی بہار
عظمتِ ایثار پر، فنکاریٔ طرزیؔ نثار

مختصر یہ کہ یہ تراجم ایثآر کا کارنامہ عظیم ہے جو ان کی تخلیقی و شاعرانہ صلاحیتوں کا عمدہ ثبوت فراہم کرتے ہیں نیز اردو دان طبقے کی ادبی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ جس کام کے لئے ایک انجمن یا ادارہ کی ضرورت تھی اسے ایثآر نے انفرادی طور پر انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔

تصانیف:

ایثآر کی تصانیف کی اصناف وار فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

شعری سرمایہ:

شاعری کے حوالے سے ایثآر کے دو شعری مجموعے ''ترانہ وترنگ'' اور ''آب فشار'' زیورِطباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ذیل میں ان کا تعارف پیش ہے۔

ترانہ وترنگ:

ترانہ وترنگ ایثآر کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اور ان کی ادبی شہرت کا نقطۂ آغاز بھی۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۹ء کو منظرِ عام پر آیا۔ یہ رباعیات اور قطعات کا ایسا مہکتا ہوا گلشن ہے جو اپنی الگ ہی بہار دکھا رہا ہے۔ ایثآر نے متعدد موضوعات پر بعنوان ''اسرارِحیات'' رباعیات کہی ہیں۔ انھوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں، موت و زیست کی صداقتوں نیز اپنے گردوپیش کے ماحول اور زندگی کے نشیب و فراز کو رباعیات میں سمو دیا ہے۔ انھوں نے جہاں تصوف و معرفت کو اہمیت دی ہے وہیں اخلاقی مضامین کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان رباعیات کے ذریعے انھوں نے اصلاحی خیالات کا اظہار کیا ہے نیز عصری، سماجی و معاشی حالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ ان کی رباعیات خاص خیال وفکر کی آئینہ دار ہیں جس کے ذریعے انھوں نے قوم کو تحریک و عمل کی ترغیب دی ہے۔ ہیں۔ اور بعنوان ''نوائے زندگی'' ایسے قطعات ہیں جو ان کے منفرد نقطۂ نظر کے مظہر ہیں۔ ان قطعات میں انھوں نے راست بازی، شعروادب، قولِ پیغمبر، زمانہ کی نیرنگی، طلوعِ صبح، نورِ سحر، ہلالِ عید، شکوہ

شکایت، وغیرہ موضوعات پر اپنے خیالات نظم کئے ہیں۔

آب فشار:

آب فشار دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۲۰۱۲ء کو منظرِ عام پر آیا۔ موضوعات، مضامین اور اصنافِ شاعری کے اعتبار سے ''آبفشار'' میں دھنک رنگ منظر نامہ قلب وذہن کو مسحور کر دیتا ہے۔ اس میں حمدِ باری تعالیٰ، نعوت، منقبت، سلام، غزلیں، نظمیں، قطعات ورباعیات، تہنیت ومتفرقات وغیرہ شامل ہیں۔ اسلوب میں یہ تخلیقی تنوع ایثآر کی زبان وبیان پر خلاقانہ دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے اسلوب کا اہم وصف یہ ہے کہ تخلیقِ فن کے لمحوں میں جب ان کے جذبوں کی صداقت فکر وخیال کی صورت میں قلب ونظر کو اپنی گرفت میں لیتی ہے تب اظہار وابلاغ کے لئے خوب صورت الفاظ خود بخود صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں۔ آبفشار کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شاعر کے تجربات، مشاہدات واحساسات کی ایسی مرقع نگاری ہے جو زبانِ حال سے تمام حقائق کی گرہ کشائی کی استعداد رکھتی ہے۔ اس میں معاشرتی زندگی کے ارتعاشات، نشیب وفراز اور تند وتلخ حقائق کا اظہار ہے۔

تراجم:

ایثآر نے سب سے پہلے ۱۹۷۷ء میں عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ نہایت ہی شگفتہ انداز میں کیا اور انھیں بادۂ خیام کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے بعد حافظ شیرازی، سعدی اور مولانا جلال الدین رومی کے کلام کا ترجمہ کیا۔ اسی دوران اقبآل کے فارسی کلام نے ان کے قلب وذہن کو اس درجہ مسحور کیا کہ انھوں نے بقیہ زندگی اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے میں صرف کردی اور ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک اقبال کے تمام فارسی کلام کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان کے تراجم کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔رباعیاتِ عمر خیام	۱۹۷۷ء
۲۔رباعیاتِ مولانا روم	۱۹۷۸ء
۳۔رباعیاتِ سعدی شیرازی	۱۹۷۸ء
۴۔جاوید نامہ	۱۹۷۹ء
۵۔اسرارِ خودی	۱۹۷۹ء
۶۔ارمغانِ حجاز	۱۹۷۹ء
۷۔زبورِ عجم	۱۹۸۰ء
۸۔پس چہ باید کرد	۱۹۸۰ء
۹۔پیامِ مشرق	۱۹۸۲ء
۱۰۔رموزِ بے خودی	۱۹۸۲ء
۱۱۔مثنوی مولانا روم	۲۰۱۷ء

ان تراجم کے علاوہ ایثاؔر نے مولانا شاہ ابوالحسن ادیب کے دو قصائد (نشید مسرت بجشنِ دسہرہ، اور قصیدۂ مدحیہ بہ تقریب دسہرہ نوائے حسرت) کا بھی نہایت شگفتہ ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں مولانا شاہ ابوالحسن ادیب کا تعارف پیش ہے۔

مولانا شاہ ابوالحسن ادیب:

ادیب یا فنکار اپنے ملک و عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملک و عہد کے تاریخی، تہذیبی و سیاسی اور ثقافتی صورت حال کو اپنی تحریروں میں پیش کر کے ادبی دنیا میں لافانی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی ہی ایک باکمال شخصیت مولانا شاہ ابوالحسن ادیبؔ کی ہے۔ ان کی ولادت ۱۴ستمبر ۱۸۸۶ء کو ضلع کولار کے قصبہ سلگٹہ میں ہوئی۔ انکے والد مولانا حافظ بدرالحسن آثمؔ محکمۂ پولس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ حافظ قرآن تھے، عالم اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ''رسولِ مقبول'' اور ''ستارۂ

صبح''اہم ہیں۔مولانا شاہ ابوالحسن ادیب کی شخصیت منفرد وممتاز تھی۔وہ ایک ہمہ جہت،آفاقی وعبقری شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے علم وادب کے لئے جوخدمات انجام دی ہیں وہ زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔انہوں نے اپنے قلم سے اردوزبان وادب کومختلف حیثیتوں سے فیضیاب کیا۔وہ بیک وقت ایک صاحبِ طرز ادیب،انشا پرداز،مفسرقرآن،عالم دین،ماہر تعلیم،مورخ،نقاد،ممتاز شاعر اور باکمال مترجم اور بے نظیر معلم تھے۔انہوں نے اردو کی ترویج وترقی میں کئی معرکتہ الآرا کتابیں تصنیف کیں۔ان تصانیف میں جواہر بلاغت،جواہر اردو،سلم القواعد،سراج القواعد،قواعد اردو اہم ہیں۔بحیثیت مورخ ان کی تصانیف میں،تاریخ ہند جدید،تاریخ میسور،غازی اعظم،تزکرۂ قلندر برحق،شہید اکبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ادیبؔ اسلوب بیان کی لطافتوں،نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔اس لئے جب بھی وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے موضوع کا حق ادا کردیتے تھے۔ادیبؔ نے ادب،مذہب،تنقید،تاریخ اور ترجمہ جیسے مختلف شعبوں میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ایثارؔ نے ان کے دوقصائد(نشید مسرت بجشنِ دسہرہ،اور قصیدۂ مدحیہ بہ تقریب دسہرہ نوائے حسرت) کو بھی منظوم ترجمہ میں ڈھالا ہے۔ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں:

ادیبؔ:

امروز بصد رنگ نشاط است دلم را
رانم سوئے میدانِ طرب خنگِ قلم را

ترجمہ:

امروز کئی رنگ خوشی ہے مرے دل کو
دوڑاؤں بمیدانِ طرب اسپ قلم کو

ادیبؔ:

ہنگر کر طرب ہست دریں گلشن میسور
پیشش بنود آب کنوں باغِ ارم را

ترجمہ:

اس گلشن میسور میں کس درجہ خوشی ہے
رونق جو نہ تھی پہلے ہے اب باغِ ارم کو

ادیبؔ:

پرسید مرا کیستی چہ کارۂ گفتم
من قافیہ سنجم کہ دہم حسن نغم را

ترجمہ:

پوچھا کہ ترا کام ہے کیا، میں نے بتایا
ہے قافیہ سنجی ، میں سجاتا ہوں نغم کو

ادیبؔ:

بکشائے چشم و گلشنِ میسور درنگر
ہر برگ برگ سوسن و ہر گل گلِ تر است

ترجمہ:

ذرا آنکھیں تو کھولو گلشن میسور بھی دیکھو
ہے پتہ پتہ سوسن اور ہر اک گل گلِ تر ہے

مذکورہ بالا ترجمے میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ترجمے میں اصل متن سے گریز یا معنوی طور پر انحراف کیا گیا ہے۔ شعر کی اصل روح اور مفہوم جوں کا توں برقرار ہے کہیں بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ ادیبؔ کے کلام کے کسی لفظ یا حصے کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ کہیں کہیں حسنِ ترجمہ سے شعر کا لطف قاری کے لئے فزوں تر ہو گیا ہے۔

نثری سرمایہ:

ایثآر کی ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور ذہنی وسعت کے نقوش ان کی نثر میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا نثری سرمایہ قلیل ہے۔ جس میں سراغِ زندگی (خودنوشت سوانح)، منظوم تراجم پر مقدمے اور چند مضامین شامل ہیں۔ لیکن یہ سرمایہ اپنی نوعیت، کیفیت، اہمیت، پیشکش اور طرزِ بیان کے اعتبار سے نہایت قابلِ توجہ ہے۔ ان کی نثر شگفتہ اور رواں ہے۔

سراغِ زندگی (خودنوشت):

کسی شخص کی اپنی زندگی سے متعلق ایسی تحریر جو اس کی حیات کے کم و بیش تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے خود نوشت سوانح حیات کہلاتی ہے۔ اس میں مصنف خود اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی طرح کی پابندی نہیں ہوتی۔ نیز صفحات کی بھی کوئی قید نہیں چنانچہ یہ طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی۔ خودنوشت کا مرکزی کردار خود مصنف ہوتا ہے۔ اس میں مصنف کی ذاتی زندگی کے علاوہ اس کے احباب، رشتہ دار، اہلِ خاندان حتیٰ کے مخالفین کا بھی ذکر موجود ہوتا ہے۔ خودنوشت کی ایک اہم شرط مصنف کی ایمانداری ہے۔ یعنی وہ سچائی و خلوص کے ساتھ بلا مبالغہ اپنے حالاتِ زندگی بیان کرے۔ گویا یہ ایک ایسا شفاف آئینہ ہو جس میں مصنف کا عکس صاف نظر آئے۔ ایک اچھی خودنوشت کے لئے ضروری ہے کہ مصنف اپنے آپ کو اسی قدر نمایاں کرے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ کسی بھی خودنوشت کے مطالعے کے بعد اس بات کا صحیح تعین ہونا ضروری ہے کہ مصنف نے حوادثِ زمانہ سے گزر کر کیا کھویا اور کیا پایا۔ اور یہ عمل کس طرح وقوع پذیر ہوا۔

ایثآر کی خودنوشت سوانح حیات بعنوان ''سراغِ زندگی'' ۲۰۱۴ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ یہ خودنوشت ایثآر کی یادوں، خیالات، تجربات، اور تجزیات پر مشتمل نادر تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر حال تک کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات، جذبات و احساسات کو انہوں نے جس انداز میں بیان کیا ہے وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ اس میں موجود واقعات دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ ایک

سچے تخلیق کار کی حیثیت سے انھوں نے کسی مصلحت کی پرواہ نہ کی اور اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو من و عن بیان کیا ہے۔ اس میں انہوں نے جہاں اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے وہیں ناکامیوں اور کمزوریوں پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ اس سلسلے میں سید یحییٰ نشیط رقمطراز ہیں:

''سید احمد ایثارؔ کی سراغِ زندگی نہ یادوں کی برات ہے نہ خواب بلکہ
تمام تر حقیقت پر مبنی زندگی کی کھلی کتاب ہے۔'' ۱۹

اس ضمن میں خلیل احمد سوداگر لکھتے ہیں:

''سراغِ زندگی محض ایک سوانح حیات نہیں، یہ سوانح نگار کی شخصیت
کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے ثقافتی
معاشرتی، سماجی اور سیاسی حالات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ یہ ایک
ایسی خود نوشت ہے جو قاری کو وادئ پر خار میں چلتے رہنے کا حوصلہ
بخشتی ہے۔'' ۲۰

ایثارؔ نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز جس صداقت و صراحت سے بیان کئے ہیں وہ اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کا حقیقی روپ پیش کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ اپنے رہن سہن، ماحول خاندانی پس منظر، تعلیم، ملازمت کے متعلق پوری سچائی سے قلم اٹھایا۔ نیز مختلف عنوانات کے تحت اپنی پوری زندگی کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ عنوانات کافی دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ مثلاً ''فرمان اس کا اس کی مشیت ہے زندگی'' میں اپنی پیدائش، والدین اور خاندانی پس منظر کا ذکر کیا ہے۔ ''ہر توانائی کا سرچشمہ ہے علم'' اس باب میں اپنی ابتدائی تعلیم کے مراحل و مشکلات کو بیان کیا ہے وہیں اپنے اساتذہ کرام کی بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ سراغِ زندگی کا ایک بڑا حصہ ایثارؔ کی محکمۂ جنگلات کی زندگی پر مشتمل ہے۔ یہ کئی باب پر مشتمل ہے جیسے ''جڑ گیا فطرت سے رشتہ دشت کی جانب چلے'' ''شکار کرنے چلے ہاتھیوں کا جنگل میں'' ''کاکن کوٹے کی دوسری کھڈا مہم، امتحان اور نتیجہ'' ''مشکلیں آتی ہیں ہمت آزمانے کے لئے'' وغیرہ عنوانات کے تحت ملازمت سے جڑی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی دلچسپ باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے ملازمت کے دوران پیش آنے والے واقعات کو پوری تفصیل

کے ساتھ رقم کیا ہے۔ جا بجا ایسے واقعات کا ذکر ہے جس سے ان کی ایمانداری، بہادری، غیرت، جرات جیسی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان مشکلات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے جن کا انہوں نے صبر کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش ہے جب ان کی شیموگہ میں پوسٹنگ ہوئی تھی لکھتے ہیں:

''مہینہ کے بعد مہینہ گزر رہا تھا لیکن میری ترقی کے احکامات جاری نہیں ہو رہے تھے۔ نہ تنخواہ، نہ سفری بھتہ، سرکاری حکم کے بغیر سب بند تھے۔ گزران کے لئے گھر سے ہر مہینہ ۲۵۰ روپے منگوا لیتا تھا۔ سارا خرچ، گھر کا کرایہ، کھانے پینے کا سامان بچوں کے اسکول کے مصارف اور دوائیوں کے علاوہ ٹور کے اخراجات سب کا اسی رقم پر انحصار تھا۔ دن بڑی تنگی میں کٹ رہے تھے۔ صبر و توکل کے ساتھ بڑی سیدھی سادی زندگی تھی۔'' ۲۱

''امریکہ میں قیام اور حصولِ تعلیم'' اس باب میں انہوں نے امریکہ میں دو سالہ قیام کا ذکر پوری تفصیل سے کیا ہے۔ اس میں انہوں نے جہاں تعلیم کے دوران پیش آنے والے واقعات کا ذکر کیا ہے وہیں ایک سیاح کی طرح امریکہ کی تہذیب، ثقافت، مقامات کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ ''احوال کچھ خدمتِ قرطاس و قلم'' کے عنوان سے اپنے ادبی سفر پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ خودنوشت کا نہایت اہم حصہ ہے۔ کسی بھی فنکار کے فن کو سمجھنے میں تخلیقی عمل کے حوالے سے اس کا اپنا بیان یقیناً اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایثارؔ فرماتے ہیں:

''محکمۂ جنگلات کے ایک ملازم کی حیثیت سے میری پہچان ایک محدود طبقے تک ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں یا میری جو شناخت بنی ہے وہ میرے ادبی ذوق کی بدولت ہے۔ حالانکہ میں نے شاعری یا تراجم جو کچھ بھی کیا ہے کسی نام و نمود اور شہرت کے لئے نہیں صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کیا ہے۔'' ۲۲

سراغِ زندگی میں کئی افراد کا ذکر ملتا ہے ان افراد کے قلمی چہرے ہیں۔ان کے اندازفکر وعمل کے نقوش ہیں۔بعض مرقعے ادھورے تو بعض مرقعوں میں پوری شخصیت کی مکمل تصویر موجود ہے۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے ہر شخص کو اسی انداز میں پیش کیا۔جس انداز میں اسے دیکھا یا پرکھا ہے۔انہوں نے جہاں فرد کی مجموعی شخصیت پر رائے دی ہے وہیں اس کی سیرت و کردار کے ان اہم پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے جس نے انہیں منفی یا مثبت طور پر متاثر کیا ہے۔

سراغِ زندگی کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایثؔار نے نہ صرف زندگی کی تلخیوں کو جھیلا ہے بلکہ اس کے اسرار کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔مجموعی طور پر سراغِ زندگی قابلِ قدر خودنوشت ہے جسے بار بار پڑھا جا سکتا ہے۔اس میں حسن صداقت اور کمال جسارت کے جلوے نظر آتے ہیں۔اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے طویل سفر کو ایک ادیب کس وقار سے طے کرتا ہے اور کسی حال میں شرافت و دیانت داری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔جب یہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئی تو اسے علمی و ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور اس میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ذیل میں چند مشاہیر کے تاثرات پیش ہیں۔

ڈاکٹر مسعود سراج کے مطابق:

> ''سراغِ زندگی اپنی سچائی اور سادگی کے سبب پڑھنے والوں پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔انہوں نے فطری انداز میں اپنی زندگی کے واقعات کو سپردِ قلم کئے ہیں۔اس میں نہ کسی تصنع کو دخل ہے نہ کسی رنگ آمیزی کا''[۲۳]

م ن سعید اپنے تاثرات یوں رقم کرتے ہیں:

> ''سراغِ زندگی میں اگر جنگل ہی جنگل ہوتا تو اس کی وقعت محکمہ جنگلات کے کسی تشہیری کتابچے سے زیادہ نہ ہوتی۔سچ تو یہ ہے کہ اس کے سارے سروکار انسانی ہیں۔یہ حق گوئی، راست بازی، اصول

پسندی،اورعزم وارادات کی ایسی پر اہتزاز حکایت ہے جو ڈگمگائے اقدارِ حیات کو استحکام وقوت بخشنے کا باعث بن گئی ہے۔حیات کی سخت آزمائشوں میں ایثار صاحب جیسے بے سروسامان کے استقلال وایمان کی مثال مماثل ہمراہیوں کے لئے ایماں ساماں ہے۔یہ سوانح ایک طویل جدوجہد کی وہ دل افروز داستاں ہے جس کا دورانِ ملازمت اکثروں کو ذاتی تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی اور یہ ناموافق حالات میں مثبت ترمیم وتبدیلی کا چراغ جلائے رکھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔"۲۴

بقول ڈاکٹر رگھوتم راؤ دیسائی:

"یہ کتاب مجھے دوسری خودنوشتوں سے مختلف لگی۔سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی اس کتاب میں سچائی ہی نظر آئی۔ویسے کوئی بات تصنع کے ساتھ اس طرح پیش کی جائے کہ وہ سچ لگے تو بھی ایک فنکاری ہی ہے۔لیکن اس کتاب کی کرافٹنگ یہی ہے کہ اس میں تصنع نہیں ہے بلکہ ان کی کہنہ مشقی اور پختہ کاری کی بلا مبالغہ ترجمانی ہے۔"۲۵

ڈاکٹر رؤف خیر رقمطراز ہیں کہ:

"اس خودنوشت میں ایثؔار صاحب کی زندگی کی کامیابی کا سراغ ملتا ہے۔۔۔۔اس خودنوشت سوانح میں جنگل کا سناٹا تو ہے ہی صندل کی مہک بھی ہے۔"۲۶

سراغِ زندگی ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے۔جس میں ایثؔار نے اپنے تجربات ومشاہدات کو اس طرح بیان

کیا ہے کہ ایک فرد ہی کی نہیں بلکہ ایک عہد کے نشیب وفراز آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک کامیاب خودنوشت ہے جس میں ایثآر نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی داستانِ حیات اس طرح بیان کی ہے کہ نہ تو ان کی ذات، واقعات، ماحول، مقامات کے بیان میں کھو جاتی ہے اور نہ ہی اس قدر نمایاں ہو جاتی ہے کہ محسوس ہو کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد خراجِ تحسین وصول کرنا ہے۔

مضامینِ ایثآر:

ایثآر کے مضامین بھی مختلف رسائل اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ جنہیں یکجا کر کے ان کے رفیق محمد اقبال نے اپنی مرتب کردہ تصنیف '' وارداتِ ایثار'' میں ''نقشِ قدم'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ انہوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں کچھ تنقیدی و تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں اور چند ادبی شخصیات کے خاکے ہیں۔ ان کے نثری مضامین میں فنی اعتبار سے وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ادبی و معیاری نثر کے لئے ضروری ہیں۔ انداز میں لطافت و سنجیدگی نمایاں ہے۔ اور اپنے خیالات کی ترسیل میں وہ حتی الامکان کامیاب نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر رگھوتم راؤ دیسائی:

> '' ایثار کی تحریری فن کی جڑیں سماج اور زمین میں پیوست ہیں۔ وہ ماو رائی گفتگو نہیں کرتے، نہ خوابوں کی حسین وادیوں میں گھومتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ اپنی زمین ہی پر رہنے والے ایک حساس شاعر و نثر نگار ہیں۔'' [۲۷]

ان کے نثر پاروں کی چند مثالیں پیش ہیں جن میں سادگی و بیان کی لطافت موجود ہے۔ '' قرآن کے ادبی محاسن'' میں ایثآر نے اس موضوع پر سنجیدگی و خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں:

> '' قرآن کریم خطبات کا ایک گرانقدر گنجینہ ہے۔ انداز باہمی گفتگو کا سا کبھی مخاطب غائب اور غائب مخاطب ہو جاتا ہے کبھی متکلم ہی

غائب ہوجاتا ہے۔کلام کا رنگ خطیبانہ مختصر خطبے جن میں ثواب کی بشارتیں اور عذاب کی تحذیرات ہیں۔تاریخی شواہد آثار کائنات سے استدلال پایا جاتا ہے ۔مزید برآں بحث و مباحث کا طریقہ بھی نرالا۔اخلاق کی تعلیم علم الاخلاق کے رنگ میں نہیں۔قانون کے بیانات مقننوں کی طرز پر نہیں۔اس کتاب میں ابواب کی جگہ سورتوں نے لے لی، پیراگراف کی جگہ رکوع اور جملے آیات یا نشانیاں کہلائیں۔''۲۸

''تحقیق و تجسس ترقی کے ضامن'' یہ دراصل ایک خطبہ ہے جسے ایثآر نے الامین کالج بنگلور کے طلبہ کے سامنے پیش کیا۔یہ خطبہ نہایت معلوماتی ہے۔اس میں انہوں نے جہاں تحقیق و تجسس کے اصول وضوابط کو زیرِ بحث لایا ہے وہیں علم کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔چونکہ علم و تعلیم کو ازل ہی سے انسان کا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا ہے اور اللہ نے جب آدمؑ کو پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا تب علم کو ہی ان کی امتیازی خصوصیت بتائی اسی طرح جب نبی ﷺ پر وحی کا نزول ہوا تب بھی 'اقراٗ' یعنی پڑھنے کے حکم ہی سے آغاز کیا گیا۔چنانچہ علم کی اہمیت ازل سے ابد تک مسلم ہے۔ اس ضمن میں ایثآر فرماتے ہیں:

''تسخیرِ اشیاء ذات وصفاتِ اشیاء کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔علم گویا ایک وسیع اور عمیق سمندر کی صورت ہمارے سامنے ہے۔اس میں غوطہ زنی کے لئے بڑی مہارت چاہئے۔ہمارے دن رات کے معمولی مشاہدات اور چھوٹے چھوٹے تجربات نے بھی ہمیں بڑے بڑے انعامات سے باور کیا ہے۔''۲۹

اور کہتے ہیں

''علم صرف کتابوں اور مدرسوں میں محصور نہیں ہے۔ساری کائنات ایک کھلی یونیورسٹی ہے۔مدرسے اور کتابیں تحصیل علم کے لئے بنیاد

فراہم کرتے ہیں۔خشتِ اول رکھنا ان کا کام ہے۔اور عمارت کی تعمیر
ہمارے ذمہ۔اس لئے انسان میں تحقیق وتجسس اور تخلیق وتعمیر کی لگن
ہونا چاہئے۔علم سے آدمی کی شخصیت بنتی ہے۔اخلاق سے آراستہ ہو
کر سماج کی بہترین خدمت انجام دے سکتا ہے۔''۳۰

ایثارؔ کو چونکہ اقبال سے بے پناہ عقیدت ہے چنانچہ انہوں نے ان کے مجموعہ فارسی کلام کے جہاں منظوم تراجم کئے وہیں ان کے فکروفن کی خصوصیات پر مبنی چند مضامین بھی قلمبند کئے۔جن میں ''اقبال کا مثالی ذوقِ قرآنی'' ''علامہ اقبال کی نعت گوئی'' ''علامہ اقبال کا تصوراتی حج'' ''شکوہ اور جوابِ شکوہ کی تفہیم'' اور'' کلامِ اقبال کے تراجم ایک اجمالی جائزہ'' قابلِ ذکر ہیں۔یہ مضامین فکری اور فنی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ان میں انہوں نے اقبالؔ کے کلام کے فنی محاسن پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔''اقبال کا مثالی ذوقِ قرآنی'' میں متفرق مثالوں کے ذریعے اقبالؔ کی قرآن کے تئیں بے پناہ عقیدت ومحبت کو پیش کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان کی پوری حیات قرآن اور اس کی تعلیمات ہی سے عبارت ہے۔انہوں زندگی کے جملہ اسرار ورموز کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھا اور سمجھایا ہے۔ایثارؔ رقمطراز ہیں:

''قرآن علامہ کی زبان پر رواں دواں تھا۔اشعار میں بلا تکلف آیات
کا استعمال کئے جاتے ہیں۔ہر چیز کی تلاش قرآن میں کرتے
ہیں۔خطبات میں ایٹم (جوہر) کی تحقیق کا ذکر کافی دلچسپ
ہے۔کہتے ہیں کہ یہ مفکرین کی تحقیق ہے۔انہوں نے بتایا کہ دنیا نا
قابلِ تقسیم اجزاء (ایٹوں) کا مجموعہ ہے۔چونکہ خدا کی تخلیقی قوت غیر
محدود ہے اس لئے لا تعداد جواہر کو وجود بخشتی جارہی ہے۔اسی طرح
دنیا کی توسیع ہوتی جارہی ہے۔علامہ نے اس باب میں قرآن پاک
میں اشارے تلاش کئے۔سورۃ الحجر کی آیت نمبر 21 کو ممکنات سے
پایا۔''۳۱

''علامہ اقبال کی نعت گوئی'' اس مضمون میں انہوں نے اقبال کی نعت گوئی کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون عشقِ رسول کی لذت سے آشنا کرواتا ہے۔ اس مضمون میں جہاں اقبال کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ملتی ہے وہیں ایثار کی دقتِ نظری کا ثبوت بھی موجود ہے۔ اقبالؔ اگر چہ نعت گو شاعر نہ تھے لیکن جا بجا ان کے کلام میں فکری و فنی اعتبار سے اعلیٰ و معیاری نعت گوئی کے نمونے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے موضوع کی وسعت کے لحاظ سے یہ مضمون مختصر ہے تاہم یہ ایک پرخلوص کوشش ہے۔ اس مضمون میں فکر اور اسلوب کے وہ تمام اجزاء ہیں جن کی روشنی میں اقبال کی نعت گوئی کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ نیز اس میں فنِ نعت گوئی کی روایت اور اس کی مختصر تاریخ کے ساتھ اس فن کی صنفی و فنی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایثارؔ کہتے ہیں کہ اقبال کا پورا کلام عشقِ نبی کی کیفیت سے سرشار ہے۔

> ''علامہ اقبال کا طرزِ نعت گوئی سب سے جدا، منفرد، اور ان کی خاص ایجاد ہے ۔اثر انگیزی کے لحاظ سے ضربِ کلیمی کے مترادف ہے۔ مولانا بدیع الزماں نے خوب کہا ہے: اقبال نے ایک حمد نہیں لکھی لیکن 'بال جبریل' کی پہلی سولہ غزلوں پر سینکڑوں حمد قربان ہیں۔ اقبال نے ایک نعت نہیں لکھی مگر اپنے پورے کلام کو نعتیہ بنا دیا۔''۳۲

علامہ اقبالؔ کی ایک مدت سے فریضۂ حج ادا کرنے کی خواہش تھی۔ ان کی یہ آرزو تھی کہ وہ سرزمینِ حجاز کی زیارت کریں۔ لیکن خرابیٔ صحت کے باعث ان کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی۔ مگر انہوں نے مدینہ کا یہ سفر ارمغانِ حجاز کی صورت میں ذہنی طور پر کیا۔ اس میں انہوں اپنی چشمِ تخیل سے بارگاہِ نبوی میں حاضری دی۔ ارمغانِ حجاز اقبال کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ جس کی بیشتر رباعیوں میں علامہ کی یہ تڑپ نظر آتی ہے چنانچہ ایثارؔ نے اسے تصوراتی حج سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''علامہ عاشقِ رسول تھے۔ عمر بھر حج و زیارت کی تمنا رہی۔ حضور کا نام سنتے ہی تڑپ جاتے اور رقتِ قلب سے رو پڑتے۔ اور اپنی تڑپ کو

اشعار میں ڈھالتے جاتے۔ ہمیشہ تپیدم،آفریدم،آرمیدم کا معاملہ
رہا۔سنائی کے مزار پر پہنچے تو مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق زور
زور سے رونے لگے اور جب سلطان شہید کے مقبرے سے مراقبے
کے بعد باہر آئے تو آنسو ڈھل رہے تھے۔اور آپ نڈھال
تھے۔نہیں معلوم اگر سچ مچ زندگی میں بارگاہِ رسالت میں حاضری کی
سعادت نصیب ہوجاتی تو کیا قیامت برپا کرتے۔شاید شادی مرگ
ہوجاتے،واپس نہ لوٹتے۔چونکہ حج قصدِ زیارت ہے اور علامہ کی
استغراقی کیفیت اور خلوصِ نیت اور ارمغانِ حجاز کی رباعیات کو دیکھتے
ہوئے اسے تصوراتی حج کہنا درست لگتا ہے۔''۳۳

''علامہ اقبال کا تصوراتی حج''اس مضمون کے ذریعے ایثآر نے اقبال کی اس تڑپ کو ان کے کلام سے مختلف مثالوں کو یکجا کر کے پیش کیا ہے۔زیرِ نظر مضمون میں ایثآر نے مختصر مگر جامع انداز میں ارمغانِ حجاز کے پیغام کو سمیٹا ہے۔شکوہ اور جوابِ شکوہ کی تفہیم' بھی نہایت عمدہ مضمون ہے اس مضمون نے انھوں نے نہایت جامع اور موثر انداز میں تفہیم پیش کی ہے۔مضمون کی زبان سادہ و سلیس ہے جس میں اقبآل کے پیام کی مدلل انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔لکھتے ہیں:

''شکوہ'' لکھ کر اقبال نے عام مسلمانوں کی الجھنوں کی عکاسی کرنے
اور عوام کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔لیکن نظم شائع ہوئی تو
علماء نے اس پر سخت گرفت کی۔اسے عقائد اور شعائرِ اسلام کی توہین
اور قابل مذمت قرار دیا۔''شکوہ'' کو اقبال کی گستاخی اور گناہ پر محمول
کیا۔ایک صاحب نے تو اس کے خلاف پوری ایک نظم کہہ ڈالی جس
کا ایک شعر ہے۔

شکر کرنا تھا خدا کا کہ گلہ کرنا تھا

حیف یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا کرنا تھا

اس پر علامہ اقبال بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔انہوں نے مولویوں اور ملاؤں کے اعتراض کو دور کرنے کے لئے 1913 میں ''جوابِ شکوہ'' لکھی۔''۳۴

''کلامِ اقبال کے تراجم ایک اجمالی جائزہ''معلوماتی نوعیت کا مضمون ہے جیسے کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے اس میں کلامِ اقبال کی تقریباً تمام زبانوں میں کئے گئے تراجم کی فہرست پیش کی گئی ہے ساتھ ہی ترجمہ کے فن اور روایت پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایثآر نے چنداد بی شخصیات کے خاکے بھی تحریر کئے ہیں۔جو بعنوان ''اسد اعجاز۔شخصیت کے چند پہلو،''ایک رنگ برنگی شخصیت۔خالد عرفان،''وہاب عندلیب:پیکرِ صداقت واخلاص ہیں۔ان مضامین میں انہوں نے ان شخصیات کی مصروفیات،ادبی خدمات،تخلیقی صلاحیت،علم وادب کے تئیں ان کی پرخلوص محبت نیز ان شخصیات کے کردار واوصاف کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے رقم کیا ہے۔ایثآر نے جن شخصیات کو موضوع بنایا ان شخصیات کے مختلف گوشوں کو دلکش اور سادہ وشگفتہ زبان میں روانی اور برجستگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔عموماً ان شخصیات کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی پر خصوصی توجہ دی ہے۔سید حسین پر لکھا گیا خاکہ بعنوان ''محافظ تراجم سید حسین''بہت دلچسپ ہے ایثآر لکھتے ہیں:

''یہاں ایک ایسی ہستی کا ذکر آرہا ہے جس کے پاس آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر لینے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔اس کے پاس انگریزی کی شدبد کے سوا کیا تھا؟ چند قرآنی سورتوں اور آیتوں کو اس نے ازبر کرلیا تھا۔بس یہی اس کا کل اثاثہ تھا۔مگر اپنی اشتہا کو بجھانے کی کوشش میں اس نے اپنے تجربوں،مشاہدوں اور باقاعدہ غور وفکر سے کام لیتے ہوئے علم کے سمندر میں غوطے کھانا سیکھ لیا تھا۔اس طرح اپنے بل بوتے پر جو قابلیت خود میں اس نے پیدا کر لی

تھی وہ اس کا مایہ ناز گنجینہ ذاتی تھا۔اس شخص کا نام ہے سید حسین
عرف محبوب خان۔ان کا کارنامۂ حیات حصول علم کے متوالوں کیلئے
ایک روشن مثال ہے۔باقاعدہ تعلیم مختصر خوشنویسی کا ذوق ان کی
فطرت میں ودیعت تھا،جس کے ذریعے انہوں نے غور وفکر سے علمی
ہیرے موتی سمیٹ کر خود کو مالا مال کر لیا تھا۔''۳۵

ان خاکوں میں ایثارؔ نے مذکورہ شخصیات کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ان کی مکمل تصویر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہاب عندلیب پر لکھا گیا خاکہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بے حد دلچسپ ہے۔اس کے مطالعے سے جہاں وہاب عندلیب کی شخصیت کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں وہیں ان کے ادبی کارناموں پر بھی نظر پڑتی ہے۔مثلاً ایثارؔ وہاب عندلیب کے متعلق رقمراز ہیں:

''وہاب عندلیب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہونے کے علاوہ بلند پایہ
تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔انہیں نہ صرف سلیقہ سے کام کرنا
آتا ہے بلکہ دوسرے با صلاحیت افراد سے کام لینا بھی آتا
ہے۔قابلِ رشک قائدانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔اور ایسی ہی قوتِ
اظہار بھی۔۔۔۔۔پہلی ملاقات بنگلور میں اس وقت ہوئی جب وہ
کرناٹک اردو اکیڈمی کے چیر مین کی کرسی پر براجمان پائے
گئے۔علیک سلیک کے بعد ان کی سادگی اور خلوص سے میرا دل
مرعوب ہوگیا۔گورا رنگ، خشخشی داڑھی،چھریرا بدن اور چھوٹا سا
قد۔اس چھوٹے سے قد میں بلند و بالا شخصیت سمائی ہوئی،جو سرتا
بقدم علم وادب اور آداب کی مظہر تامہ تھی۔خود سے بھی کم مرتبہ کو بھی
آپ نے عزت واکرام کے سلوک سے بلندیوں پر پہنچایا۔''۳۶

اسد اعجاز کے متعلق لکھتے ہیں:

''اسد اعجاز نے تقریباً 50 سال گیسوئے سخن سنوارے ہیں۔ اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ مشاہیر اہل سخن نے ان کے کلام کو سراہا ہے۔ ایک شاعر، ایک استاد سخن اور ادبی انجمنوں کے ایک کارکن کی حیثیت سے ان کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اس بارے میں سب کی ایک رائے نہیں ہوتی۔ ہم سب کے مزاج مختلف ہیں۔ اور ہر کسی کو اپنی اپنی رائے کے اظہار کی آزادی بھی ہے۔ میری نظر میں اسد اعجاز ایک پر امید، حوصلہ مند، نڈر اور حق گو شخصیت کے حامل ہیں۔'' ۳۷

اگرچہ ان خاکوں کی تعداد کم ہے لیکن ان کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایثاؔر میں خاکہ نگار کے اوصاف بھی موجود ہیں۔ یہ خاکے ان کی اردو زبان وادب سے محبت کا ثبوت ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے مضامین پر مغز اور جامع ہیں اور اسلوبِ بیان نہایت دلچسپ اور شگفتہ ہے۔

منظوم تراجم پر تحریر شدہ مقدمے:

ادبیاتِ اردو میں متعدد شخصیات ایسی ہیں جن کے متعلق محققین و ناقدین نے کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ لیکن اقباؔل ایسی شخصیت ہیں جن کے علم و فن اور شخصیت کے گونا گوں جہات اور پہلوؤں کی وجہ سے مقالات و کتب کا ایک وافر ذخیرہ اردو ادب کے خزانے میں جمع ہو گیا ہے اس اعتبار سے اقبال شناسی کے میدان میں جہاں کئی شخصیات ماہرِ اقبالیات تسلیم کیے گئے جن میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر عابد علی عابد، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور جگن ناتھ آزاد جیسی قد آور شخصیات شامل ہیں۔ وہیں ایثاؔر اپنے تراجم اور ان پر لکھے گئے مقدموں کی بدولت ماہرِ اقبالیات کی صف میں ایک عمدہ اقبال شناس بن کر ابھرے۔ اقبال

شناسی کے لئے اقبالؔ کے تمام ظاہری و باطنی حالات وکوائف، مزاج ومحرکات، کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ ومحاسبہ ضروری ہے ساتھ ہی اقبال کی حیات وشخصیت عہد ونظریات ،تصورات و اجتہادات ،اسلوب اور تحقیقی رویے تخلیقات و ماخذات سے پوری طرح واقفیت از حد ضروری ہے۔ ایثارؔ نے ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر مقدمے تحریر کئے ہیں۔ چنانچہ نثری سرمایہ میں ایثارؔ کے اپنے منظوم تراجم پر تحریر کردہ یہ مقدمے بے انتہا اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مقدموں میں انہوں نے ایک محقق کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے قرآنی تلمیحات، احادیثِ نبوی، تاریخی معلومات اور متعدد شخصیات کے متعلق سوانحی معلومات فراہم کی ہیں۔ اردو ادب کے خزانے میں یہ بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اقبالؔ کی شخصیت اوران کے فکروفن کو واضح کرنے کی یہ ایک ایسی خدمت ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بقول پروفیسر بی شیخ علی:

''ایثارؔ صاحب کی عظمت کا ایک اور پہلو بھی نمایاں کرنا از حد ضروری ہے جو نظم سے نہیں نثر سے تعلق رکھتا ہے اور انہیں محقق کا درجہ عطا کرتا ہے۔ وہ ہے ہر تصنیف کا مقدمہ۔ وہ اتنا جامع ،وسیع و بسیط ہے کہ ایک ایک مقدمہ ایک ایک D.Lit ڈگری کا حامل ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں انہیں ان اعزازات سے نواز دیتا۔'' ۳۸

یہ حقیقت ہے کہ جب تک اقبالؔ کے کلام کا شایانِ شان سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک نہ تو اس کی تہہ داریوں سے واقفیت ممکن ہے اور نہ ہی اس کی معنیاتی جہات اور وسعتیں کھل کر سامنے آسکتی ہے ۔لیکن ایثارؔ نے پوری یکسوئی سے نہ صرف اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا بلکہ اپنے مقدموں میں کلامِ اقبال پر مفصل روشنی بھی ڈالی اور اقبالؔ کے تصورات اور نظریات کے اساسی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر اسرارِ خودی کے مقدمے سے اقتباس پیش ہے۔

''خودی درحقیقت انسان کے اپنے ''ہونے'' کا احساس ہے۔ سلیس لفظوں میں 'میں' یا 'انا' یا شخصیت اور نفس کے معنی میں ہیں۔ علامہ

اقبال نے اس کے لئے اور معنی بھی استعمال کئے ہیں جیسے زندگی ،عزتِ نفس وغیرہ۔از روئے لغت خودی کے معنی تکبر کے بھی ہیں۔خودی علامہ اقبال کی اپنی اصطلاح ہے۔اورانہوں نے صاف بتلادیا ہے کہ انہوں نے ہرگز اسے تکبر کے معنی میں استعمال نہیں کیا۔خودی پر ہی سارا نظامِ کائنات منحصر ہے۔ذرہ ذرہ خودی سے آراستہ ہے۔خودی جس شئے میں نہ ہواس کا وجود ہی نہیں۔صوفیہ اور شعراء نے بےخودی کے نغمے الاپے ہیں۔''۳۹

اسرارِخودی عالمی ادب کے شاہکاروں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے اس میں علامہ اقبالؔ نے مکمل ضابطۂ حیات پیش کیا ہے۔جس کا محور ومرکز خودی ہے۔اس مثنوی میں خودی کی حقیقت و ماہیئت اور قوت وصلاحیت کا بیان ہے تاہم عشق فلسفہ اور تصوف جیسے اہم موضوعات پر بھی اقبالؔ کے حکیمانہ افکار کا نچوڑ اس میں موجود ہے۔اسرارِخودی کا جب تک گہرائی سے مطالعہ نہ کیا جائے تب تک اس تصور کے حقیقی خدوخال سے واقفیت ممکن نہیں۔ایثارؔ نے اپنے مخصوص اندازِفکر سے اس مثنوی پر ایک وقیع مقدمہ قلمبند کیا ہے۔انہوں نے اس مثنوی میں شامل مشمولات پر تحقیقی و فلسفیانہ نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اس کی وضاحت کی ہے۔مثال کے طور پر افلاطون کی حالاتِ زندگی مختصر انداز میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''افلاطون 438 قبل مسیح میں ایتھنس میں پیدا ہوا۔افلاطون کے معنی ہیں چوڑے چکلے سینے والا۔یہ لقب اس کے فن کشتی کے استاد ڈیانیسس نے دیا تھا۔اس کا اصلی نام اسٹاکلس استینوس تھا۔افلاطون فی الحقیقت وسیع الصدر تھا۔شاعری اور موسیقی میں بھی ماہر تھا۔ارغنوں باجا اسی کی ایجاد ہے۔اس نے شعر بھی کہے لیکن جب اس کے استاد سقراط نے کہا کہ شاعری انسان کو انسانی کمالات سے محروم کردیتی ہے تو اس نے شاعری ترک کردی اور تصانیف جلا

ڈالیں۔کچھ رباعیات جو بچ گئیں باقی رہ گئیں۔افلاطون بیس برس
کی عمر کا تھا جب سقراط کی شاگردی اختیار کی۔اس کی صحبت میں دس یا
پانچ برس گزارے تھے کہ سقراط کو الحاد کے الزام میں زہر کا پیالہ دیا
گیا۔افلاطون دلبرداشتہ ہوکر علم وفن کی تحصیل کی غرض سے سیاحت پر
نکل گیا۔اس کا اولین ٹھکانہ مصر ہوا۔وہاں اس نے فیثا غورس کے
شاگردوں سے علم ہندسہ سیکھا۔اس کی معرفت اشکال اور مقادیرِ
اشیاء سے واقفیت حاصل کی۔یہاں تیرہ برس قیام کے بعد ایران چلا
گیا۔وہاں آتش پرستوں کے مذہب کی تحقیقات کیں۔پھر ایران
سے ہندوستان پہنچنے والا تھا تا کہ برہمنوں کے مذہب کی اصلیت اور
ماہیت معلوم کرے۔لیکن وہاں ان دنوں فسادات کے ہنگامہ
تھے۔ان تیرہ برسوں میں الٰہیات میں جو کچھ ترقی حاصل کی اس پر
بس کیا اور اٹلی کو روانہ ہو گیا۔کچھ دن بعد وہاں سے سسلی (سقلیہ) کا
رخ کیا۔وہاں قہرِ الٰہی کے روپ میں آتش فشاں پہاڑ کی تباہ کاریاں
دیکھیں۔وہاں کے بادشاہ سے ملاقات بھی کی۔لیکن کچھ وجوہات
کے باعث ناراض ہوکر ایتھنس پہنچا اور درس و تدریس میں لگ
گیا۔کچھ عرصہ بعد سسلی کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔اس کے بیٹے
نے تخت نشیں ہو کر افلاطون کو واپس بلالیا۔لیکن جب بادشاہ کی
ظالمانہ حرکتیں دیکھیں تو اس کو تنبیہ کی۔جب اس پر کچھ اثر نہ ہوا تو
وہاں سے خوموش چل نکلا۔پھر ایک اور مرتبہ سسلی آیا تھا اور واپسی پر
باقی عمر وطن میں ہی گزاردی۔''[۴۰]

اسی طرح جاوید نامہ کے مقدمہ میں نادر شاہ کی شخصیت کی خوبیوں کو یوں اجاگر کیا ہے:

''نادر شاہ کی شخصیت میں کچھ ایسی خوبیاں بھی ہیں کہ جن کا اعتراف
نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی جیسے۔۔۔بہادری اور جوانمردیاس کا ایک
ذاتی جوہر ہے جس کی بنا پر وہ کاشتکاری کی سطح سے اٹھ کر تختِ ایران
پر جلوہ فروز ہوا۔خودی ،خودداری اور خود اعتمادی اس کے اندر کوٹ
کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔جب اس کے بیٹے کی شادی مغلیہ شاہزادی
سے ہونے والی تھی تب حسبِ روایت اس کی سات پشتوں کے نام
طلب کیے گئے۔اس نے کہلا بھیجا:'' بگو داماد ِشما پسرِ نادر شاہ است،و
نادر شاہ پسرِ شمشیر تا ہم چنیں ہفتاد بار بشمار''(بولو کہ تمہارا داماد نادر شاہ
کا فرزند ہے اور نادر شاہ شمشیر کا فرزند اسی طرح ستر پشت شمار کرلیں)
۔اس سے اس کا اندھی روایات سے گریز،حق گوئی و بے باکی جھلکتی
ہے۔تمام عمر اس نے معرکہ آرائی میں گزاری اور کامیاب رہا اس سے
اس کی حرکی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔''[۱۴]

ایثؔار نے اصل ماخذات و مصادر تک رسائی پانے کی پوری کوشش کی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع ،تبصرے معنی خیز ،تجزیے معلومات افزا اور اسلوب دلکش ہے ۔علاوہ ازیں انہوں نے ان مقدموں میں اقبال کی فلسفیانہ سوچ،سیاسی بصیرت اور شاعرانہ کلام کی معجزاتی سحر کاریوں کو اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت سے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ان مقدموں کے مطالعہ سے ایثؔار کے وسیع مطالعہ،عمیق ناقدانہ تجزیہ اور اقبال کی سوچ وفکر سے رغبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً ارمغانِ حجاز کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں کہ:

''علامہ اقبال سچے عاشقِ رسول تھے۔مدتوں زیارتِ بارگاہِ نبویؐ کی
آرزو میں تڑپا کیے۔اپنی اس مختصر آمدنی میں اس سفر کی نیت سے کچھ
کچھ پس انداز کرتے رہے ۔جب 1929ء میں نادر شاہ افغانی
افغانستان کو بچہ سقؔا کے قبضے سے نجات دلانے فرانس سے لوٹ

رہے تھے تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر علامہ نے ان سے ملاقات کی
۔یہ سمجھ کر کہ ان کی مہم ملت کے حق میں زیادہ اہم ہے اپنی پس انداز
کردہ رقم ان کی نذر کردی۔'' ۴۲

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کا یہ کام تشریح و توضیح کے ضمن میں بھی آتا ہے۔ یہ سارا کام ایک صبر آزما اور دقت طلب ہے جسے ایثآر نے بڑی عرق ریزی سے انجام دیا ہے۔انہوں نے اپنی تمام تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ مقدمے تحریر کئے ہیں۔ان مقدموں میں تحقیقی شان ہے۔یہ کام ان کے وسیع مطالعے اور علم کا بین ثبوت ہے۔۔یقیناً اردو ادب میں یہ قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

انعامات و اعزازات:

ایثآر کی شاعرانہ عظمت، ناقدانہ بصیرت، محققانہ مہارت، ادب کی مختلف اصناف اور اقبالیاتی سرمایے میں ان کی تخلیقی صلاحیت اور کارناموں کے اعتراف میں انہیں مختلف اداروں نے اعزازات و انعامات سے نوازا۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ مجلسِ ادب گولڈن جوبلی ایوارڈ	برائے اقبالیات	۱۹۹۹ء
۲۔ کرناٹک اردو اکیڈمی ایوارڈ	برائے مجموعی خدمات	۲۰۰۶ء
۳۔ کرناٹک اردو اکیڈمی ایوارڈ	پس چہ باید کرد اردو منظوم ترجمہ	۲۰۰۷ء
۴۔ ادارۂ لسانیاتِ ہند (ٹرسٹ) بنگلور	برائے ادبی خدمات	۲۰۰۸ء
۵۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند، کرناٹک و گوا حفیظ میرٹھی ایوارڈ	برائے مجموعی ادبی خدمات (شاعری)	۲۰۱۱ء

٦۔ چکمگلوراوروچناساہتیہ پریشتھ — برائے ادبی خدمات — ۲۰۱۱ء

٧۔ انجمن فنکارانِ اردوایوارڈ — برائے ادبی خدمات — ۲۰۱۲ء

٨۔ یوپی اردواکیڈمی ایوارڈ — آبفشار (شعری مجموعہ) — ۲۰۱۴ء

٩۔ راجیوتسوایوارڈ — برائے ادبی خدمات — ۲۰۱۷ء

١٠۔ کرناٹک اردواکیڈمی ایوارڈ — سراغِ زندگی — ۲۰۱۸ء

حوالے

۱۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص 247،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۲۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص 88،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۳۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص253،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۴۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص259،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۵۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص248،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۶۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص85،ایثار پبلشنگ ھاؤزٹرسٹ

۷۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص308،ایثار پبلشنگ ہاوزٹرسٹ، بنگلور

۸۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص410،ایثار پبلشنگ ھاؤزٹرسٹ، بنگلور

۹۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،محمد اقبال،ص107،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۱۰۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،ص100،ایثار پبلشنگ ہاوس ٹرسٹ

۱۱۔پیامِ مشرق،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص20،دی بنگلور اکیڈمی، بنگلور

۱۲۔پروفیسر محمد امین اندرابی،مرتب،اقبالیات کا تنقیدی جائزہ،ص ۲۷

۱۳۔ڈاکٹر سید عبداللہ،مسائل اقبال،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،ص۹،لاہور،۱۹۷۴ء

۱۴۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص۳۶۱،ایثار پبلشنگ ہاوزٹرسٹ

۱۵۔مکتوب بنام سید احمد ایثار،۱۲۱اکتوبر ۲۰۰۷ء

۱۶۔مکتوب بنام سید احمد ایثار،۹مارچ ۲۰۰۴ء

۱۷۔ارمغانِ حجاز،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص ۹۸

۱۸۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال،ص۲۳،ایثار پبلشنگ ہاوزٹرسٹ

۱۹۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص۱۲,ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ

۲۰۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص۳۰۲،ایثار پبلشنگ ہاؤزٹرسٹ

۲۱۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص ۱۵۱،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ

۲۲۔سراغِ زندگی،سید احمد ایثار،ص ۲۴۷،ایثار پبلشنگ ھاوز ٹرسٹ

۲۳۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۲۹۹،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۴۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۲۷۸،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۵۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۲۹۴،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۶۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۲۸۴،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۷۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۲۹۱،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۸۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۱۷۲،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۹۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۱۶۶،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۰۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص ۱۶۹،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۱۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 182،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۲۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 194،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۳۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 204،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۴۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 210،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۵۔وارداتِ ایثار اور جہاتِ اقبال،محمد اقبال ص 102،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۶۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 163،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۷۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 156 ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۸۔وارداتِ ایثار،محمد اقبال ص 361،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۳۹۔اسرار و رموز،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص 22،ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ،بنگلور

۴۰۔اسرار و رموز،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص 36،ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ،بنگلور

۴۱۔جاوید نامہ،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص 95،ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ،بنگلور

۴۲۔ارمغانِ حجاز،منظوم اردو ترجمہ،سید احمد ایثار،ص 20،ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ،بنگلور

باب سوم

......سید احمد ایثآر بحیثیت شاعر......

ایک فن‌کار کے فن کا جائزہ لینے سے قبل اس فن کے اہم لوازمات کو سمجھنا اور ایک صحیح معیار قائم کرنا بے حد ضروری ہے۔ لہٰذا کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے شاعری کا مفہوم ذہن نشین ہونا چاہیے۔ مختلف ماہرین نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق شاعری کا مفہوم بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب '' شاعری کیا ہے'' میں لکھتے ہیں:

'' شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی ہے۔ احساسات کی حسین مصوری ہے تخیل کا ایک رقص دل فریب ہے وہ جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی۔ اس کا اثر دل دماغ دونوں پر ہوتا ہے۔ وہ حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ وہ جذب و شوق کی ایک لغزش مستانہ ہے۔ عقل شعور کا ایک حسین ارتعاش ہے۔ حسن و جمال کی ایک دل موہ لینے والی لطیف تھرتھراہٹ ہے۔ ہمارے ایک شاعر نے اس کو عقل وجنون کی مشترک بزم جمال اور عشق وحکمت کا مقام اتصال کہا ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے، ایک حقیقت ہے۔''[1]

کلیم الدین احمد کے الفاظ میں:

'' شاعری اچھے اور بیش قیمتی تجربوں کا حسین، مکمل اور موزوں بیان ہے۔ خیال بھی تجربہ ہے اور جذبہ بھی تجربہ ہے۔ پھولوں کی

خوشبو، ٹائپ رائٹر کی آواز، اقلیدس کا مطالعہ، کسی پر عاشق ہونا
سبھی تجربے ہیں اور شاعری کا تجربوں کی دنیا پر قبضہ ہے۔'' ۲؎

محمد فضل الرحمٰن کے مطابق:

''شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں، ایک فن ایک صناعی
بھی ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے حسیات وتخیلات ولولوں
اور امنگوں، اپنے تجرباتِ زندگی کو ایک تعمیری عمل کی صورت میں
پیش کرتا ہے اسے زبان میں تناسب، موزونیت اور توازن کا اسی
قدر خیال رکھنا ہوتا ہے جتنا کہ ایک بت تراش مجسمہ بنانے
میں۔'' ۳؎

شاعری کو روح کی غذا بھی کہا جاتا ہے۔ شاعری ہی کی بدولت انسان اپنے جذبات کو الفاظ کی صورت میں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ شاعری کے بنیادی عناصر میں مواد، ہیئت، موضوع اور صورت شامل ہیں۔ اور ان کا متوازن امتزاج شاعری کہلاتا ہے۔ اور شاعر جب اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو الفاظ کی ترتیب اس کے ان جذبات کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے۔ اور اس کی شاعری میں وزن پیدا کرتی ہے۔ بغیر وزن شاعری، شاعری نہیں اور وہی شاعر ایک اچھا شاعر کہلاتا ہے جو شاعری میں وزن اور آہنگ کو متوازن رکھے الفاظ کے اور شاعری میں اپنے الفاظ کے ذریعے حسن پیدا کرے۔ بقول خواجہ حیدر علی آتش:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع سازی کا

اس شعر میں آتش نے الفاظ کی بندش کو نگوں کے جڑنے اور مرصع سازی سے نسبت دی ہے۔ کیونکہ شاعر اپنے تجربات کو زندگی کے رنگوں آہنگوں کو الفاظ کے ذریعے ہی قارئین تک پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت

بریلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''الفاظ کی حیثیت شاعری میں درحقیقت ایک نگار خانے کی سی
ہوجاتی ہے۔ دیکھنے والا ان الفاظ میں معنی کی دنیائیں دیکھ سکتا
ہے۔''[۴]

مجموعی طور پر شاعری جہاں بلند اور لطیف جذبات و احساسات کا نام ہے وہیں موزوں اور مترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے۔ شاعر جب اپنے تخیلی تعمیرات کو ظاہری موزونیت سے آراستہ کرتا ہے تو نتیجتاً اس کا فن شاہکار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اگر شعر میں کوئی نظریہ، نقطۂ نظر یا پیغام ہو تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ دلکش اندازِ بیان، خیالات کی بلند آگہی، جذبات کی لطافت، الفاظ کی برجستگی اندازِ بیان کی موزونیت اور لطیف آمیزش کے ذریعے شاعری کا معیار بلند ہوگا۔ شاعر کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کلیم الدین احمد رقمطراز ہیں:

''شاعر اپنے زمانہ میں ادراک کے سب سے اونچے مقام پر ہوتا
ہے ایسے اونچے مقام پر جہاں دوسرے نہیں سکتے۔ اس مقام
سے وہ گرد و پیش، بلندی و پستی کا جائزہ لیتا ہے جو چیزیں وہ دیکھتا
ہے ان سے وہ متاثر ہوتا ہے اور ان سے متاثر ہونے میں اس کی
شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے پھر وہ انہیں تاثرات کو اپنی آرٹ کی مدد
سے ایک ابدی صورت بخش دیتا ہے۔ اس کی طبیعت حساس ہوتی
ہے اس کی آنکھیں دوربین ہوتی ہیں وہ سطحی چیزوں کے علاوہ ان
چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔ لیکن اپنی
پوشیدہ جگہوں پر اپنا اثر ڈالتی ہیں اور انہیں خاص صورت میں
تبدیل کرتی ہیں یا کسی خاص رنگ میں رنگ دیتی ہیں۔''[۵]

ایثؔار نے اپنے ادبی سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔انہیں بچپن ہی سے شعر وشاعری کا شوق تھا۔مڈل اسکول کے زمانے سے ہی وہ نظمیں ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔۱۸ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی پہلی غزل کہی۔اور عرصہ تک نظمیں اور غزلیں کہتے رہے۔لیکن اشاعت سے بے نیاز رہے۔احباب کے اصرار پر ۱۹۵۷ء میں اپنی غزل امامی صاحب کے روزنامہ آفتابِ اردو میں شائع کروائی۔ان کے اب تک دو شعری مجموعہ ترانہ وترنگ اور آبفشار منظرِ عام پر آئے ہیں۔وہ کم وبیش ۷۰ سالوں سے مشقِ سخن میں مصروف ہیں۔اس عرصے انھوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کا اظہار مختلف اصنافِ سخن میں کیا ہے۔انھوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں غزلیں بھی، رباعیات بھی لکھی ہیں اور قطعات بھی۔روایت، کلاسیکیت اور جدیدیت سب پر ان کی نگاہیں ہیں اور حسبِ ضرورت مختلف نظریات وتصورات سے کسبِ فیض کیا ہے۔یہ نقوش کبھی ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں تو کبھی نظموں میں۔کبھی رباعیات وقطعات کے آئینہ خانے میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو کبھی حمد ونعت میں ان کے فکر وخیال کی خوشبو تطہیر قلب کا وسیلہ بن جاتی ہے۔غرض شعر وسخن میں ہر جگہ ان کے دل پذیر خیالات اور شعری تصورات کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔

ایثؔار کی شاعری میں جہاں داخلیت اور خارجیت ہے وہیں ذات وکائنات کے مختلف رنگ احساسات وتاثرات کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ موجود ہیں۔انھوں نے اپنے اردگرد پھیلی کائنات اور حقیقی زندگی کی تلخیوں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ان کے کلام میں فکر واحساس کی تازگی، تفکر آمیزی، حقیقت آفرینی کے ساتھ ساتھ احساساتی کیفیات نمایاں ہیں۔ان کی شاعری میں برجستگی بھی ہے بلند خیالی بھی، سادگی بھی ہے اظہار کی خوش سلیقگی بھی۔ان کی شاعری دلنشیں بھی ہے فکر انگیز بھی۔فلسفیانہ تفکر کی وجہ سے ان کی شاعری پر سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔وہ ایک خوش فکر اور قادرالکلام شاعر ہیں۔اچھے اشعار کہنے کے لئے جو زبان، مضمون کی ندرت وجدت، جذبات واحساسات کی تازگی، تخیلات کی سربلندی کی ضرورت ہے وہ ایثؔار کے کلام میں موجود ہے۔اس باب میں بحیثیت شاعر ان کی شعری تخلیقات کا اصناف وار جائزہ لیا گیا ہے۔

حمد گوئی

حمد میں خدائے لم یزل کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہےاوراس کی بے حساب نعمتوں اوراسکی بے پناہ کرم فرمائیوں اورمہربانیوں کا شکرادا کیا جاتا ہے۔اللہ کی شان میں اپنے جذبات، احساسات اورعقیدہ کا اظہارکرنا بندگی کا وصفِ جمیل ہے۔اور یہ عمل جب شعر کے قالب میں ڈھلتا ہےتو حمد یہ شاعری وجود میں آتی ہے۔نیز اللہ کا کلام کسی بھی کام کے آغاز کے لیے بڑا با برکت ہوتا ہے۔ یہ خوبی ایثآر کے کلام میں نمایاں ہے۔وہ اس ذاتِ واحد کوکبھی نہیں بھولتے چنانچہ انھوں نے اپنے کلام کی شروعات روایتی انداز یعنی حمد سے کی ہے۔ایثآر نے کائنات کی حقیقتوں اوراس کے دلکش مناظر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اور بڑی ہی فنکاری کے ساتھ انھوں نے تصوف کے نکات کوموضوعِ سخن بنایا ہے۔خالقِ کائنات اوراس کی نعمتوں کا ذکر ایثآر کے اشعار میں جا بجا مطالعہ میں آتا ہے۔انہوں نے مظاہر قدرت اور مناظرِ فطرت کے متعلق نہایت دلفریب اشعار کہے ہیں ساتھ ہی ساری کائنات میں پھیلے ہوئے حسنِ الٰہی کوموضوعِ سخن بنایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شئے میں اللہ عزوجل کا جلوہ نظر آتا ہے۔

یہ وسعتِ افلاک کہ حد ہے نہ کنارا
پایا ہی کہیں ہے نہ ستونوں کا سہارا
راتوں کودیا چاند،تو دن کے لیےسورج
پھردامنِ افلاک کوتاروں سےنکھارا
تو خالقِ کل جن وبشر،ارض وسموات
تخلیق کوکافی ترےاک کن کا اشارا
جاندارو جمادات سبھی ذکر میں تیرے
کہسار میں مشغولِ ثنا، پھاندتا دھارا
قوموں کی ہدایت کے لئے اپنے کرم سے

سینوں میں رسولوں کے صحیفوں کو اتارا

مظلوموں کو فرعون کی زد سے تھا بچانا

موسیٰ کو سرِ طور سے تو نے ہی پکارا

ہم ہاتھ اٹھائے ترے ہی در پہ کھڑے ہیں

ہو جائے غم و درد کا اپنے کوئی چارہ

ایثؔار اللہ کی حمد وثناء اور توصیف میں رطب اللسان ہیں اس سے ان کے دل کو شادابی اور تقویت کا احساس ملتا ہے، ذکرِ الٰہی میں حلاوت اور والہانگی کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کی زبانیں ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشغول ہوتی ہیں۔ ایثؔار کہتے ہیں کہ دنیا کی ساری رنگینیاں، سارے نظاروں میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔گلستان میں کھلے ہوئے پھول کی خوشبو اس کا حسن بھی عرفانِ خداوندی کے مظاہر ہیں۔ دنیا کی ہر شئے میں چاہے وہ گل ہو یا خار انداز بدل بدل کر عرفان ِ تجلی ہی رونما ہوتا ہے۔اور یہ تجلیات سورج، چاند، ستاروں کی روشنی میں بکھری پڑی ہیں۔حقیقت میں ان تمام چیزوں میں صرف اور صرف ذاتِ واحد کا نور ہی جلوہ نما ہے۔ایثؔار نے اللہ کی عظمت وشانِ کبریائی کا اعتراف کرتے ہوئے کئی اشعار رقم کئے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

تو پھول میں بو، نور تراشمس وقمر میں

شعلوں میں لپک تجھ سے، تپش برق وشرر میں

لہروں کی لہک تجھ سے، تلاطم کا غضب بھی

ہے تیرے سبب مشک میں بو، آب گہر میں

ہے حسن میں بھی تجھ سے ملاحت بصباحت

غنچوں میں زباں بندی ونزہت گلِ تر میں

ہر چیز تری صنعتِ کامل پہ ہے شاہد

نور آنکھ میں ہے، دل میں تڑپ، سوز جگر میں

موسیٰ نے سرِ طور جو دیکھا کبھی ایثار
فیض اس کا ہے ہر ذرہ میں ہر برگ وشجر میں

اور ایک حمد میں یوں رطب اللسان ہیں کہ ہر شئے میں صرف نورِ یزداں کا ہی عکس ہی چھایا ہوا ہے۔دریا ہو یا سمندر، بادل ہو یا اونچے پربت کائنات کے ذرے ذرے میں معبود حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے۔اور دنیا کی یہ رنگینی حسن الٰہی کے سبب ہی قائم ہے۔

بہتے دریا، بند سمندر، تیری قدرت ہے
تیرتے بادل، دوشِ ہوا پر تیری قدرت ہے
تا بہ ثریا، اونچے پربت دھرتی میں پاوں
برف کا صافہ، ندیاں دربر تیری قدرت ہے
ہنستی ہنساتی، پھول کی پریاں، جامے رنگ برنگ
پنکھڑیوں پر اوس کے جھومر، تیری قدرت ہے
اٹھتے ڈھلتے، ریت کے ٹیلے، ریگستانوں میں
نخلستاں کچھ، پیاسے کیکر، تیری قدرت ہے
ڈولتے ہاتھی، پھاندتی ہرنی، اور بل کھاتے سانپ
رینگتی چیونٹی، اڑتے مچھر، تیری قدرت ہے

کتنا عظیم احساس ہوتا ہے، کیسی روانی طبیعت میں در آتی ہے، جب ذکرِ خدا سے قلب منور ہوتا ہے۔ اس بات کا احساس کچھ مخصوص نفاس تک ہی محدود ہوتا ہے۔ذکر باریِ تعالی کی مسرت اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے، جو سنتِ رسول ﷺ عاشق ہو، عشق کی رموز و روایات سے مجرب ہو۔آقائے دو جہاں اور ربِ کائنات کی خوبیوں اور عنایتوں کا معترف ہو۔یہ تمام تر جواہر ریزے ایثارؔ کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

نعت گوئی

نعت وہ صنفِ سخن ہے جس میں نبی ﷺ سے عشق وعقیدت کا والہانہ اظہار ہوتا ہے۔عربی، فارسی اور اردو میں اکثر شعرا نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔تقریباً ہر دور میں نعتیہ شاعری دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کرنے اور حریمِ کبریا سے آشنا کرنے کا موثر ترین وسیلہ ہے۔عالمی ادبیات میں دنیا کی تمام زبانوں میں نعت نے ایک مضبوط و مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔تاریخ کے ہر دور میں شمع توحید و رسالت کے پروانوں نے ادب کے دامن میں حمد و نعت کے گل ہائے رنگ سجا کر جو اسے مقبولیت عطا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔رسول ﷺ کی تعریف وتوصیف میں عرب کے شاعروں کی ایک مکمل کہکشاں نظر آتی ہے۔نعت گوئی کے سلسلے میں جلال الدین رومی، فریدالدین عطار، حافظ شیرازی اور امیر خسرو کے نام اہم ہیں۔لہٰذا نعتیہ شاعری امتِ مسلمہ کی روایت کا مستقل اور زریں باب ہے۔

ایثؔار جب نعت گوئی کی طرف مائل ہوئے تو عشق ومحبت میں ڈوبے ہوئے اشعار صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگے۔انہوں نے اپنی نعتوں میں وفورِ عشق اور جذبۂ صادق کے موتی پروئے ہیں۔آپؐ سے ایثؔار کا عشق اور ان کی والہانہ وارفتگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔انہوں نے نعتِ سرورِ کونین کے گلدستے عالمِ جذب و کیف میں پیش کئے ہیں۔کہیں ان کی آنکھیں حضورؐ کی آمد کا منظر کھینچتی ہیں تو کبھی وہ آپؐ کی ذات کی تصویر کشی اپنے اعجازِ قلم سے کرتے ہیں تو دل و ذہن منور ہو جاتا ہے۔

توصیفِ محمد بھی ہے تحمید خدا کی
سورج کی ثنا گوئی ہے تعریف ضیاء کی

ہاں یوں تو بشر ہم بھی رہے وہ بھی بشر ہیں

ہستی ہے جدا صاحبِ لولاک لمّا کی

وہ خلقِ حسن معترف اعدا بھی تھے جس کے
دل آئینہ، شفقت کی نظر، شان عطا کی

غزاواتِ شمشیر بکف، رنگِ جلالت
اور امن کے عالم میں فضا عفو و عطا کی

پیشانیٔ آدم پہ جو تھا نور تو کیا تھا
مسجودِ ملائک جو ہوا پیکرِ خاکی

ایثاؔر اجابت کا اشارہ ہے یہ رِقت
جو چاہئے لے مانگ یہ ساعت ہے عطا کی

آبفشار مجموعہ کلام میں شامل نعت میں ایثاؔر نے نبی کریم ﷺ کو تخلیقِ کائنات کا سبب قرار دیتے ہوئے رسول ﷺ سے اپنی محبت کا برملا اظہار نہایت ہی عمدہ طریقے کے ساتھ کیا ہے۔ رسول ﷺ سے والہانہ عشق کا عالم دیکھیے۔

مکینِ گنبدِ خضریٰ، چراغِ طاقِ نورانی
شبِ اسریٰ کے یکتا، میہمانِ عرشِ ربانی

یہ عالم روشنی پر روشنی تاروں کے جھرمٹ میں
ابل کر بہہ رہا ہے چشمۂ انوارِ سبحانی

یہ طیبہ ہے، یہیں گنجینۂ وحدت کی کنجی ہے
اسی دربار سے وابستہ ہے تقدیرِ انسانی

عنایت آپؐ ہی کی سربلندی آدمیت کو
اسی سے ہے ایازیؔ آبروئے تاجِ سلطانی

عرب کیسا، عجم کیسا، چڑھا جب نشۂ وحدت
جہاں کو کر گیا زیر و زبر ذوقِ مسلمانی

یہاں دولت کے دھارے لعل و گوہر کے خزینے ہیں
سبب ناداریوں کا ہے خود اپنی تنگ دامانی

اتباعِ رسولؐ ہی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لئے رسول اکرمؐ کی ذات مقدس بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اور عشقِ رسولؐ کے ذریعہ ہی دنیا اور آخرت سنواری جاسکتی ہے۔ عبادتِ الٰہی میں اگر عشقِ رسولؐ کا جذبہ نہ ہو تو ایسی عبادت بے اثر ہوتی ہے۔ ایثاؔر نے جس سادگی سے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے اس سادگی میں سرشاری اور عقیدت کا ایک بحرِ بے کراں موجود ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کی وہ ایک سچے عاشقِ رسولؐ ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں جہاں متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے وہیں اشعار پورے حسنِ کمال کا مرقع نظر آتے ہیں جو معنویت سے بھرپور ہیں۔ یہ اشعار عشقِ رسولؐ کے مظہر ہیں جو نظریات کا آئینہ دار بن گئے ہیں اور ایثاؔر کے عاشقِ رسولؐ ہونے کے غمازی کرتے ہیں۔ ایثاؔر فرماتے ہیں:

سرورِ دل و جاں خیالِ محمدؐ
خیالِ محمدؐ وصالِ محمدؐ

بشر ہیں یہ خیر البشر مرتبہ میں
ہے قولِ الٰہی بہ قالِ محمدؐ

عراق وعجم زد پہ عالم کا عالم
نہ معلوم کیا ہوگا حالِ محمدؐ

آپؐ پر اور سلامِ عقیدت
باصحاب و ازواج و آلِ محمدؐ

ہوا ہے نہ ہوگا، یہ ایماں ہمارا
کرے پیش کوئی مثالِ محمدؐ

ہے حبل المتیں دامن آقاؐ کا ایثارؔ
ہے کام اپنا بس امتثالِ محمدؐ

ان نعوت میں ایثارؔ نے اپنے تخلیقی جوہر اور فنکارانہ صلاحیتوں کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ ہر رنگ اور ہر انداز میں ایثارؔ آپؐ کے اخلاق و اوصاف کو بے حد خوبصورت انداز میں نظم کرتے ہیں۔ ایثارؔ کا کلام اعلیٰ شعری بصیرت، صالح فکر و تخیل، فنِ شاعری سے گہری واقفیت، زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ ساتھ سرورِ کائناتؐ سے بے پناہ الفت و عقیدت، مدینہ منورہ سے والہانہ لگاؤ، سیرتِ طیبہؐ سے آگاہی اور تصوف و معرفت کے رموز و اسرار کا آئینہ دار ہے۔

مزمل تم، مدثر تم، تم ہی یٰسینؐ، تم ہی طٰہٰؐ!
تمھاری شان کے شایاں ہے ''سبحان الذی اسریٰ''

دیا پیغامِ وحدت آپؐ نے اولادِ آدم کو
مٹیں قومیں، قبیلے، بن گئی اک ملتِ بیضا

وہ جالی حجرۂ اقدس کی اب بھی ہے نگاہوں میں
تجلیٔ پس پردہ سے تھا پر نور نظارہ

غلاموں کو میسر آپ کے صدقے میں آزادی
گیا احساس ناداروں سے اپنی بے نوائی کا

علاجِ دردِ انسانی دگر کچھ ہو نہیں سکتا
زمانے کو ضرورت ہے فقط اک ملتِ بیضا

ان کا عقیدت مند دل آپ ﷺ کی محبت میں سرشار ہے۔ ان نعوت میں جہاں معجزات کا بیان ملتا ہے۔ وہیں حکیمانہ اندازِ نظر بھی موجود ہے۔

حبِ رسولؐ دل میں سرایت جو کر گئی
عقبیٰ سے مطمئن ہوئے دنیا سنور گئی

چومادرِ حبیب کو صد ہا نیاز سے
سر فرش سے اٹھا تو نظر عرش پر گئی

ہے شان عجیب عشقِ رسالت مآبؐ کی

سیراب دل ہوا، ہوسِ مال وزر گئی

وہ سبز گنبد اس کا وہ نظارہ مرحبا
ٹھنڈک سی دل کو پہنچی جب اس پر نظر گئی

اک لمحہ کاش آپ کا دیدار ہو نصیب
اس آرزو میں عمر کی مدت گذر گئی

عقیدے وجذبے میں ڈوبے ہوئے ان کے یہ اشعار ان کی دلی کیفیات کے مظہر ہیں۔ان حمد یہ و نعتیہ کلام نے ایثارؔ کو اللہ اور اس کے محبوبؐ کا قرب عطا کیا ہے، اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ان پر بے پناہ عقیدت اور والہانہ جذبہ وکیف کا اثر ہے۔ایثارؔ کی نعت گوئی فکری اور فنی اعتبار سے اپنے اندر حسنِ نظر اور تسکینِ جگر کے کئی پہلو لئے ہوئے ہے۔ان نعوت میں زبان و بیان کے اعتبار سے کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان تاثیر میں ڈوبا ہوا بیان، استعارات وتشبیہات، تخیل کی ہمہ گیری، شگفتگی و پاکیزگی اور تقدیس کی آمیزش نے ان کی نعتوں کو زبان و بیان کا معجزہ بنادیا ہے۔

غزل گوئی

غزل اردوزبان کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔لاتعداد شعراء نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہےاورآج بھی کرر ہے ہیں اوریہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ڈاکٹر شفیق اعظمی رقمطراز ہیں:

''اپنی لطافت اور دل نشینی، جامعیت اور اختصار، اثر آفرینی اور تغزل کے باوصف اردو شاعری میں جو مقبولیت اسے حاصل ہوئی وہ کسی دوسری صنف شاعری کو نصیب نہیں ہوئی۔''٦ے

غزل کے لغوی معنی محبوب سے گفتگو کرنا ہے یا عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔اصطلاح میں وہ نظم جس میں حسن و جمال، عشق وفریفتگی، ہجر ووصال، وغیرہ کا ذکر ہو۔لیکن رفتہ رفتہ وہ تمام موضوعات بھی غزل کی حدود میں داخل ہو گئے جو صدیوں سے عربی وفارسی قصیدوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔غزل اپنے تاریخی پس منظر کی بناپر کبھی محدود معنوں میں عورتوں سے باتیں کرنے پر موقوف نہیں رہی۔اس میں ابتداء ہی سے عشق و عاشقی کے مضامین کے ساتھ ساتھ رندانی، خمریاتی، فکری وفنی، فلسفیانہ وصوفیانہ خیالات کا بھی دخل رہا ہے۔اورآج ہر طرح کے مضامین وموضوعات اس میں شامل ہیں۔غزل زندگی کے ہررخ ورنگ اورزمانے کے بدلتے نشیب وفراز کوادا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔انسان کی ذہنی اورروحانی جدوجہد سےلیکرزمانے کی ہمہ جہت کروٹوں کے ساتھ تمام انسانی سرگرمیاں اس کی دسترس میں ہیں۔اس کے موضوعات رومانی بھی ہیں اور جمالیاتی بھی فکری وفلسفیانہ بھی، سیاسی اورصوفیانہ بھی۔کئی سوسال کے سفر کے نشیب وفراز کے باوجودآج بھی غزل ملکہ سخن ہے۔غزل کی لطافت مقبولیت اوراسکے حسن وجمال کے متعلق آل احمد سرور رقمطراز ہیں:

''غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔یہ اشارے کنایے، رمز و

ایماء،کم سے کم الفاظ کے ذریعہ زبان سے زیادہ سے زیادہ کام
لینے،معنی کی کئی پرتوں کو برتنے، مدھم چراغوں کی لو سے ذہن میں
چراغاں کرنے کا فن ہے ۔یہاں سورج کی تیز روشنی کا گزر
نہیں،چاندی کا جادو جگایا جاتا ہے۔غزل قدماء سےلیکراب تک
بہت سے رنگوں سمتوں، وارداتوں کیفیتوں اور جلوؤں کو جذب کر
چکی ہے ۔تجربے کے شوق میں یہ غزل کے بعض آداب سے
بغاوت پر بھی آمادہ رہی ہے مگر مجموعی طور پر یہ زندگی کی ہر منزل،
ذہن کی کروٹ اور مزاج کے ہر موڑ کا ساتھ دیتی رہتی ہے۔یہ
ساری شاعری نہیں ہے لیکن شاعری کے ایک اہم قابلِ قدر اور
جان دار صنف ہے۔اس کا فن ہمارے صدیوں کے ریاض کا ثمرہ
ہے ۔اور اسمیں ہماری زندگی ،تہذیب ،ماحول ،روایت
،مزاج،اور مخصوص ذہن کی بھر پور نمائندگی ہے۔یہ تنظیم،تسلسل
اور ضمیر سے بے نیاز اپنے اشاروں،اپنے نشتروں اور اپنی فضا
آفرینی کے ذریعہ اپنی طاقت کا لوہا منواتی ہے۔یہ ذاتی تجربات
کو آفاقی جہت دیتی ہے اور یہ کاروبار شوق کو زندگی کے ہر رنگ
میں دیکھتی اور دکھاتی ہے۔یہ حدیثِ دلبری ہے اور صحیفۂ کائنات
بھی۔مگر صحیفہ کائنات کو بھی یہاں حدیث دلبری کا رنگ و آہنگ
اختیار کرنا پڑتا ہے۔'' ۷

غزل کی پہچان اس کی کیفیت سے متعین ہوتی ہے۔غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعہ ہم قافیہ یا ہم
قافیہ و ہم ردیف ہونا لازمی ہے۔غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔جس میں شاعر اپنا تخلص
استعمال کرتا ہے۔اس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔شاعر کو اپنی بات یا خیال کو ایک شعر میں ادا کرنا ہوتا

ہے۔جس کے لئے ایجاز واختصار کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے غزل میں رمز وایماء علامت، اشارے کنائے اور استعاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔حیات و کائنات کی منظر کشی کا جو ہنر غزل کو حاصل ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔دو مصرعوں کے ذریعے غزل کا ہر شعر واقعات و سانحات اور خیالات و کیفیات کی ایک دنیا آباد کر دیتا ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو غزل میں مضامین کی وسعت اور ہمہ رنگی کی بھر پور گنجائش ہے۔وارداتِ ہجر و وصال نے جہاں اسے ہر دلعزیز بنا دیا وہیں تخیل و تفکر نے اسے بلند پروازی عطا کی ہے۔موضوعات کا تنوع ہو یا فکر کی رنگا رنگی، ہئیت و اسلوب کی دلکشی ہو یا رمز و ایمائیت اور ایجاز و اختصار کی آمیزش ان تمام محرکات نے اصنافِ شاعری میں غزل کو انفرادیت عطا کی ہے۔ڈاکٹر کامل قریشی کے الفاظ میں:

> ''اس نے دلوں کو برمایا، دماغوں کو جھنجھنایا اور روحوں کو گرمایا ہے۔اس نے لفظوں کے موتی بکھیرے اور معنی کے دریا بہائے ہیں۔اس نے بہاروں کو سدا بہاروں میں رنگ دیا ہے تو پت جھڑوں میں پھول کھلائے ہیں۔اس نے اپنی خوشبو سے اگر ہواؤں کو معطر کیا ہے تو فضاؤں میں نغمے بکھیرے ہیں۔کیف و سرور و مستی لئے ہوئے جب یہ موج میں آتی ہے تو ایک طرف اگر روحیں جسموں سے نکلنے کے لئے بیتاب ہوگئی ہیں تو دوسری طرف مردہ تنوں میں جان پڑ گئی ہے۔''[۸]

اردو غزل نے غیر معمولی سرعت سے ترقی کی ہے۔ولی، سراج، میر، درد، سودا، ذوق، آتش، غالب، مومن، داغ، جیسے شعراء نے اردو غزل کو نئے امکانات اور نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔اسے نیا حسن و وقار عطا کیا۔ان شعراء نے غزل کے موضوعات میں زندگی کے اتار چڑھاؤ، سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی اور پیچیدہ مسائل کو شامل کیا۔اردو غزل کے ارتقائی سفر پر تجزیہ کرتے ہوئے اختر انصاری رقمطراز ہیں:

> ''اردو غزل نے صدیوں کا سفر طے کیا۔یہ تین سو سال تک جا گیر

دارانہ تصورات اور خیالات کی عکاسی بنی رہی اور پوری کامیابی
کے ساتھ ۲۰ ویں صدی کے تمدنی بحران اور تہذیبی خلفشار کو اپنی
مخصوص رمزیت کے دامن میں سمیٹے نظر آتی ہے۔اس میں کچھ
ایسی قدرتی لچک پائی جاتی ہے کہ ہر آنے والے دور کے نئے
تقاضوں میں نہایت آسانی کے ساتھ ڈھل جاتی ہے اور اس عہد
کی اجتمائی روح سے ہم آہنگ ہوکر اس کی ترجمانی کے فرائض
بحسن وخوبی انجام دیتی ہے۔“ ۹

غزل شاعری کی ایک اہم اور قابلِ قدر صنف ہے۔اور ہر عہد میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی کے فرائض اپنے مخصوص انداز و اسلوب میں کرتی رہی ہے۔بقول سیماب اکبر آبادی:

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

بلاشبہ غزل کے دامن میں وسعت، گہرائی، گیرائی، اور دلکشی و دلآویزی ہے ۔غزل کی کائنات میں خوبصورت رنگوں کا امتزاج ہے۔اس میں صرف محبوب کے حسن و جمال اور اسکی رعنائی و دلفریبی ہی کی تصویر کشی نہیں کی جاتی بلکہ حیات و کائنات کے مسائل اور زندگی کے تصورات و مشاہدات کو دلکش پیرائے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔غزل کے متعلق ایثآر کہتے ہیں:

ہے کسی صنف میں یہ فکر کی رفعت یہ جمال
غیر ممکن ہے جو ابِ قدِ بالائے غزل

ایثآر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انہوں نے غزل کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ۔ان کی غزلیں فکر و فن کے نئے در وا کرتی ہیں۔ان کی غزلیں ان کی روشن خیالی کی آئینہ دار ہیں۔انہوں نے اپنے علم و عرفان، تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات، اپنے تجربات کو پوری صداقت اور خلوص کے

ساتھ غزل کے روپ میں ڈھالا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں:

''شاعری کے لئے عام طور سے اور غزل کے لئے خصوصیت کے ساتھ لازمی ہے کہ جو تاثر یا ذہنی نقش یا خیال شعر میں ادا ہو، کیا جائے۔ اس میں اصلیت اور سچائی ہو اور زبان اور اسلوب میں صداقت اور بے ساختگی اور کبھی تکلف سے کام بھی لیا جائے تو اس میں بے تکلفی اور برجستگی کی شان پائی جائے۔ صحیح معنوں میں غزل سراوہ ہے جس کے دل اور زبان دونوں میں ایک گھلاوٹ، ایک گداز، ایک سنجیدہ اور متین میلانِ تامل ہو۔''۱۰

ایثآر کے ہاں دل اور زبان دونوں میں سنجیدگی، گھلاوٹ اور گداز موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے نشیب و فراز کسی نہ کسی زاویے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں سادگی بھی ہے اور پاکیزگی بھی، سنجیدگی بھی ہے اور حسن و وقار بھی، ان میں زندگی کا عرفان اور اسے بسر کرنے کا ایک لائحہ عمل بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کے لئے ان ہی موضوعات کا انتخاب کیا جو غزل کی ابتداء ہی سے اس کا لازمی جزو بنے ہوئے ہیں۔ حسن وعشق کا بیان، صوفیانہ مضامین، دردِ انسانیت، فلسفہ حیات اور فلسفہ غم و تغزل کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے غزلیں کہی ہیں۔ اندازِ بیان کی شگفتگی، سادگی اور روانگی نے ان کی غزلوں کو غیر معمولی حسن عطا کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر فنکار اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے۔ فنکار وہی ہے جو اپنے عہد، اپنے سماج و ماحول کی سچی ترجمانی اپنے ذوق و وجدان کی مدد سے بہ آسانی کر سکے۔ ایثآر نے یہ فرض بخوبی ادا کیا ہے۔ ایثآر کا فن حقیقی معنوں میں صورت و معنی کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں تازہ خیالات کی خوشبو کا احساس ملتا ہے وہیں ماضی کے صنم کدوں کا نور بھی جھلکتا ہے۔ ایثآر کے کلام میں فکر و احساس کے حسین امتزاج کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جو انہیں روایت کی امین بھی بناتی ہیں اور نئے افکار و خیالات کا پیامبر بھی۔

ذوق لے جائے جدھر بھی مجھے جانے دوادھر
میں ہوں رہگیر اسی سمت ہے رستا میرا

رنگ وبوئے گلِ تر سے بھی لطافت میں سوا
کس قدر پاک ہے ذوقِ سخن آرا میرا

بلبل چمن میں اور کبوتر فضاؤں میں
ہے تاک باندھے صید کو خونیں عقاب مست

خاموش نظر آؤں تو خاموش نہ سمجھو
دامانِ تخیل میں گہر رول رہا ہوں

اس مشتِ خاک کے یہ کرشمے تجھی سے ہیں
سب کچھ ترا ہے، عقل بھی، دل بھی نگاہ بھی

انسان کارخانۂ قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ کائنات کی جو بھی چمک دمک اور رنگارنگی ہے اسی کے دم سے ہے۔ بقول اقبالؔ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

انسان آج اپنی ذات بھی فراموش کر چکا ہے۔ اپنی ہستی کی حقیقت کو بھلا کر گمراہی کی طرف بڑھ رہا

ہے۔ایثؔار نے اپنے اشعار میں انسانی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان سرتاجِ کائنات ہے اسے اپنی ذات کی حقیقت سے واقف ہونا چاہیئے۔اگر وہ اپنی ہستی کو پہچان لے گا تو پھر کائنات کر سربستہ رازوں سے بھی واقف ہو جائے گا۔اور اسے خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیمی پیدا کرنے میں دیر نہ لگے گی۔

دو عالم کی حقیقت فاش ہو سکتی ہے دم بھر میں
ذرا خود آشنا ہو جا کہ تو ہی رازِ ہستی ہے

کمی ایک قوتِ نظارہ کی ہے ورنہ اے موسیٰ
یہاں آتا ہے ہر ذرہ کو رشکِ طور ہو جانا

تجھ کو بے اصل نظر آتا ہے ہنگامہ دہر
تیری آنکھوں میں ہے باقی اثرِ خواب ابھی

ان کے یہاں فرسودگی نہیں بلکہ رعنائی و دلکشی ملتی ہے۔انہوں نے زندگی کے دقیق مسائل کو آسان اور عام فہم لہجہ میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ان کی شاعری میں ایک جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔وہ میر تقی میر کی طرح انسانی زندگی کو محض پانی بلبلہ تصور نہیں کرتے بلکہ اقبال کی طرح ان کے نزدیک زندگی جہدِ مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں امید اور خوشی و سرشاری نظر آتی ہے۔وہ جہدِ مسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔

دار ہو، آتش نمرود ہو، کچھ بھی ہو مگر
پست ہونے کی نہیں ہمتِ مردانۂ دل

ہمت بلند ہو تو ہمالہ بھی کچھ نہیں

ورنہ ہے کوہ کے لئے بھاری گیاہ بھی

میں تنکا ہوں بگولوں کا اچھالا
مری ہمت زمیں سے آسماں تک

وہ حالات کے سامنے خود کو بے بس پاتے ہیں لیکن زندگی سے فرار اختیار نہیں کرتے، موت کی آرزو نہیں کرتے، انہیں خود پر اعتماد ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے زندگی میں ہمیشہ ثابت قدم رہنا چاہئے وہ کسی بھی مصیبت یا مشکلات سے خوف نہیں کھاتے ان کے عزائم بلند ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

حوصلہ ایثاؔر ہے مردانِ حق کا حوصلہ
آسماں ٹوٹے، گرے سر پر بھی ڈرتے ہی نہیں

آندھیاں آ کے پلٹ جائیں گی بے نیل ومرام
شمع گل ہو نہیں سکتی مرے کاشانے کی

ایثاؔر کے ہاں شدت نہیں ہے وہ ہر جگہ معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں۔ زندگی کی صعوبتوں سے ہراساں ضرور ہوتے ہیں لیکن بہت جلد خود کو سنبھال کر آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اور بڑے جذب کے عالم میں کہتے ہیں:

جو بڑھا تو پیچھے نہ جاؤں گا، قدم آگے آگے بڑھاؤں گا
مجھ دھن ہے اپنے مقام کی مجھے کام اپنے ہی کام سے

طغیانیوں نے حوصلے بخشے نئے نئے

دبنا کہاں کا اور بھی اونچا ہوا ہوں میں

چھونا فلک کو حوصلہ مندی کی بات ہے
آہیں جو عرش پر گئیں بے بال و پر گئیں

ایثآر کی غزلیں ان کے احساسات اور دلکش خیالات کی ترجمان ہیں۔ان کے کلام میں جذب واثر ہے۔انہوں نے مختصر الفاظ میں معانی کی ایک دنیا آباد کی ہے۔دولت کی چکا چوند اور عیش و آسائش کی طلب نے انسان کو خودغرض بنا دیا ہے۔اس کے سبب دلوں سے انسانی ہمدردی اور سماجی خیر خواہی کا جذبہ واحساس مفقود ہوتا جارہا ہے۔ایثآر نے اپنی غزلوں کے ذریعے اخلاق،انسان دوستی اور امن پسندی کا پیغام دیا ہے۔وہ اخوت، بھائی چارگی اور انکساری کو سماجی زندگی کے لئے ناگزیر تصور کرتے ہیں۔وہ افراد کو انسانیت کا علم بردار ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت میں اس قدر تاثیر ہے کہ وہ اپنے اندر سارے جہاں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

محبت سمیٹے ہے سارے جہاں کو
محبت میں تاثیر ہے جاذبانہ

انکساری کا ہے بڑا مقام
خودسری،سرکشی سے کیا ہوگا

کتنوں کے دل کا بغض گیا دشمنی گئی
ایثآر کام رکھتے ہیں شیریں زباں سے ہم

ایثآر اپنی شاعری میں علمیت بگھارنے کے بجائے جذبات کے اظہار کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کے مطابق شاعر کو اپنے علم کا ترجمان بننے کی بجائے جذبات کی زبان بننا چاہئے اور یوں وہ ٹی ایس ایلیٹ کے اس خیال کے ہمنوا نظر آتے ہیں:

''یقین ومشاہدہ اور جذبات واحساسات کی شدت یہی وہ بنیادی
عناصر ہیں جن کی بدولت شاعر اپنے محسوسات اور جذبات میں
قاری کوبھی شامل کرسکتا ہے۔الفاظ وتراکیب سے زیادہ لوگوں پر
شاعری یوین ومشاہدہ اوراس کی کیفیتِ نفس اثر انداز ہوتی ہے
۔اس لئے کہ شاعر کا دماغ شعر کوصورت بخشتا ہے لیکن اس سورت
کوزندگی عطا کرنا جذبات کا کام ہے۔''[۱۱]

شبلی نعمانی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''شاعری کوجذبات ہی سے تعلق ہے اس لئے تاثیراس کا عنصر
ہے۔شاعری ہرقسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے ۔مصورانہ
شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظراثر انگیز ہیں
شاعری ان کوپیش کردیتی ہے۔''[۱۲]

ایثؔار باشعوراور حساس شاعر ہیں۔انہوں نے اپنی فکر میں جذبے کوبھی شامل کیا ہے۔ان کے اشعار میں جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کے جذبات کی صداقت اور سادگی ہے۔ان کی غزل میں فکر اور خیال کی گہرائی وگیرائی کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت اور خلوص بھی ہے۔ بظاہر یہ اشعار آسان اور عام فہم ہیں لیکن ان میں گہری معنویت ہے۔ یہ اشعار درد واثر میں ڈوبے ہوئے ہیں جس سے شاعر کی دلی کیفیات کی غمازی ہوتی ہے:

بتانے کی ضرورت کیا عیاں ہے سب کی آنکھوں پر
جو افسانہ مرے گھر کے در و دیوار کہتے ہیں

جو ہوسکتا تو سینہ چیر کر دل رکھ دیا ہوتا

ثبوت اپنی صفائی کا مقابل رکھ دیا ہوتا

نہ ہوتیں مشکلیں آساں نہ کٹتے دن مصیبت کے
سمجھ کر کارِ مشکل کو جو مشکل رکھ دیا ہوتا

میں برا ہی سہی میں بھلا ہی سہی، میں جو ہوں سو ہوں کوئی غم نہیں
مجھے چھوڑ یے میرے حال پر مرا ذوق الگ ہے تمام سے

منتظر میری ہے طوفانوں کی شورش اب تک
ایک چکر میں ہے میرے لیے گرداب ابھی

ان کی غزلوں میں تجربات و مشاہدات افکار و خیالات اور کیفیات و جذبات کا پختہ شعور ہے جس پر شاعر ثابت قدم ہے۔ ذاتی اور اجتماعی زندگی کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہجہ میں ایک خاص نرمی حلاوت اور دلآویزی ہے۔ جس سے بات سیدھے دل میں اترتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کا اپنا کردار جو نظر آتا ہے وہ ایک تنہا انسان کا کردار ہے۔ یہ تنہائی کچھ تو ان کے ذاتی حالات و مسائل کی دین ہیں اور کچھ خارجی عوامل اور رویوں کی۔ وہ انسانی رشتوں، رویوں اور تعلقات میں خلوص کے خواہاں ہیں۔ اور جب زندگی کی تلخ حقیقتیں ان کے جذبوں کو شکستہ کرتے ہیں تو انہیں بے انتہا افسوس ہوتا ہے۔

ایک انجمن سے ربط، پر سب کا شعار الگ الگ
ایثار اک رخی کہاں شیرازہ ہی بکھر گیا
ہاتھ بے فیض ہیں دل مہر و وفا سے عاری
کتنی بے آب ہے بے رنگ ہے دنیا داری

کٹھنائیاں حیات کا ساماں ہوئیں مجھے
طوفاں کے غضب کا ابھارا ہوا ہوں میں

دل میں ہر دم اک ہجومِ آرزو
ساتھ دل کے کاروانِ دل چلا

انہوں نے سہل اور صاف لفظوں میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے ان کے کلام کا یہ وصفِ خاص ہے کہ وہ صاف ،شستہ زبان میں اپنے خیالات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بیان میں کہیں رکاوٹ یا الجھاؤ نہیں ہوتا۔وہ کہتے ہیں:

اپنے پرائے جو بھی ہیں اس دم کے ساتھ ہیں
وقتِ اخیر کون کسے ہمسفر ملا

کرے وہ بند سمندر کو ایک قطرے میں
جو بخشے ذرے کو وسعت تو کائنات کرے

کیا مصلحت ہے پردہ حقیقت پہ ڈال کے
سمجھا رہے ہو راز عروج وزوال کے

زندگی اور موت ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔اس کا تصور اردو شعراء کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ کسی نے اسے گردشِ زماں ومکاں کی تلخیوں سے تعبیر کیا تو کسی نے ناکامیوں اور مشکلوں کا ثمرہ بے سود قرار دیا،کوئی اسے پانی کا بلبلہ کہہ کر ناپائیدار اور فانی ٹہراتا نظر آتا ہے تو کوئی اس کی دشواریوں سے فرار چاہتا ہے۔ زندگی اور موت کے اہم مسئلوں پر ایثآر کی بھی گہری نظر ہے۔زندگی ان کے ہاں الگ الگ معنوں میں سامنے آتی ہے۔کبھی وہ طنزیہ انداز ختیار کرتے ہیں اور کبھی زندگی سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں،تو کبھی زندگی سے

سوال کرتے نظر آتے ہیں۔انسان دنیا کی ظاہری چمک دمک اور شان وشوکت میں یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں فانی ہیں۔اس عارضی دنیا کی خوشیاں بے معنی ہیں زندگی کی ناپائیداری کا احساس ان کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔

یہ دودن کی بہارِ بوستان کیا
نہ ہو پائیندہ جو ایسا جہاں کیا

پوچھیں گے جو خضر سے بھی ملے گا یہی جواب
مدت فقط دو روزہ ہے عمرِ دراز کی

فرمان اس کا اس کی مشیت ہے زندگی
واللہ مجھ کو عین عبادت ہے زندگی

یہ چار دن ہیں حاصل طولِ حیاتِ خضرؑ
سمجھو نہ یہ کہ زیست کی مدت ہے زندگی

جب کوئی شاعر یا ادیب فکر کی بلندی پر پہنچتا ہے تب نصیحت آمیز اشعار وجود میں آتے ہیں۔ایثار کی شعری تخلیقات میں بھی فرد و معاشرے کے لئے نصیحتیں ملتی ہیں۔ایثار کی غزلوں کی نمایاں خوبی فکری عنصر ہے۔

یہ جہاں دارالعمل ہے کام کرتے جایئے
دامنِ مقصود اپنا آپ بھرتے جایئے

راستے کتنے ہیں کوشش سے سنورنے کے لئے

ناامیدی چھوڑ یئے ،چل کرسنور تے جایئے

علم وحکمت کے دے جلا سب کو
قو م میں مہر و ما ہ پید ا کر

چشمِ ر وشن نگا ہ پید ا کر
پھراندھیروں میں راہ پیدا کر

جذبۂ عشق ومحبت کا بیان اردوغزل کا عام موضوع ہے۔بقول شبلی:

''عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔اس لئے جہاں انسان ہے،عشق بھی ہے۔اور چونکہ کوئی قوم شاعروں سے خالی نہیں،اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی۔''[۱۳]

ڈاکٹر یوسف حسین خان اس موضوع سخن پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے یہ ایک فطرتی کشش ہے جو دل میں ذوق وشورش پیدا کر دیتی ہے،کوئی انسان چاہے کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے نا واقف نہیں ہوسکتا،اس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے۔''[۱۴]

اور یہ ممکن نہیں کہ غزل پر گفتگو ہو اور محبوب کا ذکر نہ آئے۔محبت انسانی زندگی کی ایک خوبصورت اور

اٹل حقیقت ہے۔اردوغزل میں محبوب کا تصورمرکزی حیثیت رکھتا ہے۔تقریباً ہر دور میں شعراء نے عشقیہ موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔غزل میں مختلف حوالوں سے عشقیہ مضامین کا استعمال کیا گیا ہے۔کہیں قیس و لیلیٰ،شیریں فرہاد کے ذریعے تو کہیں گل وبلبل،صیاداور قفس اس کی پیکر تراشی کرتے ہیں۔ہجر ووصال ہو یا بہار وخزاں ،امید و یاس ہو یا عاشق کی نامرادی اورمحبوب کی بے وفائی سب عشقیہ مضامین کے مختلف رنگ ہیں۔ایثآر کی غزلوں میں بھی عشقِ مجازی کے مضامین اپنی تمام تر رعنائیوں اوردلکشی کے ساتھ موجود ہیں۔وہ کہتے ہیں:

پردہ بے سود ہے تیرا،ترے دیوانوں سے
شمع روشن کہیں چھپ سکتی ہے پروانوں سے

گر پلانی ہو پلا مست نگاہوں کی ہمیں
پیاس بجھتی نہیں ساقی ترے پیمانوں سے

وہ اقرار تھا یا کہ جھوٹی تسلی
نہ پورا ہوا،اب تک اقرار تیرا

اگرچہ ایثآر کی حقیقت پسند طبیعت نے فلسفیانہ غوروفکر پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی لیکن عشقیہ جذبات کی عکاسی بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ان کی غزلوں میں حسنِ محبوب کی مختلف کیفیات نظر آتی ہیں۔اس مشاہدۂ جمال میں گیسو،رخسار،نازوادا،طرزِ گفتگوسب کا تذکرہ موجود ہے۔ان کی محبت ماورائی نہیں بلکہ فطری ہے۔وہ اپنے محبوب کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

وہ مسکرائے تو ماحول کو کرے روشن
بکھیرے گیسو تو سایہ سے دن کو رات کرے

واہ رے موسمِ گل اف یہ حسینان، چمن
کھنچ گئی آنکھ میں تصویر پری خانے کی

کون کرسکتا ہے اس گیسوئے مشکیں کی ثنا
کر دیا صرف تصور نے معطر مجھ کو

ان اشعار میں پیرایۂ اظہار سادہ اور آسان ہے۔جس میں شاعر کا خلوص اور صداقت شامل ہے۔انہوں نے کیفیاتِ عشق کی ترجمانی میں سلیقہ مندی اور شائستگی کا ثبوت دیا ہے۔

جاگ اٹھیں ساری امیدیں، کھل گئے دل کے کنول
بے محابہ آ گیا وہ مسکرا کے سامنے

یہ زخمِ تیر نہیں ہے تری نشانی ہے
لگا رکھیں گے کلیجہ سے اس نشانی کو

حسن وعشق کی اس کشمکش میں ایثار ایک عام شاعر کی طرح اپنے محبوب کا انتظار ایک باوفا عاشق کی طرح کرتے ہیں۔

ان کے قدموں کی سی آہٹ ہے مرے در پہ کہیں
جاگ اٹھی نہ ہو قسمت مرے کا شانے کی

کہیں کہیں اپنے محبوب کی بے رخی کا شکوہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں جاذب نظری بھی دیدنی ہے اور طنزیہ انداز اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

وہ ان سنی کر دیتے ہیں سب کچھ سن کر

ہر بات کا ہم دل پہ اثر لیتے ہیں

کچھ خبر بھی ہے یہ ٹھکرا کے چلے ہو کسی کو
یہ وہیں ہیں جو تمہیں دل میں جگہ دیتے ہیں

جاگتے میں تو کبھی منھ نہ دکھایا تم نے
پھر دبے پاؤں مرے خواب میں آتے کیوں ہو

اور کہیں روایتی طرز اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ ان کے انداز میں شگفتگی، دل کشی، رعنائی اور لطیف سی رنگینی کا احساس ہوتا ہے جو انتہائی پرکشش ہے۔

دل میں ہوتا ہے بہت کچھ نہیں کہنے پاتا
ہونٹ تو ہلتے ہیں پر گنگ سا ہو جاتا ہوں

آپ سے دور مری جاں کو نہ آئے گا قرار
ہے مرے جانے پہ اصرار تو لو جاتا ہوں

ان کے ہاں اندازِ دل فریبی کے ساتھ ساتھ حسن کی اداشناسی بھی ہے، نفسیاتی اعتبار سے وہ معشوق کے دلی جذبات واحساسات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

کھل کے آنا جو نہیں دل میں سماتے کیوں ہو
جان سے رہ کے قریں منھ کو چھپاتے کیوں ہو

وہ بات کرتے ہیں یا منھ سے پھول جھڑتے ہیں

زباں عطائے الٰہی ہے خوش بیانی کو

دل خوشی سے نہ سمائے گا مرے پہلو میں
دیکھ لیں گے وہ جو کبھی آنکھ اٹھا کر مجھ کو

ایثؔار کے یہاں سچے جذبات کی ترجمانی اور تجربے کا خلوص ملتا ہے۔انھوں نے لطیف جذبات واحساسات کو تغزل کے آب ورنگ کے ساتھ انتہائی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔لہجہ کے رچاؤ نے اس کیفیت کو مزید دہ آتشہ کر دیا ہے۔تکلف وتصنع کا دور دور تک شائبہ نہیں ہے۔قلبی واردات کی ترجمانی اعتدال اور سنجیدگی کے ساتھ کی گئی ہے۔مختصر یہ کہ ان کا تصورِ عشق شائستہ اور جمالیاتی اعتبار سے مکمل ہے۔مختلف مواقع پر حسن وعشق کی مختلف النوع کیفیات وواردات جوان کے ذہن ودل پر گزریں اسے انھوں نے انتہائی موثر و دلکش انداز میں شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

صنفِ غزل میں ایک طرف عاشقانہ جذبات وکیفیات کا اظہار کثرت سے ہوتا ہے تو دوسری طرف تصوفانہ وفلسفیانہ خیالات کی آمیزش بھی غزل کے حسن کو دو بالا کر دیتی ہے۔غزل نے ہر دور میں جذباتی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔تصوف نے غزل کے موضوعات میں جہاں تنوع پیدا کیا وہاں خیالات کی دنیا کو بھی وسیع سے وسیع تر بنایا ہے۔ایثؔار کی غزلوں میں بھی مفکرانہ گہرائی،فلسفیانہ رجحان اور متصوفانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

خاموش نظر آؤں تو خاموش نہ سمجھو
دامانِ تخیل میں گہر رول رہا ہوں

مشتِ گل اور خیالات میں وسعت کتنی
کوئی چھونے بھی نہ پائے گا کنارا میرا

اصل ہے تو جہاں فقط عکس ترے جمال کا
پیشِ نظر ہے تو ہی تو عالمِ چار سو میں بس

ایثؔار صاحب کی شاعری میں تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا رنگ بھی شامل ہے ۔اس کے علاوہ اخلاقیات کے ان تمام اصولوں کی تعلیم بھی مضمر ہے، جس سے ایک بہترین زندگی کی تشکیل ہوسکتی ہے۔

چاہئے فکر رسا لذت ، گفتار کے ساتھ
چشمِ روشن بھی ہے واجب دل بیدار کے ساتھ

دے دے کے پیچ زلف کو سلجھا رہے ہیں وہ
گتھی سلجھ رہی ہے نشیب و فراز کی

ایثؔار نے اپنی غزلوں میں سیاسی وسماجی مسائل کی منظر کشی بھی بحسن وخوبی کی ہے۔غزل ابتداء ہی سے اپنے عہد سے متاثر ہوئی ہے۔حالانکہ غزل میں اس طرح کے مضامین کی گنجائش ابتداء میں کم رہی لیکن وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس نے ہر موضوع کو اپنے اندر جذب کرلیا۔مثال کے طور پر چند شعراء کے اشعار پیش ہیں:

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا ، گل اپنا باغباں اپنا
(مرزا مظہر جانِ جاناں)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
(غالؔب)

ایثؔار نے بھی اپنے کلام میں سیاسی وسماجی مسائل کو جگہ دی ہے۔اگر چہ ان کے اس قسم کے اشعار میں نعرے بازی نہیں ہے البتہ جذبات واحساسات کی شدت ضرور ہے جو دلوں کو متاثر کرتی ہے۔

آئے گئے زمانے بھی صدیاں گذر گئیں
کتنی حکومتیں ہوئیں قائم ، بکھر گئیں

بے پر کی آزادی کیسی ۔۔؟
پروالے کیوں کنجِ قفس میں

آئے گی پھر بہار بنے گی بہشت گوش
بلبل کی صحنِ باغ میں نغمہ سرائیاں

جہاں بھر میں ان کو حکومت کا سودا
ہے اصلاحِ عالم فقط اک بہانہ

ان کا کلام شگفتہ سلیس اور پر اثر ہے۔ان کے اشعار میں جہاں ان کے ہمہ جہت خیالات کا احساس ہوتا ہے وہیں یہ اشعار ان کی شخصیت اور ذہنی اور فکری وسعتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ان اشعار میں شعری محاسن اور زبان و بیان کے مناسب استعمال کا خوب خیال رکھا ہے۔

جو روشن دل کوئی رہبر میسر آئے ملت کو
تو سمجھو اپنی منزل ہے فقط اک دو قدم آگے

گل و لالہ میں مہہ و مہر میں، وہ کرشمہ ترا کوئی اور ہے

اسی رنگ و بو کے لباس میں مرا خوش قبا کوئی اور ہے

وہ جوسب کی آنکھ کا نور ہے، وہ جو سب کے دل کا سرور ہے
جو بہ جلوہ غیرتِ حور ہے وہ وہی ہے یا کوئی اور ہے

غزل میں شاعر کا نقطۂ نظر آفاقی ہوتے ہوئے بھی ذاتی ہوتا ہے۔ شاعر مظاہر قدرت اور حقائقِ زندگی کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ردو قبول، مشاہدہ، تجزیہ، تجربہ سب اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ ایثاؔر کی غزلیات میں بھی جا بجا زندگی کا عکس جھلکتا ہے۔ جب وہ واقعات اور حالات کو اپنی مرضی ومنشاء کے برخلاف دیکھتے ہیں تو محرومی، مایوسی، اور نارسائی کا احساس ان کے لئے تلخی اور خلش کا باعث بنتا ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر پیش آنے والے حوادث اور دنیا کے یہ تضادات انہیں تحیر اور تشکیک کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ کیفیاتِ غم کا ادراک کرتے ہوئے غم کو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے سازگار بناتے ہیں۔

دکھ سے فرصت؟ ہوا ایسا بھی
ہوتا اک دن کاش برس میں

ہیں ساتھ سبز و تر کے ہی ایثاؔر جو بھی ہیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

بجھا کے رکھ دیا ایثاؔر حادثات نے یوں
زباں والے بھی ہیں آج بے زباں کی طرح

ایثاؔر غم کی عمومی سطح سے اٹھ کر آفاقی سطح پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی ذات کا کرب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری تہذیب کا کرب دکھائی دیتا ہے۔ غزل کی شعری روایت میں یہ غم کبھی معاشرت وسماجی سطح پر ابھرتا ہے اور کبھی غمِ عشق کی شکل میں ڈھل کر زندگی کو نئے زاویے سے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یوسف حسن

خان اس سلسلے میں رقمطراز ہیں؛

''عشق بغیر غم تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا ۔بغیر ادراکِ غم انسانی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔غم کی دھیمی آنچ میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انہیں ان سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔''۱۵

ایثؔار چونکہ غور وفکر کے شاعر ہیں اس لئے انہوں نے اس جذبے کو مختلف شکلوں اور رنگوں میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ان کے یہاں غم خارجی عنصر سے زیادہ داخلی واردات ہے اور اسی واردات کو وہ زیست کی تفہیم کے لئے استعمال کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

تجربے تلخ بھی شیریں بھی ہیں جینے کو ضرور
بس کے رہنا ہے زمانے میں گل وخار کے ساتھ

طرح طرح کے یہاں دکھ ہیں جھیلنے کے لئے
پھر اس پہ کیا من وتو، کیوں یہ ذات پات چلو

جس کی ہیبت سے لرز جاتا ہے افلاک کا دل
میرے اشکوں میں ہے پوشیدہ وہ سیلاب ابھی

ایثؔار نے اپنے تجربات کو شاعری میں سمودیا ہے۔ان کی غزلوں میں مشاہدے،فکر اور ذاتی تجربوں سے حاصل کی ہوئی ایک کیفیت ملتی ہے۔انہیں زندگی اور اس کی اہمیت کا ادراک ہے۔انہوں نے فکر وآگہی سے اپنے شعری اسلوب کو جلا بخشی۔غیر مانوس الفاظ ومرکبات سے اجتناب کرتے ہوئے سادہ پر اسلوب اور رواں بحروں میں اپنے خیالات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

مرے جلتے ہوئے داغوں کو یوں ہی جلنے دے
چارہ گران سے ہے روشن مرا کاشانۂ دل

شکر صد شکر، ندامت سے کبھی سر نہ جھکا
سرفرازوں میں اٹھائے ہوئے سر آئے ہیں

ایثآر مشکلات سے بنتی ہے زندگی
جس کو دکھوں نے سان چڑھایا سنور گیا

کھلنے نہ پائیں گے وہ کبھی تا بروزحشر
کتنے ہیں راز دفن دلِ راز دار میں

اردو شاعری میں فارسی تراکیب کا استعمال ابتدائی دور سے ہی نظر آتا ہے۔ ولی کی غزلوں بڑی تعداد میں فارسی تراکیب موجود ہیں۔ان کے بعد نظیر کے زمانے تک اور عہدِ نظیر سے حالیہ دور تک تمام شعراء نے فارسی تراکیب کے استعمال میں نئی راہیں نکالی ہیں۔ غالب اور مومن اس میدان میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ایثآر نے بھی فارسی تراکیب کے استعمال سے اپنی غزلوں کو دلنشیں بنایا ہے۔اس ضمن میں چند اشعار پیش ہیں:

ہو گیا برقِ نظر ! خرمنِ ہستی سبھی خاک
میرے دامن میں پڑی اڑ کے بس اک چنگاری

آباد ہمیں سے ہے یہ کاشانۂ ہستی

اٹھ جائیں اگر ہم تو یہ دنیا نہ رہے گی

شہیدِ ناز کی تربت، امانت ہے محبت کی
وگرنہ پھونک کر وہ تودۂ گل رکھ دیا ہوتا

ہے چشمِ رند ساغر پر نگاہِ شیخ جنت پر
ابھی سے دیکھنا دونوں کا ہے حاصل ہتھیلی میں

جفائے دستِ گلچیں، خواری گل، قصۂ بلبل
زبانِ گنگ سے سب کچھ یہ سوکھے کھار کہتے ہیں

صبحِ جاں بخش ہے یوں عشوہ کناں از پس کوہ
ذہن میں جیسے کوئی شعر دلآرائے غزل

ایثارؔ نے آئینہ کی ردیف میں مطلع اور مقطع سمیت سات اشعار کی غزل کہی ہے۔ پوری غزل جا بجا فارسی ترکیبوں سے لبریز ہے۔ ملاحظہ ہو:

شیشہ زفیضِ جوہر سیماب آئینہ
عکسِ رخِ جمیل سے مہتاب آئینہ

تھا دن کو آفتاب کا ممنوں تو شب کو تھا
منت پذیر، کرمکِ شب تاب آئینہ

شاید نگاہ جلوہ بداماں ہے آج کل
شام وسحر ہے دیدۂ بےخواب آئینہ

ڈر ہے کہیں یہ تاب تجلی سے جل نہ جائے
پہلے ہی آب آب ہے بے آب آئینہ

ہے جلوہ ہائے صبح، ازل سے جو مستیز
پہلو میں ہے ہمارے وہ پرتاب آئینہ

ساقی ترے بغیر کہاں لطفِ مے کشی
جو ہر نگاہِ مست، مئے ناب آئینہ

ایثآر لفظ لفظ ہے تصویر زندگی
تیرے سخن کو کہتے ہیں احباب آئینہ

ایثآر نے اپنی غزلوں میں مختلف صنائع و بدائع کا استعمال بھی شگفتہ انداز میں کیا ہے۔صنائع بدائع کسی بھی کلام کا حسن ہیں۔ یہ اسی صورت میں کلام کے حسن کو دوبالا کر سکتے ہیں جب ان کا استعمال برمحل کیا جائے۔مولانا حالی شاعری میں استعمال کی جانے والی صنعتوں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''صنائع بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اگر معنی کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاری گری ظاہر کرنی چاہی

بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے پس صنائع کی پابندی اور
التزام سے تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً بچنا
چاہئے۔''٦ا

حالی نے صنائع بدائع کے استعمال سے مکمل منع نہیں کیا بلکہ صنعتوں کے بے جا استعمال کی مذمت کی ہے۔اصل میں صنعتوں کے استعمال کا مقصد کلام میں حسن پیدا کرنا اور لطافت میں اضافہ پیدا کرنا ہے۔بقول ڈاکٹر سید تقی عابدی:

''شاعری میں ایسے پیرایہ کا اظہار اور اسلوب بیان کا اہتمام
کرنا جو محض ادائے مطلب کے لئے ضروری نہیں بلکہ مزید حسن و
لطافت پیدا کرے صنعت کہلاتا ہے۔''۷ا

ایثؔار کے کلام میں موجود صنعتیں کلام میں حسن و لطافت اور معنویت میں اضافہ کرتی ہیں۔ایثؔار نے بھی اپنے اشعار میں تلمیحات کا سہارا لیا ہے۔چند مثالیں دیکھئے:

لہو کو جوش دیتی ہے صدا اللہ اکبر کی
بلالؓ کیفیت ہے آج تک باقی اذانوں میں

کہاں وہ یوسفِ گم گشتہ ، بتلاؤ کہاں ہو گا ؟
ابھی تک ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو کاروانوں میں

کیا کہیں دار نہیں طور نہیں
کوئی موسیٰؑ نہیں منصور نہیں

وہ شب جاڑے کی اور کچھ دور نار نور کا عالم

دلِ موسیٰ کی دھڑکن جیسے رقصِ طور کا عالم

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صنعتِ تضاد کے استعمال سے ایثآر نے اپنے کلام کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔متضاد الفاظ کے استعمال نے ایک طرف ہر مرحلے پر تصویر کے دونوں رخ روشن کئے ہیں تو دوسری جانب اس کے ذریعے حق اور باطل کے تصادم کو ابھارا گیا ہے۔غرض متضاد الفاظ کے ذریعے ایثآر نے زندگی کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔اس سلسلے میں یہ اشعار قابلِ ذکر ہیں:

نہ ہوتے ہم تو کبھی بحر و بر نہیں ہوتے
زمین ہے زیرِ قدم سر پہ آسمان ہوا

ناقص فنا پذیر ہے تکمیل کے لئے
تخریب بہرِ مقصدِ تعمیر دیکھنا

ہر رت الگ ہے رنگ جدا دن کا رات کا
جاری ہے ایک سلسلہ موت وحیات کا

شمع ایک ایثآر ساری ظلمتیں ڈھانے کو بس
کیوں حق و باطل میں آخر آشتی ہونے لگی

ہم آسماں سے دور نہ شمس و قمر سے دور
خود اپنی ذات رہ گئی اپنی نظر سے دور

صنعتِ سیاقتہ الاعداد کی مثالیں دیکھیں۔

وہی چار تنکے ہیں اب آشیانہ
وہ تخریب دیکھی یہ تعمیر دیکھو

سکوں سود دولتوں کی ایک دولت
یہ دشمن انتشارِ دل کہاں تک

نظر تھی سب کی اسی پر، عدو زمانہ رہا
جو شاخِ گل پہ دو اک روز آشیانہ رہا

ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے سارے زمانے میں
لاکھوں میں ایک بھی نہ سراپا ہنر ملا

ان غزلوں میں ''تجاہل عارفانہ'' کی صنعت بھی ایک کیف اور فنی لطافت پیدا کرتی ہے۔ ایثآر حقیقت جانتے ہوئے بھی اس طرح دریافت کرتے ہیں گویا انہیں اس سلسلے میں کچھ بھی علم نہیں۔ یہ انداز ان کی غزلوں کو فنی چاشنی اور جاذبیت بخشتا ہے۔ یہ صنعت ایثآر کے کلام میں کہیں طنزیہ شکل میں تو کہیں استعجاب کی وصورت میں نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اشعار توجہ کے لائق ہیں۔

آئے گئے، نہ نام نہ کوئی نشان ہے
کیا زندگی یہی ہے، یہی اس کی شان ہے؟

اُف یہ گر گر کے سنبھلنا بھی سنبھل کر گرنا
کیا بتائے گا کوئی قسمتِ راہی کیا ہے؟

تہمتیں ہیں یہ مقدر کی وگرنہ ایثآر
مفت بدنام ہو کیوں تم نے کیا ہی کیا ہے؟

خاکے دنیائے کواکب نے سجائے کیا کیا
سر اٹھاتا ہوں تو کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

ایثآرصاحب کے کلام میں تشبیہہ اور استعارے کا موزوں اور معتدل استعمال ملتا ہے۔تشبیہہ واستعارے کے ذریعے کلام میں معنی آفرینی،حسن آفرینی اوراختصار کا کام لیا جاتا ہے۔ایثآر کے ہاں روایتی تشبیہات بھی مستعمل ہیں۔انہوں نے ایک عمدہ فنکار کی طرح اپنے فن میں لطافت اور معنوی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ایثآر کے اشعار مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے کافی پراثر ہیں۔چند مثالیں دیکھیں:

وہ ہتھیلی کی سطح پر رخسار
رحل پر جوں کتاب کا عالم

رخِ رنگیں پر انفعال سبھی
اوس میں جوں گلاب کا عالم

لبِ لعلیں کی مسکراہٹ میں
جیسے موجِ شراب کا عالم

مخمل پہ موتیوں کا جڑاؤ ہے یا کہ اوس
یا شب چراغ چراغ کے تارے ہیں خواب مست

اردو غزل کا علامتی نظام اگر چہ مختصر ہے لیکن ان علائم کے ذریعے ہر شاعر نے اشعار کہے ہیں۔ غزل میں عام طور پر گل و بلبل، صیاد، دام، قفس، آشیانہ، برق، اسیری، آزادی، بہار خزاں، جام، ساغر وغیرہ علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ ایثآر نے بھی ان علامتوں کا استعمال اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

نظر تھی سب کی اسی پر، عدو زمانہ رہا
جو شاخِ گل پہ دو اک روز آشیانہ رہا

بہار و مطرب و ساقی تھے، مے تھی اور ہم تھے
گذر گیا وہ زمانہ، بس اک فسانہ رہا

بلبل چمن میں اور کبوتر فضاؤں میں
ہے تاک باندھے صید کو خونیں عقاب مست

نصیب ان کے خرابے، اور ان کو باغ و بہار چلے
عجیب ڈھنگ سے دنیا کے کاروبار چلے

شفق پھولی ہوئی ہے گل ہیں خنداں صحنِ گلشن میں
عجب دل کش نظارہ ہے فلک رنگیں زمیں رنگیں

چمن کی خیر ہو، اہلِ چمن کی خیر ہو یارب!
جو انہونی کا کھٹکا تھا، سو ہے دل سے نہیں نکلا

اردو شاعری میں بادہ وساغر کے مضامین کو ابتداء ہی سے بڑی اہمیت و مقبولیت حاصل رہی ہے۔ ان مضامین میں کبھی رندی و سرمتی کی کیفیت بیان کی جاتی ہے تو کبھی ان کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہوا کرتی ہے۔ بعض شعراء نے خمریات کو ایک رنگ کی حیثیت سے اپنایا ہے، باوجود ان کے یہاں شراب نوشی کا کوئی عملی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی طرح بعض شعراء کے یہاں گل و بلبل کی داستان، مے و میخانہ کی داستان بڑی حد تک علامتی حیثیت رکھتی ہے ایثآر کی غزلوں میں بھی خمریہ اشعار بھی جا بجا موجود ہیں۔ انہوں نے میکدہ، ساقی، مے، خم، صراحی، بادہ، وغیرہ کو روایتی انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہ الفاظ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں اپنے اصل معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور کہیں استعاراتی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کوئی مسجد نہیں یہ دیر نہیں
میکدہ ہے یہاں تو بیر نہیں

نگاہِ مستِ ساقی سے ہے طاری بزم پر مستی
ہے عکسِ روئے تاباں سے شرابِ آتشیں رنگیں

ساقی ترے بغیر کہاں لطفِ مے کشی
جو ہر نگاہِ مست ، مئے ناب آئینہ

گر پلانی ہو پلا مست نگاہوں کی ہمیں
پیاس بجھتی نہیں ساقی ترے پیمانوں سے

بادہ رندوں کی طلب تشنۂ دیدار کو بس
مست آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے دو

رہنے دو حشر ونشر کی کل، آج بزم میں
دو رِ شراب و ساقی و میخانہ چاہئے

ایثاؔر کی غزلوں میں جا بجا محاوروں اور ضرب المثل کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مثلاً چند اشعار دیکھیں:

ہوگا جو لہو خشک تو تھم جائیں گے آنسو
اک روز یہ طغیانیِ دریا نہ رہے گی

تازگیِ دل و جاں ، زندہ سخن کا اعجاز
مات کھانے کا نشاں شعرِ غم افزائے غزل

اک ستارہ آسماں میں تھا شہاب ہوگیا
دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیسے خواب ہوگیا

ڈوبتے کو سہارا اک تنکے کا آبجو میں بس
بھٹکی ہوئی کوئی کرن ظلمتِ چارسو میں بس

عرضِ احوال ظاہری کیا ہے
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

کالی راتیں کٹھن سہی لیکن
چار دن چاندنی بھی دیکھی ہے

ان اشعار میں،نظر لگنا،دل ڈوبنا ،مات کھانا،آنکھیں چرانا،نظریں چرانا،لہوخشک ہونا،ڈوبتے کو سہارے کا تنکا،ہاتھ کنگن کو آرسی کیا جیسے روزمرہ محاوروں کے استعمال سے نہ صرف ان اشعار کی جاذب نظری اورحسن میں اضافہ ہوا ہے۔بلکہ ان میں معنی آفرینی،تاثیراور گہرائی پیدا ہوگئی ہے یوں لگتا ہے کہ یہ محاورے بے ساختگی کے ساتھ شاعر کے خیال میں شامل ہوگئے ہیں۔

ایثارؔ کی غزلوں میں لب ولہجہ کوخصوصی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں جا بجا مکالماتی اور استفہامیہ انداز اختیار کیا ہے۔اور اس اندازِ بیاں کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ڈرامائی عنصر پیدا ہوگیا ہے۔جس سے ان کی فنی پختگی اور زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں:

اے دلِ مایوس گر کوشش عبث ہے صبر کر
ہائے ناشدنی تو کیا اتنا بھی کرسکتا نہیں؟

یہ پانے کی خوشی،کھونے کا غم کیوں
ہے آخر حاصلِ سود و زیاں کیا؟

اُف یہ گرگر کے سنبھلنا بھی سنبھل کر گرنا
کیا بتائے گا کوئی قسمتِ راہی کیا ہے؟

کیا حالِ دل اغیار پہ ہوسکتا تھا روشن؟
پوشیدہ ان اشکوں میں ہی غماز ہے کوئی

یہ دودن کی بہارِ بوستاں کیا؟
نہ ہو پائندہ جوایسا جہاں کیا؟

شاعری میں لفظی تکرار اگر غیر فنی انداز کا حامل ہوتا سے معیوب سمجھا جا تا ہے۔ کیونکہ محض تکرار ذہنی تھکن کا باعث بنتا ہے البتہ اگر ہنرورانہ توازن کے ساتھ اسے برتا جائے تو کلام میں دلکشی محسوس ہوتی ہے۔اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ایثارؔ کے کلام میں موجود اس لفظی تکرار سے مفہوم کی ہمہ گیریت اورتاثرات میں گہرائی نظر آتی ہے۔ایثارؔ نے جذبات کوفنی ضبط میں لانے کے لئے الفاظ کی تکرار کا سہارالیا ہے۔لیکن ان کے شاعرانہ ذوق کی خوبی یہ ہے کہ اگر کسی بھی شعر یا مصرعے سے تکرار کیا گیا ایک لفظ بھی ہٹا دیا جائے تو نہ صرف مفہوم نامکمل رہتا ہے بلکہ شاعری کا مجموعی حسن بھی متاثر ہوجا تا ہے۔

راہِ منزل گام گام ،لمحہ لمحہ دن کٹیں
زندگی کا پیمانہ بھرتے بھرتے بھر گیا

زندگی میں پیش پیش آئیں کتنی دقتیں
ہوش تھے ٹھکانے پر دل کا سارا ڈر گیا

پانی پانی صحرا میں چارسو نظر آیا
پیاس لے گئی وہاں تو سب سراب ہوگیا

تکتے تکتے چرخ کو آنکھ کیسے لگ گئی
چاندنی میں خواب خود جوں نقاب ہوگیا

آسمان ایثارؔ کی کثیر الاستعمال علامت ہے چونکہ آسمان بلندی، رفعت، روشن خیالی اور وسعت کی بھی علامت ہے لہذا ان کی شاعری میں یہ علامت اپنے معنوی پھیلاؤ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے

جیسے زمین اور آسمان کی وسعتوں کے درمیان وہ اپنی زندگی کی معنویت کی تلاش میں مشغول ہیں۔اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں:

فکرِ سخن میں رفعتِ افلاک چاہئے
لے آئیں گے زمینِ غزل آسماں سے ہم

آسماں سے چاند تاروں کو بھی لائیں توڑ کے
فکر کے ناخن سے وا ہر عقدہ مشکل کریں

ہم آسماں سے دور نہ شمس وقمر سے دور
خود اپنی ذات رہ گئی اپنی نظر سے دور

چھو لیں جو آسماں کی بلندی بھی کیا ہوا
اک آسماں کے سر پہ دگر آسمان ہے

زمیں اگلے گی سونا، آسماں موتی لٹائے گا
جہاں جو بھی خدا چاہا، وہاں کیا کچھ نہیں نکلا

ایثؔار کی شاعری کا ایک اور فنی وصف سہل الممتنع ہے۔اس مجموعے میں ایسے کئی اشعار ملتے ہیں جو دیکھنے میں بے حد سادہ اور آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن اپنی تخلیق میں فنی کرب اور قادرالکلامی کے متقاضی ہیں۔سادگی میں پرکاری اور پرکاری میں سادگی کا یہی انداز ایثؔار کی شاعری کو پرکشش بنادیتے ہیں۔

دل کا آئینہ بات بات مری

لوگ کہتے ہیں میں خیالی ہوں

کس کو خبر نگاہوں میں ہے جادوئی اثر
نظریں ہوئیں جو چار تو دل میں اتر گئیں

تمہیں سے زیست کے دھارے رواں ہیں
تم ہی روحِ رواں، جوشِ جواں ہو

ایثارؔ کی شاعری اگرچہ مجموعی اعتبار سے تخلیقی کیفیتوں سے سرشار ہے۔لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے متقدمین اردو شعراء کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے۔ان کے کلام میں اپنے پیش روؤں کے خیالات کی بازگشت کہیں ہو بہو تو کہیں معمولی ترمیم اور اضافے کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔اپنے پیش روؤں میں ایثارؔ غالب اور اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔غالب اور اقبال کے خیالات کا پرتو کہیں ہلکے تو کہیں گہرے رنگ میں نظر آتا ہے۔لفظ اور خیال کے انعکاس کا یہ سلسلہ ان کے یہاں کبھی بندشوں اور تراکیب کی صورت میں تو کہیں مضامین اور زمین کی صورت میں نظر آتا ہے۔انہوں نے غالب کی زمین میں بڑی خوبصورت غزل کہی ہے۔ملاحظہ ہو:

سو رنگ میں اک جلوہ ہے پیدا مرے آگے
کثرت میں ہے وحدت کا تماشا مرے آگے

جب تک نہ کھلی آنکھ فقط ذرہ تھا ذرہ
جانچے سے تھا کونین کا نقشہ مرے آگے

اک قطرہ سا قطرہ ہے سمندر سا سمندر

کیا طرفہ تماشا ہے خدایا مرے آگے

انداز ِتکلم ہے خموشی سے نمایاں
پوشیدہ صدائیں بھی ہیں پیدا مرے آگے

اس یاس کی شدت میں بھی امید کی کرنیں
پیدا ہے اندھیروں کا اجالا مرے آگے

آبفشار کی غزلیں فنی محاسن سے مالا مال ہیں۔ان کا بنیادی حسن اور فنی خوبی اظہارِ بیان کی سادگی و پاکیزگی ہے۔ان غزلوں میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور مشکل سے مشکل بات کو بھی اس مہارت سے بیان کیا گیا ہے کہ موضوع کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور بے کیفی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صبر کا ایک پہاڑ ہے یا دل
قطرۂ خوں ہے یا کہ دریا دل

وسعتِ دو جہاں اور اتنا دل!
کچھ سمجھ میں نہ آئے ہے کیا دل

جلوہ پاشی ہے صبحِ نو کی ادھر
شب کی چادر اتار دیکھ سکوں

چھونا فلک کو حوصلہ مندی کی بات ہے

آہیں جو عرش پر گئیں بے بال و پر گئیں

ان غزلوں کا ایک اور فنی پہلو منظر کشی ہے۔ ایثآر موزوں ومناسب الفاظ کے استعمال سے خارجی مناظر کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات کی داخلی اور پیچیدہ تصویریں اس ہنر مندی سے کھینچتے ہیں کہ وہ ذہن اور آنکھوں کے پردے میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ مصوری کا یہ عمل ایک طرف ان کے نظریاتی موقف کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے مشاہدے کی قوت اور جمالیاتی ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

وہ ہیں دور گو جیسے چاند آسماں پر
نگاہوں سے بوسے لیے جارہے ہیں

شفق آلودہ لبوں پر وہ ہنسی کیا آئی
چمنستانِ تمنا کی سحر بن کے رہی

غبارِ قیس آوارہ ابھی تک ہے بیاباں میں
بگولہ بن کے اے لیلیٰ! لپٹ جائے نہ محمل سے

ایثآر کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر اور فن بتدریج ارتقاء کی طرف گامزن رہا ہے۔ اور یہ کہ تخلیقی شاعری کے ہر عہد میں وہ فنی استحسان کے حصول کی طرف مائل بہ پرواز رہے ہیں۔ اور اسی طرح وہ فکری خام کاریوں سے ہر موڑ پر شعوری انحراف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری معائب سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اور اسی سبب آبفشار کی غزلوں کا ایک معقول حصہ معیاری شاعری کے ذیل میں آتا ہے۔ ایثآر زندگی اور فن دونوں میں ترقی اور ارتقاء کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تساہل اور جمود نہ صرف زندگی کو بے معنی بنا دیتا ہے بلکہ فن کو غیر موثر کر دیتا ہے۔ اس بنیاد پر وہ زندگی اور فن کے بدلتے

تقاضوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ضروری مواقعوں پر ان میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں ۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری فنی اور فکری سطح پر ہر آن بدلتی کیفیتوں سے سرشار ہوتی ہیں مگر یہ کیفیتیں فکری تعارض کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مسلسل ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ان کے کلام میں مختلف دل کو چھو لینے والے ایسے مثالی پہلو ہیں جن کے مطالعے سے طمانیت حاصل ہوتی ہے ۔ان کا لب ولہجہ،عشقیہ موضوعات، سیاسی وسماجی حالات کا جاگتا ہوا شعور، سوز وگداز کی کیفیت، شدتِ احساس کی کارفرمائی، کلاسیکیت ، رجائیت، علامتوں اور اشاروں کا برمحل استعمال ایک ایک مصرعے سے جھلکتا ہے ۔انہوں نے اردو شاعری کو نئے الفاظ نہیں دیئے لیکن ان کی غزلوں میں روایتی الفاظ،موسم ، بہار،گل ،صیاد،خزاں ، بہار،شام ،صبا ،سحر،گلچیں،شبنم ، بادہ و ساغر، زنجیر قبا، دشت ، زنداں ، ہجر ، وصال ،لہو،فراق جیسے الفاظ و پیکر نئے علامتی معنی ومفہوم پیدا کرتے ہیں ۔انہوں نے ان الفاظ کا استعمال پوری فنکارانہ چابکدستی سے کیا ہے ۔منفرد زبان وبیان ، پرتمکنت لہجے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں وہ سادگی اور پرکاری بھی ملتی ہے جو انہیں دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے ۔

نظم گوئی

نظم کے لفظی معنی ’موتی پرونے‘ کے ہیں۔شاعری میں کلامِ موضوع کو نظم کہتے ہیں جس میں شعری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی خاص موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔بقول وزیر آغا:

”جس طرح ہر ذی روح کی اپنی ایک صورت اور مزاج ہوتا ہے، جو اسے دوسروں سے الگ اور جدا کرتا ہے، بالکل اسی طرح ہر صنف ادب اپنی ہئیت ،خوشبو اور مزاج کے باعث دوسری اصناف سے مختلف ہوتی ہے۔“ [۱۸]

نظم بھی اپنے مزاج ،ہئیت اور اپنی خوشبو سے پہچانی جاتی ہے۔یہ ایک ایسا تخلیقی اظہار ہے جس میں وزن ،بحر،تشبیہہ ،استعارہ ،اشارہ وکنایہ سے شاعر حسبِ ضرورت کام لیتا ہے۔یہ بے پناہ وسعت کی حامل ہے۔اس کے موضوعات لامحدود ہیں۔نظم میں بیان کردہ موضوع میں مجموعی وحدت اور آہنگ بنیادی شرط ہے۔موضوعات کی رنگا رنگی،تنوع،خیال کے تسلسل اور فکر کی مرکزیت کی بنا پر اصنافِ شاعری میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔اس صنف سخن کو ہی یہ اہمیت حاصل ہے کہ حالی جیسے نقاد نے سب سے بہتر صنف کے طور پر متعارف کرایا ہے۔اور مشہور گیت نگار عظمت اللہ خاں نے بھی اس صنف کی حد درجہ حمایت کی ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے خیال میں:

”نظم قوس قزح ہے جس میں کئی رنگ ملتے ہیں مگر ملکر ایک ہی روپ میں ڈھل جاتے ہیں اس کا کوئی اشارہ بے ربط اور کوئی خیال بے ترتیب نہیں ہوتا ،اس کی ساری کڑیاں ایک ہی مرکز ایک ہی خیال کی طرف لے جاتی ہیں۔نظم خیالات وجذبات کا

ایک زینہ ہے جس کی سیڑھی بلندی سے نزدیک ہوتی جاتی ہے۔''۱۹

پروفیسر احتشام حسین نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو اس کے لئے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ اس کی ہئیت ہی متعین ہے۔ایسی نظموں کی ایک علیحدہ حیثیت اور تاریخ ہے جیسے مرثیہ، مثنوی، اور قصیدہ، رباعی وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جس کا کوئی متعین موضوع ہو اور جس میں بیانیہ ،فلسفیانہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی یا دونوں قسم کے تاثرات پیش کئے ہوں۔''۲۰

غرض نظم ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں کسی متعین موضوع پر مربوط طریقہ سے اظہارِ خیال کیا گیا ہو اور خارجی ماحول اور زندگی کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ شاعر کے ذاتی تجربات اور انفرادی جذبات اور مخصوص نظریات بھی واضح ہو جائیں ۔ایک منفرد اور باقاعدہ صنفِ سخن ہونے کی حیثیت سے اپنے مخصوص معیارات اور امتیازات رکھتی ہے۔نظم کی اس جداگانہ حیثیت کو شعوری طور پر انجمن پنجاب کے مشاعروں میں تسلیم کیا گیا۔اس حوالے سے محمد حسن رقمطراز ہیں:

''نظم نگاری ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ۱۸۷۴ میں انجمن پنجاب کے مشاعرے سے وجود میں آئی۔ظاہر ہے کہ اس

سے قبل بھی ایک شعری پیکر کا وجود کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا
تھا۔جس میں ایک خیال اور تاثر کو مربوط طریقے سے بیان کیا جا
سکے۔کبھی مثنوی کے مختلف اجزاء،کبھی مرثیے کے بند کبھی غزل
مسلسل،کبھی اشعار،اور کبھی ترجیح بند اور ترکیب بند کی شکلوں میں
اس قسم کے مربوط تاثر پارے اردو شاعری کے ابتدائی دور سے
موجود ہیں۔''۲۱

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اگر دکنی دور کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو اردو شاعری اور اردو نظم ہم قدم و
ہم عمر نظر آتی ہے۔اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں مختلف تقریبات و
رسومات پر جو لکھا گیا ہے وہ نظم میں شمار کیا جاتا ہے۔اسی طرح اردو کے طفولیت کے دور میں محمد افضل جھنجھانوی
نے جو'' بکٹ کہانی ''لکھی اسے محمود شیرانی نے نظم قرار دیا ہے۔شمالی ہند میں جعفر زٹلی نے اپنے عہد کے مسائل
کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا۔اٹھارویں صدی میں شاہ حاتم اور فائز دہلوی نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو
عروج بخشا۔نیز فائز دہلوی کو اردو کا پہلا نظم نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اٹھارہویں صدی کے نصف
آخر میں نظیر اکبر آبادی نے نظم کو ایک خالص صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کرایا۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی
اردو ادب کے افق پر وہ بنیادی تبدیلیاں لے کر آئی جس نے سوچ کے سارے انداز بدل دیے۔ان نئی
سوچوں،خیالات اور احساسات کے اظہار کے لئے غزل کے برعکس نظم میں زیادہ جاذبیت نظر آئی۔اس جنگِ
آزادی نے جہاں اردو شعر و ادب کو متاثر کیا وہیں سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک میں ادب نے ایک ذریعہ
کی حیثیت اختیار کی۔حالؔی نے اردو شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی وہیں۔مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب
کے مشاعرے میں غزل کے مصرع طرح کے بجائے موضوعاتی نظم نگاری کو رواج دیا۔اس ضمن میں حالؔی
رقمطراز ہیں:

''لاہور میں کرنل ہالرائیڈ،ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب
کے ایماء سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو

پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان
میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے
مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر
اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔''۲۲؎

مولانا حالؔی نے بھی اس مشاعرے میں موضوعاتی نظمیں پڑھیں نیز مسدس مدو جزر اسلام جیسی طویل نظم لکھ کر اردو نظم کو قبول عام کے درجے پر فائز کرنے کی سعی مشکور کی۔حالی کی طرح مولانا شبلی نے بھی نظم ہی کو ذریعہ اظہار بنایا۔حالؔی نے اخلاقی مضامین کو اہمیت دی جب کہ آزاد نے نیچرل شاعری کو مقبول بنانے پر زور دیا اور شبلؔی نے داخلیت کے باوجود تاریخی حقائق کا سہارا لیا۔اس اختلاف کے باوجود آزادؔ، حالؔی، شبلؔی اور اس دور کے دوسرے شعراء کی نظموں کے ذریعے اردو نظم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی رقمطراز ہیں:

''حالؔی اور آزادؔ کی نظمیں اردو شاعری کے نئے موڑ کی نشاندہی
کرتی ہیں۔''۲۳؎

اسی رو میں اکبر الہٰ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ وظریفانہ اسلوب سے اردو نظم کی آبیاری کی۔انیسویں صدی کے آخر میں علامہ اقبال نے اکبر اور حالؔی کی روایت کو آگے بڑھایا۔انھوں نے فکری اور فنی سطح پر نظم کو اس معراج سے آشنا کروایا جس کا شاعری میں اس سے پہلے شعور بھی نہ تھا۔تاہم انہوں نے مغربی شاعری کے طرز احساس اور طرزِ اظہار کو بہتر انداز میں سمجھا۔چونکہ اقبال کا مطالعہ وسیع تھا وہ عالم اسلام کو در پیش مسائل سے بخوبی آگاہ تھے اور فلسفے کو شعری قالب میں ڈھالنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے نظم کو ذات سے کائنات تک پھیلا دیا۔اقبال نے ہی نظم کو استحکام اور اعتبار بخشا۔نظم نگاری کے میدان میں اقبال کی انفرادیت کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

''اردو نظم میں اقبال کی حیثیت ایک موڑ کی سی ہے۔وہ نظم کے

کلاسیکی اور رومانی دور کے سنگم پر ایستادہ ہے۔اس کے ہاں
کلاسیکیت کا انضباط رکھ رکھاؤ اور تنظیم بھی ہے اور رومانیت کا
تحرک داخلیت پسندی اور ہیجان بھی'' ۲۴؎

اقبالؔ ہی کے دور میں دیگر نامور شعراء، جیسے اسماعیل میرٹھی، خوشی محمد ناظر، مولانا ظفر علی خان، درگا سہائے سرور، غلام بھیک نیرنگ، عظمت اللہ خاں، نظم طباطبائی، برج نرائن چکبست، عبدالحلیم شرر بھی اردو نظم کی آبیاری میں مصروف تھے۔ان کے بعد ترقی پسند نظم گو شعراء نے اپنی بنیادیں مستحکم کیں۔اس تحریک کے زیر اثر شعراء نے سماج کے درپیش مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔انہوں نے اپنی نظموں میں طبقاتی کشمکش ،انسانی دوستی، ملک کی آزادی ،اور دیگر معاشرتی مسائل کی عکاسی کی ۔ترقی پسند تحریک سے باضابطہ طور پر منسلک رہنے والے شعراء میں، مجاز، کیفی اعظمی ،فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، جاں نثار اخترؔ ،ساحر لدھیانوی قابلِ ذکر ہیں۔ان شاعروں کے یہاں سیاسی وسماجی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے پیدا ہونے والی صورت حال کا عکس پورے آب وتاب سے دکھائی دیتا ہے۔دوسری طرف حلقۂ اربابِ ذوق اور جدید مغربی شعرو فلسفہ سے وابستہ شاعروں نے آزاد نظم کے سانچوں کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔اردو نظم میں نئی طرزِ فکر اور جدید طرزِ اظہار کا رویہ جڑ پکڑنے لگا زبان کا دائرہ اپنے پیش روؤں سے کسی قدر وسیع ہوگیا۔زبان کے مروجہ سانچے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ۔اور شاعری کی زبان پہلے سے کہیں زیادہ لچک دار اور اپنے اندر کئی معنوی امکان رکھنے لگی۔ہئیت کے نت نئے تجربوں نے اردو نظم کی تاریخ کو نئے اثاثوں سے معمور کیا۔ن۔م راشد، میرا جی، ضیا جالندھری، بلراج کومل، اعجاز فاروقی جیسے شعراء نے نئی نظم کو فروغ بخشا۔

ایثارؔ کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۰ء سے ہوتا ہے۔انہوں نے نظمیں کہیں اور اپنے انداز سے کہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں حیات وکائنات کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کیا ساتھ ہی وارداتِ قلبی، مختلف خیالات واحساسات کے دھندلکوں کو اپنا موضوع بنایا۔ان کی نظموں کا آہنگ مجموعی طور پر مسحور کن ہے جن کا تاثر اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ قاری اس نظم کی فضا میں پوری طرح ڈوب جاتا ہے۔آبفشار شعری مجموعہ میں ایثارؔ کی کل ۴۰ نظمیں ہیں۔یہ نظمیں ان کے سچے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ان کی نظموں میں مختلف النوع موضوعات ملتے ہیں

جہاں قومی، ملی، سماجی نظمیں ہیں وہیں ایسی نظمیں بھی ہیں جو کسی خاص مقصد کے پیش نظر لکھی گئیں۔ اور ایسی نظمیں بھی ہیں جو کسی وقتی حادثے یا واقع کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی نظموں میں فراوانی جذبات، تاثیر، خلوص اور صداقت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری ذات و کائنات کے تمام خوبصورت رنگوں، احساسات و تاثرات کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کے سوتے ان کے ذاتی مشاہدے اور تجربات کے نظامِ فکر سے پھوٹتے ہیں۔ غرض ایثؔار نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ کر اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ذیل میں ان کی مختلف و متنوع موضوعات پر مشتمل نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ادب اور فطرت کا باہمی تعلق ہے۔ اس لئے دنیا کے ہر ادب میں فطرت کی جھلک موجود ہے۔ شعراء نے فطرت کی مختلف اشیاء پر براہِ راست نظمیں کہی ہیں۔ مثلاً پہاڑ، دریا، جھیل، سورج چاند ستارے وغیرہ۔ ایثؔار نے اپنے اردگرد پھیلی وسیع کائنات کا بغور مطالعہ کیا۔ حسنِ فطرت کے رنگ برنگی جلوؤں کو بھرپور نظر سے دیکھا اس کی دلفریبیوں سے حظ اٹھایا۔ انھوں نے فطرت کے حسن کی حقیقت و ماہیئت کو سمجھنے کے لئے غور و فکر سے کام لیا۔ ''ملناڈ کی جھلکیاں'' یہ نظم حسین مناظرِ فطرت کی تصویر کشی اور تشبیہات و استعارات کا نہایت حسین و جمیل مرقع ہے۔ جس میں انہوں نے ملناڈ کی تہذیبی، ثقافتی اور جذباتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری کی جو خصوصیات نمایاں ہے وہ یہ کہ اس میں نہ صرف مخصوص مناظر کی متحرک تصویریں نظر آتی ہیں بلکہ اس خاص فضا کے تاثرات بھی قاری کے احساس پر محیط ہو جاتے ہیں اور یہی منظر نگاری کا کمال ہے۔ اس نظم کا آغاز بہت دلچسپ اور توجہ طلب ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار ذہنی طور پر مستعد کر دیتے ہیں۔ ان اشعار سے شاعر کی جذباتی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

کھو گئے کتنے فسانے وقت کی رفتار میں
لوحِ دل پر رہ گئیں کچھ جھلکیاں آثار میں
لے چل اے زورِ تخیل مجھ کو ماضی کی طرف
پیش کرنا ہے مجھے گلدستہ اک اشعار میں

شاعر قدرتی حسن کا سب سے زیادہ مداح ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی قدر و قیمت کو بہت گہرائی سے

سمجھتا ہے۔اس کی نظر فطرت کے تمام اسرار و رموز پر رہتی ہے۔اور وہ نظم کے ذریعے اس حسین منظر کو بہت دل آویز پیرائے میں سپردِ قلم کر دیتا ہے۔اسی طرح ایثار ان تمام مناظر کو جن کے بیچ وہ رہے اپنی شاعری میں پرو دیتے ہیں۔ایثار کا مشاہدۂ فطرت نہایت عمیق ہے فطرت کی یہ خوبصورتی اس وقت اور بھی دلفریب ہو جاتی ہے جب ایثار اسے تشبیہات اور استعارات کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔

روشنی دو چار قندیلوں کی رستہ کا نشاں
جگنوؤں کی ہر طرف پرواز میں چنگاریاں
ٹمٹماتی کچھ گھروں میں لالٹینیں ، بتیاں
شب کو عالم ہو کا اس میں مست ہاتھی کی چنگھاڑ
یا گرج شیرِ ژیاں کی جس سے گونجے آسماں
سست پا جاڑے کی راتیں اور سحر کا انتظار
چین کیا جانے بھلا فکرِ سفر میں میہماں
آتے جاتے چاند کے چہرے پہ رہ رہ کر نقاب
تیرتے دوشِ ہوا پر بدلیوں کے کارواں
اوس کی ٹپ ٹپ تھی گویا صبح کاذب کا پیام
سبزہ تر ، سطحِ زمیں نم ، دھند سے عالم دھواں
چڑھتے سورج ، ڈھلتے دن کی جاذبیت جانفزا
صبح کو اک رنگ دیگر ، دوپہر دیگر سماں

ان کی نظموں میں اظہار کی ہنرمندی اور معنویت کی تہہ داری محسوس ہوتی ہے۔مناظرِ فطرت کا حسن ان کے داخلی احساس کا عکس بن کر سامنے آتا ہے۔وہ اپنے مطالعہ میں ان دقیق چیزوں کو بھی دیکھنے پر قادر ہیں جنہیں ایک عام انسان اپنے مشاہدے میں ہونے کے باوجود نہیں دیکھ سکتا۔اس نظم کے ذریعے ایثار کے جمالیاتی احساس اور قوتِ مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے فطرت کے خارجی حسن کو تشبیہات اور

استعارات کی مدد سے اس دلکش انداز میں کھینچا ہے کہ مناظر میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔صبح کی منظرکشی انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

وہ سنہری صبح کا کھلنا نہا کر اوس سے
سیٹیاں شاما کی نغمے بلبلوں کے رس بھرے
اک حنائی ہاتھ میں لعل یمن سا آفتاب
یا جبینِ غازہ پرور پر کہیں ٹیکا جسے
دور جنگل میں کہیں ٹھن ٹھن تبرزن کی صدا
منہ اندھیرے آ گئے کچھ لکڑی کاٹنے
ٹیڑھے میڑھے راست قد، کچھ ٹھگنے، اونچے درخت
بانس بنگلے، دوڑتی پگڈنڈیاں اوپر تلے
سرسراہٹ، پھڑ پھڑاہٹ، ہر قدم پر چونکنا
مرغ و مور و مار پر سب کی نظر چلتے ہوئے

ایثاؔر نے مناظرِ قدرت کا بڑے ہی انہماک و دلچسپی سے مشاہدہ کیا ہے۔اور اپنے مشاہدات کو بڑے ہی خلوص کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔یہ نظم فطرت کے ظاہری اور خارجی پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔اس پوری نظم میں ایک متحرک فضا قائم ہے۔جس میں فطرت جامد یا ساکت نہیں بلکہ اس میں زندگی کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ایثاؔر قدرت کے حسین وجمیل مناظر سے راحت وسکون محسوس کرتے ہیں۔انھوں نے ملناڈ جیسے خوبصورت شہر سے اپنی جذباتی اور روحانی وابستگی کا اظہار اس انداز میں کیا ہے:

شان میدانوں کی ہے ملناڈ ہی سے برقرار
بستیاں، آبادیاں گویا ہیں جنت در کنار
تیرتی دریا بہ داماں وہ فضا میں بدلیاں
چل کے برسیں گی کریں گی خسکیوں کو سبزہ زار

ان سے پانی کے ذخیرے ان سے جھرنوں کا وجود
ہے اسی پانی پہ ساری زندگی کا انحصار
وہ گھنا جاگر کا جنگل دل کشا و جاں فزا
آج تک ہے ثبت میرے ذہن پر اس کا نکھار
چاندنی میں چارسو باغوں میں بکھری کہکشاں
اجلے اجلے پھول، کافی کے نگارانِ بہار
یہ ہیں میدان کی ضرورت آبرو ملناڈ کی
شاد یہ باغات، یہ فصلیں، فصیلِ کوہسار
تا ابد باقی رہیں ملناڈ و میداں سنگ سنگ
یہ چمن یہ غنچہ و گل، یہ بہارِ رنگ رنگ

فطرت سے قدرتی لگاؤ اور شاعری میں اس کے استعمال نے ایثارؔ کے لہجے اور انداز کو ایک نیا رنگ دیا۔انھوں نے جذبات، احساسات اور مناظر کے امتزاج کو اس مہارت سے پیش کیا ہے اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ان کی اس نظم میں فطرت کے تمام رنگ تمام تر دل آویزی کے ساتھ موجود ہیں۔انہوں نے اس نظم میں شعری پیکر کی مدد سے ایسی جیتی جاگتی فضا قائم کی ہے کہ ہر چیز متحرک نظر آتی ہے۔وہ الفاظ کی اہمیت و افادیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اسی لئے ان کے ذریعے محض خیالات ہی کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان میں موجود پوشیدہ معنی کی مختلف جہتوں کو بروئے کار لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

فطرت نگاری کے ساتھ منظر نگاری میں بھی ایثارؔ قدرت رکھتے ہیں۔وہ مناظر کی جزئیات کو اس باریکی سے بیان کرتے ہیں منظر آنکھوں کے سامنے ہو بہو پھر جاتا ہے۔وہ حسین مناظر کو دیکھ کر محض لطف اندوز ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے تخیل کی مدد سے اس منظر کو حسین اور دلکش ترین بنا دیتے ہیں۔وہ ایک ایسے ماہر مصور ہیں جن کے نگار خانے میں منظر نگاری و فطرت نگاری کے حسین مرقعے آویزاں ہیں۔''یادِ رنگیں'' ایثارؔ کی بے حد خوبصورت نظم ہے۔جس میں ماضی کی دیرینہ یادیں انھیں بار بار کھینچ کر ان وادیوں میں لے جاتی ہیں

جہاں وہ ہر فکر و پریشانی سے آزاد تھے پھولوں کی خوشبو سے دل بہلاتے وادیوں بے روک ٹوک گھوما کرتے۔ ہر سو جنت کی سی خوشی تھی۔اس نظم میں انھوں نے گزرتے وقت کو بڑی شدت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ نظم ان کی ذاتی احساسات پر مبنی زندگی سے قریب تر ہے۔اس کا محور خود ان کی ذات ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

کبھی اس سبزۂ نوخیز پر میں جان دیتا تھا
گلوں کو دیکھ کر مستی میں دل انگڑائی لیتا تھا
مجھے ان کوہ وادی کے مناظر سے تھی دلچسپی
میسر مجھ کو آتی تھی یہاں جنت کی خوش وقتی
خوش آں دورے! بہ بانگِ مرغِ اول جاگ جاتا تھا
سراپا زندگی ہو کر خوشی کے گیت گاتا تھا
نہیں آتا تھا مجھ کو جی چرانا سخت کوشی سے
عقیدت مجھ کو کتنی تھی شعارِ جاں فروشی سے
مثالِ باز میں سرگرم رہتا تھا شکاروں میں
گزر جاتی تھی میری نصف راتیں خارزاروں میں
مجھے لیلائے شب آغوش میں لینے تڑپتی تھی
وہ ناؤ نیند کے دریا میں کھینے کو ترستی تھی
نہیں معلوم اب کیوں بے سبب مایوس رہتا ہوں
بجھا سا جیسے کوئی طائر محبوس رہتا ہے

اس نظم میں انھوں نے خوب صورت شعری پیکر کے ذریعے ایسے احساسات کو نظم کیا ہے جو موثر بھی ہیں اور منفرد بھی۔اپنے مٹی اپنے وطن سے جڑی ہر چھوٹی بڑی خوشی، اپنے گاؤں کی آب و ہوا سبھی ان کی یاد داشت کا حصہ ہیں۔یہ نظم ایثآر کے داخلی احساسات سے لبریز ہے۔اس میں انھوں نے اپنے جذبات و

احساسات کو پوری صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں تاثیر کے ساتھ شدت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وہی وادی ، وہی ٹیلے ، وہی کبنی کا عالم ہے
وہی سب جھاڑیاں، جھاڑ اور وہی جنگل ہے موسم ہے
نہیں کوئی کشش میرے لیے اب ان نظاروں میں
بہلتا ہی نہیں اب جی مرا، ان سبزہ زاروں میں
طبیعت میری تھک جاتی ہے دو اک گام چلتے ہی
لیا کرتا ہوں اکثر کروٹیں اب شام ڈھلتے ہی
وہ میٹھی نیند اب مجھ کو میسر ہی نہیں آتی
گزر جاتی ہے ظالم چھوڑ کر آنکھوں کو للچاتی
عزیزو! اب لبِ فریاد پر قابو نہیں میرا
یہی لگتا ہے مجھ کو کھو گیا ہے کچھ کہیں میرا
سب اپنوں سے میں گھر سے دور بحرِ غم میں غلطاں ہوں
برنگِ گل ہوں پژمردہ ، مثالِ بو پریشاں ہوں
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں کس کو ہر سو کوئی کیا جانے
گزرتی ہے جو میرے دل پہ میں جانوں خدا جانے

اقبالؔ کی شخصیت ان کے حکیمانہ اندازِ فکر، حسنِ بیان، اور نظریات سے ایثارؔ بے انتہا متاثر تھے جس کی وجہ سے وہ مترجمِ اقبالؔ کی حیثیت سے اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ ایثارؔ نے کلامِ اقبال کا نہایت غور وفکر کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور اسی مطالعے کے باعث انہیں اقبال سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاعر کے قلب و ذہن میں جس کی محبت پیوست ہوتی ہے وہ اس کا اظہار شعری پیکر میں کرتا ہے۔ چنانچہ ایثارؔ نے ''علامہ اقبال کی شخصیت اور پیام'' اور ''بیادِ اقبال'' جیسی نظمیں لکھکر اقبال

سے اپنی گہری محبت کا ثبوت دیا ہے۔ ان نظموں میں انہوں نے اقبالؔ کی شخصیت، سیرت و کردار، علم وفن، دانش وبصیرت، فکر وفن کی جس خوبصورتی اور فنی چابکدستی سے عکاسی کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ نیز علامہ کی فکر کے ساتھ ساتھ پیغام کی بھی ترجمانی کی ہے۔ نظم ''بیادِ اقبال'' سے بند ملاحظہ کیجئے:

ملی ہے پر شکستوں کو نویدِ بال و پر ساقی
ہے نرگس حصہ دارِ دولتِ ذوقِ نظر ساقی
سرورِ سرمدی و نشۂ فکرِ فلک پیما
ستارہ میکشوں کا آج کل ہے اوج پر ساقی
حسیں و دل نشیں ہیں شاہدانِ رنگ و بو لیکن
فرازِ عرش پر ہے اپنا مقصودِ نظر ساقی
جو چبھ جائے تو دم لینے نہیں دیتی خلش دل کو
تری نوکِ مژہ رکھتی ہے نشتر کا اثر ساقی
ہمیں غفلت سے چونکایا تری ''ضربِ کلیمی'' نے
رہے گا عرصۂ ہستی میں اونچا اپنا سر ساقی
چلا ہے رو بہ منزل کاروانِ تیز گام اپنا
ہمیں ''بانگِ درا'' دیتی ہے منزل کی خبر ساقی
تری ہستی پہ ہم کو جس قدر بھی ناز ہو کم ہے
کہ تیری وجہ سے ہندوستان مشہورِ عالم ہے

بلاشبہ اقبالؔ کی شاعری میں کئی صدیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو کلامِ اقبال میں مذہبی سرچشمے، تہذیب و تمدن، قوموں کا عروج و زوال، تاریخ کے دھارے، سماجی حقائق، انسانی جدوجہد کی داستانیں، فکر و دانش کی شمعیں سب کچھ موجود ہیں۔ ایثارؔ کہتے ہیں:

ہمیشہ درد ِملت سے ترا دل چور رہتا تھا
سدا اشکوں سے پیمانہ ترا بھرپور رہتا تھا
سخن تیرا تھا ذکر و فکر و آہ و نالہ سرتاسر
جہانِ عیش وراحت سے تو کوسوں دور رہتا تھا
تھی فریادِ امتِ مرحومہ کی فریاد میں تیری
شکایت ہائے رنگیں سے سخن معمور رہتا تھا
تو اس ہنگامۂ دار و رسن سے دب نہ سکتا تھا
ترے ہاتھوں میں جامِ بادۂ منصور رہتا تھا
نوائے شاعرِ فردا سمجھ میں آ نہ سکتی تھی
بھری محفل میں تنہائی پہ تو مجبور رہتا تھا
خداوندانِ نعمت سرنگوں تیری حضوری میں
مگر اونچا مقامِ بندۂ مزدور رہتا تھا
ترے خوابوں کو کل شرمندۂ تعبیر ہونے دے
بس اب تاخیر ہے تھوڑی بہت تاخیر ہونے دے

اقبالؔ ایک شاعر ایک مصلح ،ایک مفکر ایک محرک کا نام ہے۔جس کی پیروی بہت سے شعراء نے کی لیکن کوئی ان کی ذہنی اور فکری پرواز کو نہ پہنچ سکا۔اقبال کے تصورات اور افکار میں ہر جگہ ایک نیا زاویہ نگاہ نمایاں ہے۔ان کا پیغام آفاقی ہے۔علامہ کی فکری بلندی، گہرائی اور حکیمانہ بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے ایثارؔ نے ان کی غیر معمولی خوبیوں پر جس ڈھنگ سے گہر پاشی کی ہے اس سے ایثارؔ کی اقبال شناسی کی گہرائی و گیرائی،اور اقبالؔ سے متعلق ان کے نظریات اور تاثرات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔''علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور پیام''اس نظم میں اقبالؔ کی شاعرانہ اور کردار کی خوبیوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر فنی طور پر پیش کیا ہے۔ایثارؔ کے مطابق اقبالؔ کا خیال عرش کی اونچائیوں تک وسعت رکھتا ہے۔ان کے قدم چاہے زمین پر ہوں لیکن وسعتِ فکر ونظر

کہکشاں کی اونچائیوں تک پہنچتی ہے۔ انکی نظر اس قدر وسیع ہے کہ تمام کائنات کے راستوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ساری کائنات کی گلیاں انکی گزرگاہ ہیں۔ کبھی خدا کے حضور، کبھی مدینہ کی وادیوں میں، وہ ہر وقت سفر کے شوق میں مبتلا ہیں اور اسی عشق کی بے انتہا لذت و سرور کی مستی میں ہوش و خرد سے بے گانہ رہنا انہیں پسند ہے۔

خیال عرش رسا، پرشکوہ طرزِ کلام
جناب حضرتِ اقبال دافعِ اظلام
قدم زمین پہ نظر ان کی کہکشاں سے پرے
وہ رہ نوردِ گزرگاہ کائنات تمام
حضورِ حق کبھی بطحا کی وادیوں میں کبھی
وہ مست ذوقِ سفر میں، بدستِ عشق زمام
شکارِ شیر و پلنگانِ بیشہ کیا جانے
وہ مردِ حوصلہ یزداں شکار روحؑ بدام
بلاحصول انہیں صدیوں طویل مدت سے
بس ایک لمحہ تجلیِ بارگاہِ دوام
تپش سے دل کی لگن گرمیِ حیات کا ذوق
لبھا نہ سکا انہیں باغ و راغ کا آرام
''عرب کو رد کرا گر رنگ و خوں پہ ناز کرے
کہ ایک اصل سے وابستہ ہیں تمام قوام
تمیزِ قوم و وطن وجہِ فتنہ ہائے عظیم
کہ پست و زشت اسی سے ہے آدمی کا مقام
فلاحِ نوعِ بشر کی ہے مقصد اصلی
یہی پیام ہے اقبالؒ کا، یہی اسلام''

مندرجہ بالا نظم اقبالؔ کی شخصیت اوران کی تخلیقی شعور کو بہت حد تک واضح کرتی ہے۔خوبصورت تشبیہوں، استعاروں، منتخب الفاظ اور حسن بیان نے نظم کے تاثر کو دوبالا کر دیا ہے۔اقبال کوخراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے یہ بہترین نظم ہے۔ان نظموں کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایثارؔ نے اقبالؔ کو اس قدر ڈوب کر پڑھا ہے کہ اس کا اثر ان کی تخلیقی شخصیت کے رگ وریشے میں سرایت کر گیا ہے۔الغرض یہ نظمیں ان کی اقبالؔ سے محض عقیدت ہی کی مظہر نہیں بلکہ اقبالیاتی شعور کی آئینہ دار ہیں۔

عربی زبان کا ایک مقولہ ہے کہ ''الشعراء تلامیذ الرحمٰن''یعنی شعراء اللہ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قدرت نے شاعر کو ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے کلام سے ذہنوں کو محظوظ کرتا ہے بلکہ خوابیدہ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا اہم فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔شاعر زمانے کا مبصر ہوتا ہے وہ جو کچھ اپنے اطراف واکناف دیکھتا ہے اسے بلا کم وکاست صفحۂ قرطاس پر اپنے خوبصورت اندازِ بیاں سے بکھیر دیتا ہے۔''شاعر سے خطاب''میں ایثارؔ شاعر کی جہاں خوبیوں کا ذکر کر رہے ہیں وہیں اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلا رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ شاعر کی نظر ہمیشہ حقیقت پر ہوتی ہے اوراس کے سینے میں ہزار ہا اسرار پوشیدہ ہیں۔ یہ تمام دنیا تو ایک ہی پیمانے میں مست رہتی ہے لیکن شاعر ہمیشہ دریا چاہتا ہے اسی میں مست رہتا ہے۔اس کا قلب شفاف آئینہ کی مانند ہے۔

تو حقیقت بیں ہے، حق آموز ہے، حق کوش ہے
تیرا نغمہ ترجمانِ فطرتِ خاموش ہے
اے کہ تیرا سینہ اک گنجینہ اسرار ہے
مستِ یک پیمانہ عالم ، اور تو دریا نوش ہے
تیرا قلب صاف ہے حسنِ ازل کا آئینہ
اور نگاہِ تیز بیں صد جلوہ درآغوش ہے
تو کبھی گرمِ تکلم شاہدِ مقصود سے
بے غرض ہنگامہ ہائے دہر سے خاموش ہے

اے فراخائے تخیل میں بسیرا ہے ترا
اور ہی عالم میں تیری بزمِ ناونوش ہے
ہے ترا تارِ نفس تارِ ربابِ زندگی
تیرا نغمہ حاملِ جوش و شبابِ زندگی

ایثؔار کے نزدیک شعروشاعری ایک ایسی کاوش کا نام ہے جو حقیقت کا آئینہ ہو اور بامقصد ہو۔جس میں فکروفن بھی ہو اور زندگی کے بے شمار رنگ بھی موجود ہوں۔وہ شاعری کو دل بہلانے یا وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے ان کے مطابق ایسی شاعری جو غیر نتیجہ خیز ہوں اور قوم وملت کو اپنے مقصدِ زندگی سے دور کردے وہ کارِ عبث کے سوا کچھ نہیں۔وہ شاعری کو ایک اعلیٰ وارفع اور عظیم تر مقصد کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ شاعر کے کلام میں جہاں حسنِ فطرت کی جلوہ فرمائی ہوتی ہے وہیں امید کے دیے روشن رہتے ہیں جبکہ مایوسی کی پرچھائیوں سے وہ کوسوں دور رہتا ہے۔

شعر تیری فکر کا اعجاز بھی الہام بھی
جذبۂ صادق کا آئینہ بھی ہے پیغام بھی
فکروفن بھی اس سے ہے اور راگ بھی ہے رنگ بھی
اس میں ہے سب مایۂ تفہیم بھی افہام بھی
جلوہ فرما حسنِ فطرت ہے ترے اشعار میں
صبح کی رنگینیاں ہیں اور سوادِ شام بھی
یاس کی پرچھائیوں سے دور کاشانہ ترا
عالم ایقاں میں تو آباد بھی ،خوش کام بھی
عرش پیما فکر تیری اور حقائق پر نظر
صیدِ گیرِ آسماں رفعت بھی تو بے دام بھی
کہکشانوں سے بھی آگے ہے تری پروازِ فکر

پنجہ افگن ہے دو عالم پر ترا شہبازِ فکر

ایثؔار کی شاعری کا یہ بے حد خاص پہلو ہے ان کے کلام میں ٹھہراؤ اور گہرائی ہے اور ایک گہرا فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ان کی شاعری مقصدیت اور بیداری کے پیغام سے بھر پور ہے۔

ایثؔار کی نظموں میں حبِ وطن کے جذبے کو بھی اہمیت حاصل ہے۔دکن، ہمارا وطن، افتخارِ دکن، آزادی ہند، حبِ وطن کے جذبات سے مالا مال ہیں۔ان نظموں میں شدتِ تاثر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ہر لفظ میں ایثؔار کی وطن سے بے پناہ محبت اور پر خلوص جذبے کا اظہار ملتا ہے۔وطن کی پوجا ان کے اشعار کی رنگینی کو مزید توانائی عطا کرتی ہے۔''ہمارا وطن'' سے چند اشعار پیش ہیں۔

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

یہ میدان، یہ کوہ، یہ وادیاں یہ پھل پھول خوش رنگ پھلواریاں

یہ سرسبز کھیت، اور یہ کیاریاں یہ شادابیاں اور زرخیزیاں

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ہمارے ہمالے کی کیا شان ہے کہیں ایسی گنگا ہے میدان ہے

زمیں ہے کہ سونے کی یہ کان ہے وطن بس کہ اللہ کا احسان ہے

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

گھنے جنگل اور وادی و کوہسار رواں ندیاں پھاندتے آبشار

کہیں رقصِ طاؤس، بانگِ ہزار درندے چرندے ہزاراں ہزار

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ایلورا، اجنتا کے نقش و نگار محل، مندریں، اونچے شاہی منار

وہ عہدِ گذشتہ کی ہر یادگار ہمارے لیے وجہ عز و وقار

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ایثؔار نے عورتوں کے سلسلے میں بہت پاکیزہ اور صالح تصور اپنایا ہے اور ان کا یہ تصور ''مقامِ زن'' میں بہت نکھرے روپ میں سامنے آیا ہے۔ یہ نظم عورت کو عظمت اور تقدس سے سرشار کرتی ہے۔ عورت آبگینۂ الفت اور پیکرِ وفا ہے۔اس میں وفا بھی ہے خودداری بھی ہے۔ وہ عفت و عصمت کا مجسمہ صبر و شکر کا نمونہ ہے۔مختصراً وہ انسانیت کی تقدیر اور کائنات کی تفسیر ہے۔اس نظم میں عورتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ہر اک فرد بشر کا ہے بطنِ زن سے جنم
بزرگ ان میں کوئی، کوئی مرتبہ میں کم
وہ زن ہے جس سے ہے کل کائنات مستحکم
مقام اس کا ہے ایسا بہشت زیرِ قدم
بڑا مقام ہے اس کو جو ماں کی صورت میں
تو نیک بیوی اضافہ ہے حق کی صورت میں

ایثؔار کی یہاں عورت کا تقدس اس کی نرمی، معصومیت اور اسکی عظمت میں نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے ہاں عورت، ماں ،بہن، بیٹی، اور بیوی کی صورت میں محبت، انسانیت اور عزت و وقار کا تاج پہنے ہوئے ہے۔ وہ عورت کو تسلسلِ حیات اور تکمیلِ انسانیت قرار دیتے ہیں۔ان کی نظر میں عورت ایک ایسا روشن چراغ ہے جس کے نور سے ساری دنیا منور ہے۔ وہ فاطمہؓ بھی ہے، مریم بھی، خدیجہؓ بھی عائشہؓ بھی۔ جو معصوم، امین، نیک سیرت، اخلاقِ حسنہ اور قبائے صفات میں ملبوس ہیں۔ یہ مرد کو آدابِ خداوندی سکھاتیں ہیں۔انہوں نے عورت کو تسخیر کائنات کا اثاثہ اور انقلاب کا نقیب قرار دیا ہے۔اس بات کا واضح ثبوت 'مقامِ زن' میں ملتا ہے۔

شمول فاطمہ زہرا سے باوقار ہو تم
دراصل کانِ گہر ہائے آبدار ہو تم

جہاں کی جملہ بہاروں میں خوش بہار ہوتم
سعادتوں کا خزینہ ہو جملہ پیار ہوتم
تمہاری گود کے پالے ہیں کیسے کیسے بشر
حسن حسین سے نیکو خصال خوش پیکر

''اردو زبان'' ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اردو زبان وادب کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کا یہ بیان حیاتِ جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

''اردو ادب کا لہلاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں۔ اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے۔ بادشاہوں نے اسے منھ لگایا ہے۔ سپاہیوں نے زبانِ تیغ اور تیغِ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کا ادب ہے۔''[۲۵]

بقول پنڈت جواہر لال نہرو:

''اردو ہندوستان کے تہذیبی کڑھاؤ میں تاریخ کی آنچ میں پکے ہوئے لا تعداد عناصر سے تیار کیمیا ہے جسے ہم چاہیں بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تلسی کی رام چرت مانس ہو یا سکھ مذہب کا گرو گرنتھ صاحب یا شاہ عبدالقادر کا قرآن حکیم کا ترجمہ۔ ان میں زبان کا جو خمیر اٹھ رہا ہے اس سے اردو بڑھی اور پنپی ہے۔''[۲۶]

اردو زبان تہذیب و شائستگی کی امین ہے۔اس زبان نے اپنی شیرینی وحلاوت سے جہاں ہر ہندوستانی کومسحور کیا ہے وہیں ہر دور میں ہندوستانیوں کے دلوں میں محبت کے دیپ اوراتحادویکجہتی کی قندیلیں جلانے کا مقدس فریضہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔مذہبی رواداری کی جو مثال اس زبان نے قائم کی ہے شاید ہی کوئی اورزبان یہ کارنامہ انجام دے سکے۔اس زبان کا خمیر سیکولرازم کے خمیر سے گوندھا ہوا ہے۔چنانچہ اس زبان کی آبیاری محض مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی کی۔جن میں منشی پریم چند، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، مالک رام، گوپی چند نارنگ، راجندر سنگھ بیدی، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم جیسی قدآور شخصیات کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اس زبان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ہندوستان میں پیدا ہونے والی اس زبان کا پودا جسے ہندوستانیوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کرایک تناور درخت بنایااوراب اس کی جڑیں پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔یہی وجہ کہ حالات چاہے جتنے ہی پریشان کن رہے مگرآج بھی اس زبان نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔یہ زبان ہندوستان کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ایثار کہتے ہیں:

خطۂ ہند میں اک نقدِ رواں ہے اردو
قوم کوجسم جو سمجھے، رگِ جاں ہے اردو
پوچھئے ہم سے بتائیں گے کہاں ہے اردو
ذوق سنجیدہ جہاں بھی ہے وہاں ہے اردو
اک حقیقت ہے کوئی مانے نہ مانے اس کو
نازشِ ہند، زبانوں کی زبان ہے اردو
چارسوسالہ مشقت نے نکھارا ہے اسے
اورآئے گانکھاراس میں جواں ہے اردو
اس کے محسن سبھی چکبست بھی آزاد بھی شاد بھی
باہمی ربط ومحبت کا نشاں ہے اردو
نغمے رنگیں، غزل چشت، ترانے دل کش

دل نشیں، روح فزا، راحتِ جاں ہے اردو
ہار ان کی ہے مٹانے کا جنہیں ہے سودا
کیا مٹائیں گے اسے زندہ زباں ہے اردو

ایثآر نے ایسی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جن کا پس منظر تاریخ ہے۔جس میں عظمتِ انسانی کی یادگاروں کا سہارا لے کر ماضی کی ورق گردانی کی گئی ہے۔ان کی نظموں میں اسلاف سے محبت،عقیدت،اوراحترام ملتا ہے۔اس ضمن میں ''عظمتِ شیر دکن'' ، ''در منقبت حضرتِ ٹیپو سلطان شہید'' '' بیادِ حسین'' قابلِ ذکر ہیں۔''عظمتِ شیر دکن'' اس نظم کوحکومتِ مہاراشٹر نے دسویں جماعت کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ انگریزوں کی ظالمانہ حکومت اوراستحصال کے خلاف آزادی کے لئے جن عظیم ہستیوں نے جامِ شہادت پیا ان میں ایک جگمگاتا نام ٹیپوسلطان کا بھی ہے۔ملک وقوم کے لئے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔انہوں نے ملک میں سیکولرازم کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ایثآر نے''عظمتِ شیر دکن'' میں ٹیپو سلطان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی بہادری شجاعت پاکدامنی ، یکتائی ،سیرت وکرداراور دیگراوصاف کو بہت ہی خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے۔ملاحظہ کیجئے:

خوشا! وہ دورِ سلطانی ،محبت کی فراوانی
وہ آزادی کا پروانہ، رعایا اس کی دیوانی
صفائے دل کی یکتائی ،مثالی پاک دامانی
حرم ہو دیر ہو سب کا تقدس اپنی جا قائم
رہی بے داغ ہر حالت میں ٹیپو کی جہانبانی
وہ فرحت بخش جاں کولہلہاتی کھیتیاں ہرسو
وہ سیرابی ، وہ زرخیزی، تری ہو یا کہ بارانی
سپاہی رن میں ،عابد پیشِ حق ، دربار میں سلطاں
نشانِ عدلِ فاروقی ، کشادہ دست عثمانی

ادا کی سنتِ شبیر کس نے یوں زمانے میں
گئے کتنے سلاطیں کس نے سمجھا خون کو پانی
خوشا! خاکِ دکن تو نے کیا کیسا جواں پیدا
نہیں ہوتے، نہیں ہوتے، زمیں سے آسماں پیدا

''بیادِ حسین''، اس نظم میں تشبیہات اور استعارات میں معنویت ٹپکتی ہے۔ جذبات کی پختگی اور فراوانی، خیالات کی بلندی اور تسلسل اور احساسات کی شدت و گہرائی کے ساتھ ساتھ ایثآر نے میدانِ کربلا کی منظر کشی جس سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کر کے امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کے دین اسلام پر شہید ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے اس سے نہ صرف واقعہ کربلا کی یاد تازہ کی ہے بلکہ دینِ اسلام، امام حسینؑ اور شہدائے کربلا سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ میدانِ کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی حق و صداقت پر اپنی جانیں قربان کرنا، ان کی شجاعت، بلند سیرت، اعلیٰ اخلاق، محبت و وفا اور معصوم علی اصغر کی شہادت کی تصویر کشی بے مثال انداز میں کی ہے۔

غم میں بے غم یہ ادائے حضرتِ شبیر دیکھ
شانِ تسلیم و رضا کی زندہ اک تصویر دیکھ
جان دے دینا خوشی سے راہِ حق میں زندگی
اس خرابی میں ہے مضمر پہلوئے تعمیر دیکھ
سر کٹا کر سرخ رو اک، اک پشیماں بعد فتح
بھاگ اس کے اور اس کی شومیِ تقدیر دیکھ
ہلکے گہرے خون کے دھبے ہیں یا رنگِ شفق
آسماں پر کربلا کی ہو بہو تصویر دیکھ
بندۂ حرص و ہوا کو کیا لحاظ و احترام
''بوسہ گاہِ مصطفیٰ پر شمر کی شمشیر دیکھ''

خاک وخوں میں مرغِ بسمل ساعلی اصغر کا حال
زارونالاں بے کسی میں زینبِ دل گیر دیکھ
خشک ہو جانا تھا تجھ کو شرم سے رودِ فرات!
تشنہ لب ننھے سے اصغر کے گلے میں تیر دیکھ
آنکھ پر پردے چڑھے، فرقِ حق وباطل گیا
چار سو ایثار رقصِ عالمِ بے پیر دیکھ

یہ نظم میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی عظمت، بہادری و شجاعت اور حق پرستی کو بیان کرتی ہے۔نظم کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور ساتھ ہی روانی شگفتگی اور غنائیت جیسی خوبیوں سے لبریز ہے۔تشبیہات واستعارات کے خوبصورت استعمال نے نظم کو حسن بخشا ہے۔''درمنقبتِ سیدنا حسینؓ'' میں بھی ایثار نے حضرت امام حسینؓ کے حوالے سے اپنے جذبات وخیالات کی سچی ترجمانی کی ہے۔امام حسینؓ نے میدانِ کربلا میں باطل قوتوں سے مقابلہ کیا۔ایک ایک کر کے اپنے خاندان کو اسلام کی راہ میں قربان کیا۔اور اخیر میں خود بھی جامِ شہادت نوش فرمایا۔ایثار کہتے ہیں:

زندوں کے لب پہ زندہ جو نامِ حسینؓ ہے
واللہ یہ ثبوتِ دوامِ حسینؓ ہے

دل، دل وہی ہے جس میں ہے الفت حسینؓ کی
ہر رنگ سیر تشنۂ جامِ حسین ہے

تا حشر ثبت ہو گئی شامت یزید پر
روشن ہر اک زمانے میں نامِ حسینؓ ہے

ذبحِ عظیم کی ہے یہ تعبیر بے خلاف
ملت یہ پاسدارِ سلامِ حسینؓ ہے

ثا بت کلا مِ حق سے شہد ا کی ز ند گی
باطل سے راست جنگ پیامِ حسینؓ ہے

ملت کی نذر مال وزر اولا دو جاں سبھی
ا یثا ر یہ مقا م ، مقا مِ حسینؓ ہے

قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وہ نعمتِ بے بہا ہے جس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس سے پہلے بہت سی کتابیں اور صحائف نازل ہوئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان میں کئی تبدیلیاں کی گئیں۔لیکن قرآن مجید ہی وہ واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خوداللہ نے لیا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی وتحریف کی نہیں جاسکتی۔اللہ نے فرمایا ہے۔''انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون''۔قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے جو سارے عالم کو ہدایت کا سامان فراہم کرتی ہے۔اس کا اندازِ بیان انتہائی بلیغ اور جامع ہے۔ایثار نے بعنوان''قرآن عظیم'' نہایت ہی خوبصورت نظم قلمبند کی ہے۔نظم کی زبان سادہ وسلیس ہے مگر اس سادگی و سلاست میں دلکشی وجاذبیت کے عناصر موجود ہیں۔ملاحظہ کیجئے:

نرالی ہے مٹھاس اس کی، عجب اس میں روانی ہے
زباں دلکش، حسیں پیرایہ، پرمغز ومعانی ہے
فصاحت بے مثال اس کی، بلاغت اس کی لاثانی
کلا م اللہ کا ، او ر آ پؐ ا می کی ز با نی ہے
یہ اک کوزہ بظاہر، اور سمائی سات دریا کی
محیطِ عا لمیں ا س کا ، ا حا طہ لا مکا نی ہے
نہ اول اس کا پیدا ہے، نہ آخر اس کا پیدا ہے
ا ز ا و ل تا بہ آ خر ، یہ کتا ب لا ز ما نی ہے

ایثار نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔جن میں ''مفلس طالب علم، بسم اللہ ہی بسم اللہ، اللہ بس،

ہنس مکھ عزیزہ شہناز کو دیکھ کر، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ان نظموں میں بچوں کی تربیت اور ذہنی نشو ونما وارتقاء کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ذہنی وروحانی نشو ونما میں دلچسپی رکھتے ہیں۔انہیں بچوں کی نفسیات،ضروریات اور استعداد کا گہرا شعور ہے۔انہوں نے بچوں کی ذہنی معیار کے مطابق نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں دلچسپ ہیں۔ان میں بچوں کے دل و دماغ میں اخلاقی ،مذہبی معاشرتی احساس اجاگر کیا گیا ہے۔مظاہر فطرت اور مناظر قدرت سے ہم کلام کراتی ،عزم وعمل اور امید کا پیغام سناتی ہوئی نظمیں مؤثر اور دلکش پیرائے میں بچوں کے محدود ذہن پر اپنے اثرات ثبت کرتی جاتی ہیں نیز ان نظموں کا اختتام ایسی نصیحت آمیز بات پر ہوتا ہے جو بچوں پر گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔''مفلس طالبِ علم'' اس نظم کے ذریعے ایثآر طالب علم میں بہترین صفات پیدا کرنے کے متمنی ہیں۔انہوں نے طالبِ علم کو تعلیم کی اہمیت سمجھاتے ہوئے اسے تمام تر اونچائیوں ،ترقیوں ،اور خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہنے کی تلقین کی ہے۔طالب علم کی اور خاص مفلس طالب علم کی دشواریوں سے ایثآر اچھی طرح واقف تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میرا دل تیری بدحالی پر بہت دکھتا ہے۔ چونکہ تیرا دامن بھرا ہوا نہیں ہے اور تیرے ہی کاندھوں پر آنے والا مستقبل قائم ہے تو ہی اس جہاں میں روشن صبح لانے کا ضامن ہوگا لیکن آج تو غریبی اور تنگ دستی کے سبب مجبور ہے۔ چنانچہ ایثآر طالب علم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو باہمت ہے ان مشکلوں سے نہ گھبرا۔وہ چاہتے ہیں کہ طالبِ علم بلند ہمت،خوددار اور محنتی ہوتا کہ وہ زندگی میں جدو جہد کرتے ہوئے کامیابی سے ہمکنار ہوسکے۔دراصل ایثآر طالب علم کو شعوری طور پر یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ زندگی کی تگ ودو میں کامیابی کے زینے پر وہی قدم رکھ سکتا ہے جو ہمت وحوصلے سے کام لیتا ہے۔یوں ایثآر جدو جہد کے پیغام کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بھی یہ ہے کہ دنیا میں محنت ومشقت کے بغیر تعمیر وترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس نظم کی تخلیق میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔

دل مرا دکھتا ہے تیری خستہ حالی دیکھ کر

جھینپ جاتا ہوں ترا دامان خالی دیکھ کر

تو کہ جس پر منحصر مستقبلِ قومِ وطن

کل ترے ذمہ ہے نظمِ شہر وصحرا وچمن

علم کی دولت سے مالا مال ہونا چاہیئے

تجھ کوخوش فکراور نیک اعمال ہونا چاہیئے

مشکلیں آتی ہیں ہمت آزمانے کے لئے

قوتِ پنہاں بروئے کارلانے کے لئے

رازتحصیلِ مقاصد کا ہے تیرے ہاتھ میں

پرورش پاتے ہیں موتی دامنِ ظلمات میں

ایثآر نے نہایت ہی رواں اور متین اسلوب میں نظمیں کہی ہیں۔ان میں اصلاحی زاویہ بھی کارفرما رہا ہے۔''بسم اللہ ہی بسم اللہ'' اس نظم سے چنداشعار پیش ہیں:

بسم اللہ ہی بسم اللہ

فضلِ الٰہی بسم اللہ

بولوقرآں بسم اللہ — کھولوقرآں بسم اللہ

ذکر بنالوبسم اللہ — دل میں بسالوبسم اللہ

تا نا با نا بسم اللہ — کتنا سہانا بسم اللہ

کیا ہے بسم اللہ کا مقام — بسم اللہ قرآں تمام

صبح پڑھواور شام پڑھو — بسم اللہ ہر گام پڑھو

بسم اللہ ہی بسم اللہ

فضلِ الٰہی بسم اللہ

''ہنس مکھ عزیزہ شہناز کو دیکھ کر'' یہ ایک مختصر سی پیاری نظم ہے۔جس میں انہوں نے ایک معصوم بچی کا سراپا اوراس کی پیاری پیاری حرکتیں اوردل کوموہ لینے والی باتوں کونظم کیا ہے۔اس نظم کی منظرکشی میں انہوں نے

جو تخلیقیت کے رنگ بھرے ہیں قاری کے دل کو مسحور کر دیتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

میٹھی صورت ہنس مکھ بچپن　　　کیا جانے کچھ دکھ سکھ بچپن
گال صحیفیں ،لب پر جادو　　　آنکھیں ایسی شوخ کہ آہو
نور ہے دل میں نور جبیں پر　　　ننھی منی حور زمیں پر
کھیلو، کودو، اور کچھ بولو　　　بولو! کانوں میں رس گھولو

آؤ ننھی شہناز آؤ
آؤ آنکھوں میں آجاؤ

ناداں کیا جانو کیسی ہو　　　تم ایسی ہو یا ویسی ہو
آؤ تم کو بتلاتے ہیں　　　اس گتھی کو سلجھاتے ہیں
صورت سیرت والی ہو تم　　　اچھی قسمت والی ہو تم
تم نے اچھے گن پائے ہیں　　　موتی چن چن کر لائے ہیں

آؤ ننھی شہناز آؤ
آؤ آنکھوں میں آجاؤ

ایثار اپنے جذبات ،احساسات، اور مشاہدات کو نظم کے سانچے میں انتہائی مشاقی سے ڈھالتے ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں میں اپنے تجربات کو لطیف انداز میں اس طرح نظم کیا ہے کہ نفاستِ شعری پر ذرا بھی آنچ نہیں آتی۔اور نہ ہی تاثر میں کمی آتی ہے۔انہیں نظم کے فنی تقاضوں کا بھی خوب علم ہے۔انہوں نے جمالیاتِ فن کو ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھا۔ان کا کلام تشبیہ واستعارہ، پیکر تراشی رعایتِ لفظی، اور اجمال جیسی فنی خوبیوں اور نزاکتوں سے مملو ہے۔انہوں نے شاعری میں بیشتر مرکب تمثیلوں اور فارسی تراکیب کا عمدہ استعمال کیا ہے۔مثلاً شانِ تسلیم ورضا، شاہدانِ رنگ وبو، جوہرِ نوعِ بشر، نویدِ بال وپر، ظلمتِ بزمِ جہاں، ہنگامۂ دارورسن، جامِ بادۂ منصور، جہانِ عیش وراحت، رنگئی لیل ونہار، نظارۂ حسن وجمال، بندگانِ بےخبر وغیرہ۔ان کی نظموں میں جہاں لفظوں کی فسوں کاری ملتی ہے وہیں علامتوں کے استعمال نے معنی ومفاہیم کی وسیع دنیا آباد کی ہے۔

الفاظ شناسی، شعور و آہنگ، سخن فہمی میں ایثآر اپنی مثال آپ ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں میں اظہارِ بیان، زبان کی شیرینی، روانی اور غنائیت کو برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ الفاظ و تراکیب میں قطعی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی روانی میں قاری بذاتِ خود بہتا چلا جاتا ہے۔ سچا جذبہ، سچا اور سیدھا اسلوبِ اظہار ہی ایثآر کی شاعری کا واضح نقش ہے۔ ان کی شاعری کے بغور مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عشقیہ مضامین کو زیادہ وسعت نہیں دی۔ چونکہ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربے اور مشاہدے سمیٹے ہیں لہٰذا ان کی تخلیقی حسیت نے انہیں منفرد شاعر کے روپ میں ابھارا ہے۔

رباعیات

رباعی اردوادب کی ایک اہم اور مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔اصنافِ شاعری میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔لفظ رباعی عربی زبان کے لفظ ربع سے ماخوذ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔اصطلاحِ شاعری میں رباعی ایسی صنفِ سخن کو کہا جاتا ہے جس کے چاروں مصرعے ایک مخصوص اوزان میں ہوتے ہیں۔رباعی کے ۲۴ اوزان مقرر ہیں چاروں مصرعے مختلف اوزان میں ہوسکتے ہیں۔رباعی کو مختلف ناموں سے بھی جانا جاتا ہے جیسے ترانہ، دوبیتی، چہار بیتی، چہار مصراعی وغیرہ۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ’’عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ملتے ہیں۔رباعی، ترانہ اور دوبیتی، بعض نے چہار مصراعی، چہار بیتی، جفتی اور خصی بھی لکھا ہے۔ابتداً رباعی کے چاروں مصرعے باہم مقفیٰ ہوا کرتے تھے بعدازاں تیسرے مصرعے سے قافیہ حذف کردیا گیا اور اسے رباعی خصی کہنے لگے گویا چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو رباعی غیر خصی اور تیسرے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو رباعی خصی کہیں گے۔فارسی اردو کی رباعیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی خصی ہی مقبول رہی ہے۔‘‘ ۲۷

دیگر اصنافِ سخن کی طرح اردو میں رباعی گوئی فارسی زبان سے آئی ہے۔رباعی کو ایک مشکل صنفِ سخن سمجھا گیا ہے۔رباعی کی کامیابی کا انحصار اس کے مضامین اور حکیمانہ اقوال پر ہوتا ہے۔رباعی کے چاروں مصرعوں میں آخری مصرع بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس آخری مصرعے میں شاعر کوئی قول، ضرب المثل، کہاوت یا فکر انگیز نکتہ پیش کرتا ہے۔رباعی میں اختصار کے ساتھ جامعیت ضروری ہے۔بقول فرید پربتی:

''رباعی مختصر ہونے کی وجہ سے کافی اہم صنفِ سخن ہے اوراس میں
فوری پن کی گنجائش ہونے کی وجہ سے زیادہ تخلیقی
جذبے کوجذب کرنے کے امکانات موجود ہیں۔''۲۸؎

اردو ادب کے بیشتر شعراء نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں میر تقی میر،سودا،مرزا انیس،مرزا دبیر،حالی،فراق،جانثار اختر،جوش ملیح آبادی،فانی بدایونی وغیرہ شعراء کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان شعراء کی رباعیات میں ہرطرح کے مضامین پائے جاتے ہیں کہیں خمریات کا نشہ ہے تو کہیں حسن وعشق کی واردات،کہیں سماجی مضامین ملتے ہیں تو کہیں اخلاقی و مذہبی مضامین لہذا اردو کی دوسری اصنافِ سخن کی طرح رباعی میں مختلف حالات وواقعات کی عکاسی کی صلاحیت موجود ہے۔

سید احمد ایثآر نے جہاں خوبصورت غزلیں کہیں،اثر انگیز نظمیں لکھیں،وہیں فکر وفن سے آراستہ رباعیاں بھی منظوم کی ہیں جسمیں احساسات و جذبات اور عصری آگہی کے نقوش صاف جھلکتے ہیں ۔۱۹۹۹ء میں ان کا شعری مجموعہ ''ترانہ وترنگ''منظرِ عام پرآیا یہ رباعیات اور قطعات کا ایسا مہکتا ہوا گلشن ہے جو اپنی الگ ہی بہار دکھا رہا ہے۔اس شعری مجموعے میں ایثآر کی قادرالکلامی اور ہنرمندی اپنے کمال پر ہے۔ایثآر نے متعدد موضوعات پر بعنوان''اسرارِ حیات''رباعیات کہی ہیں۔انھوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں،موت وزیست کی صداقتوں نیز اپنے گردوپیش کے ماحول اور زندگی کے تمام نشیب وفراز کو رباعیات کے موضوعات میں سمو دیا ہے۔زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے سردوگرم کوانھوں نے قریب سے دیکھا اور برتا ہے اور تب کہیں جا کر اسے اپنے احساس کی بھٹی میں سلگا کرلفظوں کی زبان عطا کی ہے۔انھوں نے جہاں تصوف ومعرفت کواہمیت دی ہے وہیں اخلاقی مضامین کا بھی ذکر کیا ہے۔اپنی رباعیات کے ذریعے جہاں انھوں نے اصلاحی خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں عصری،سماجی ومعاشی حالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ان کی رباعیات خاص خیال وفکر کی آئینہ دار ہیں جس کے ذریعے انھوں نے قوم کوتحریک وعمل کی ترغیب دی ہے۔

انسان کوتمام مخلوق پر یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے نیز وہ خلیفتہ الارض کے منصب پر فائز کیا گیا ہے اس لئے فطرت کی تسخیر اس کا مقصدِ حیات ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی مخفی

صلاحیتوں اور پوشیدہ قوتوں سے پوری طرح واقف ہو۔ ایثآر کہتے ہیں کہ اس وسیع وعریض کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسرارِ خداوندی ہے۔ تمام حقائق ہماری نظروں کے سامنے ہیں لیکن ان حقائق کو دیکھنے کے لئے جس بصیرت کی ضرورت ہے وہی ہم میں مفقود ہے اس خیال کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ درج ذیل رباعی میں پیش کیا ہے۔

سب روح وبدن، کلام اسرارِ حیات
در پیش ہیں صبح وشام اسرارِ حیات
صرف ایک بصیرت کی کمی ہے ورنہ
پیدا ہیں جہاں تمام اسرارِ حیات

فلسفیانہ موضوعات اور حکیمانہ نکات رباعی کا ہمیشہ سے اہم موضوع رہے ہیں۔ ان حکیمانہ موضوعات میں بالعموم ناپائیداری اور دنیا کی بے ثباتی نے زیادہ رواج پایا ہے۔ اگرچہ ایثآر نے اپنی رباعیات میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن عام تصورات کے علاوہ انھوں نے حیات وکائنات کے بہت سے مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔

ایثآر کی تصوف پر گہری نظر ہے۔ اللہ کی عظمت کا بیان ان کی بیشتر رباعیوں میں ملتا ہے۔ ایمان کی پہلی شرط توحید ہے جس کے مطابق اللہ کی ذات لاشریک، لافانی اور خالقِ کل ہے۔ وہی مختار مطلق ہے وہی تمام اقتدار کا مالک ہے۔ وہ بے نیاز ہے اور وہی ایک ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر انسان کے دل ودماغ میں اللہ کے آقا و مالک ہونے کا اعتقاد اور اپنی بندگی کا یقین پختہ ہوجائے تو اس کی شخصیت بہترین صفات سے مزین ہوجاتی ہے۔ اللہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اے جلِ جلالہ، تری شان جلیل
اے جانِ جہاں بخش ترا ذکر جمیل

ہر ذرہ ہے محتاج ترا، بحرِ وجود
سب سر و عیاں تو ہی، تو بے مثل و مثیل

کہتا ہے زمانہ جو تجھے عرش نشیں
قرآن کہے تو ہے رگِ جاں سے قریں
ہاں ہاں! دلِ مومن میں بھی ہے عرش ترا
شئے کون ہے وہ تجھ سے جو مانوس نہیں

ذرے سے ملے ذرہ تو کہسار بنے
قطرے سے بہم قطرہ ہو ذخار بنے
خالق تری قدرت کے کرشمے کیا کیا
اک دانہ ملے خاک میں گلزار بنے

ایثآر کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت ہے۔ آپؐ سے وابستگی اور والہانہ محبت ان کی زندگی کا ایک وجد آفریں پہلو ہے۔ محمدؐ کی ذاتِ بابرکت ہی تخلیقِ کائنات کا مقصود ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں جو شانِ ظہور اور دل آویزی ہے وہ آپؐ ہی کی بدولت ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لئے آپؐ کی ذاتِ مقدس مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور عشقِ رسولؐ کے وسیلے سے ہی یہ دنیا اور آخرت سنور سکتی ہے جو شخص اپنے آپ کو آپؐ کی محبت کے رنگ میں نہیں رنگتا وہ دینِ اسلام کی روح کو پہچاننے میں ناکام رہتا ہے۔ ایثآر کی آپؐ سے محبت، عقیدت اور والہانہ جذبات کا احساس ان کی رباعیوں میں جا بجا ملتا ہے۔ محمدؐ کے اوصاف، آپ کا سراپا و شخصیت، معجزۂ شق القمر اور معراج کے واقعات پر انھوں نے رباعیاں رقم کی ہیں۔

ہے اول تخلیقِ حضورؐ آپ کا نور

پھراس سے ہوا ساری خدائی کا ظہور
مخلوق میں سب سے اول واکمل آپ ہی
بخشے گئے آدم بھی ز ہے نامِ حضور!

چہرے کی صباحت پہ گلابی رنگت
خوشبو وہ پسینے میں نمکین صورت
وہ زلفِ سیہ، وہ قدِ رعنائے رسولؐ
خود ڈھال کے حیراں ہے خدا کی قدرت

جیسے انہیںؐ دیکھا ہے دکھانا مشکل
الفاظ کو آئینہ بنانا مشکل
ہے چاند حسیں، آپؐ حسیں تر سب سے
تمثیل کو کچھ فہم میں لانا مشکل

آپؐ کی حیات مقدس مکمل طور پر ہمارے سامنے موجود ہے۔ آپؐ کے کردار و گفتار، افعال و اطوار ساری دنیا کے لئے آئینہ ہیں جسے پیش نظر رکھ کر اور اس کی تقلید کر کے فلاح و نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی اہمیت کو بڑے ہی دلنشیں انداز میں اس طرح پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیئے:

اے بحرِ معانی یہ تعمق، یہ ترنگ
آئینہ صفت رنگ ترے، خود بے رنگ
بے مثل، بلا عیب، تو ایک چیز عجیب
اے ہوش ربا بربطِ فردوس آہنگ

قرآں کے برابر کوئی انعام نہیں
اس نامہ سے بہتر کوئی پیغام نہیں
تعمیل ہے فرض اپنا، جزا فیض اس کا
اسباب پہ تکیہ رہِ اسلام نہیں

منقبتی رباعیات:

منقبت کے معنی تعریف وتوصیف کے ہیں ۔اصطلاحِ شاعری میں اہلِ بیت،خلفائے راشدین، بزرگانِ دین کی مدح وشان میں کہی جانے والی نظم کومنقبت کہتے ہیں۔ایثآر جذبۂ صادق اور خلوص دل سے صحابہ کرام کے اوصافِ حمیدہ اجاگر کرکے ان کی ذاتِ قدسیہ کی عظمت ہمارے دلوں میں نقش کرنا چاہتے ہیں۔انھوں نے صحابہ کرام کی سیرت وکردار،عزت وعظمت کی ایسی سچی تصویریں پیش کی ہیں کہ ان تصویروں کا ہر پہلو خوشنما اور دل چسپیوں کا تمام سامان لئے ہوئے ہے۔ان منقبتی اشعار سے ایثآر کی تبحر علمی، تاریخی معلومات اور قرآن وحدیث سے واقفیت کا علم ہوتا ہے۔ایثآر کے کلام میں جہاں آپ ﷺ سے حد درجہ عقیدت ومحبت کا اظہار ملتا ہے وہیں خاندانِ رسالت اور صحابہ کرام کی شان میں وفورِ عشق کے جذبات نظر آتے ہیں۔ابوبکر صدیقؓ کی بہادری، جانثاری، وفا شعاری کی داستان چھیڑتے ہیں تو بالکل وہی منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں کہتے ہیں:

ہو خلقِ حسن دیکھنا مقصود اگر
دیکھ! آئیں گے صدیقؓ کی سیرت میں نظر
وہ صبر ورضا، صدق وصفا، وہ ایثار
ہیں حاصلِ ہم نشینئ پیغمبر

وہ غار کا ماحول، وہ حشرات کا ڈر
جاں سے بھی عزیز راحتِ پیغمبر
سہتے رہے خود عذاب، اف تک نہ کیا
آنسو دو ٹپک پڑے رخِ انور پر

حضرت عمرؓ کی خلافت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اسلام کے لئے بڑی قوت بخش تھی۔ آپ کے مزاج میں پختگی اور فطرت میں نرمی تھی، عدل وانصاف کے معاملے میں سخت اور اصول پسند تھے۔ سیرت کی پختگی اور قوتِ عمل میں بے نظیر تھے ان کی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا وخوشنودی تھا۔

وہ حضرتِ فاروق عمرؓ بن خطاب
ذوالامر وفی الاسلام من اولوالالباب
تھا خدمتِ خلق وحفظِ اسلام شعار
نیت رہی خوشنودیٔ رب الارباب

عثمانؓ بن افعان سراپا احساں
رحمت پہ خدا کی تکیہ ان کا ساماں
قرآں کی صداقت پہ لہو ان کا گواہ
خود ان کی شہادت پہ ہے شاہد قرآں

اصحابِ رسولؐ بزم انجم کی مثال
سب میں وہی پرتوِ جلال اور جمال
تاریخِ جہاں میں ہے کہیں ان کی نظیر
اعجازِ رسالتؐ کا کہیں دیکھا یہ حال

مردانِ صفا کوش، وہ آئینہ خصال
وہ بوذرؓ وسلمانؓ، صہیبؓ اور بلالؓ
تاثیرِ جمالِ نبویؐ کیا کہیئے !
روشن تھے صحابہ سبھی تاروں کی مثال

میدانِ کربلا کے واقعات و سانحات کا عکس ایثآر کی نظموں اور رباعیوں میں ملتا ہے۔ایثآر کے نزدیک کربلا کا سانحہ ایک علامت ہے ایک ایسی داستان ہے جو روزِ ازل سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ظالم ومظلوم کی مقابلہ آرائی، حق و باطل کی کشمکش، نور وظلمت کا ٹکراؤ یہ سب ایثآر کے کلام میں موجود ہے۔حضرت امام حسینؓ جوجگرِ گوشۂ رسول تھے۔ایسی عظیم المرتبت اور فقید المثال شخصیت کے بارے میں جب ایثآر کے قلم کو جنبش ہوتی ہے تو جذبات کا سیل رواں موتیوں کی طرح صفحۂ قرطاس پر نقش ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ سبطِ نبی، سیدِ ابرار حسینؓ
عشاق کے وہ قافلہ سالار حسینؓ
دی جاں کہ دیا ثبوت الّا اللہ کا
حق بات کہ ہیں کاشفِ اسرار حسینؓ

فرزندِ علیؓ لختِ دلِ زہرہؓ آپؓ
عشاق کی محفل کے سریرآرا آپؓ
اسلام میں شہداء کے علم دار آپؓ ہی
اور فدیۂ فرزندِ خلیل اللہ آپؓ

ایثآر نے اپنی رباعیات میں ایسی عظیم شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے راہِ حق میں اپنی جانوں کو

قربان کر دیا اور شہادت کا مرتبہ پایا ایسی ہی ایک شخصیت حضرت ٹیپو سلطان کی ہے۔اس سرزمین پر کئی حکمران آئے لیکن جو عظمت ٹیپو سلطان کے حصہ میں آئی وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ان کی زندگی قوم وملت کے لئے مثال ہے۔انھوں نے اس قول کو سچ ثابت کیا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیڈر کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ٹیپو سلطان ایک بلند ہمت اور شیر دل انسان تھے ان میں حبِ اسلام کے ساتھ ساتھ حبِ وطن کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔اور اسی جذبے کی خاطر انھوں نے اپنی جانِ عزیز بھی قربان کر دی۔ایثاؔر ٹیپو سلطان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پروانۂ حریت، اے سلطانِ غیور
جانباز، جگردار، جری مردِ میسور
تو زندہ، ترا ملکِ خداداد آباد
تا حشر فروزاں و چراغاں میسور

گاتی ہے ترا گیت سدا کاویری
تاریخ کی رونق ہے نشانِ شیری
اے فاطمہ کے پوت !اے حیدر کے سپوت
کل ہند کی ہے شان شہادت تیری

ایثاؔر کو علامہ اقبالؔ اور ان کے کلام سے بے پناہ عقیدت ہے۔اقبالؔ کی شاعری نے انھیں حد درجہ متاثر کیا نتیجتاً انھوں نے اقبالؔ کے جملہ سات فارسی مجموعۂ کلام کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔شاعر مشرق علامہ اقبال فلسفی، صوفی اور عالمِ انسانیت کے علم بردار تھے۔ان کا کلام سحر انگیز ہے اور انسان کو ایک عظیم اور بلند مرتبے کے حصول کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ان کے کلام کے ذریعے نہ صرف انسانی حیات کو رہنمائی ملتی ہے بلکہ انسان حیات و کائنات کے پر اسرار رازوں سے بھی واقفیت حاصل کرتا ہے۔اقبال کا فلسفہ حیات بہت گہرا ہے۔اقبالؔ کے متعلق ایثاؔر فرماتے ہیں:

میدانِ علومِ مغربی کے شاطر
رومی کے پرستار، خودی کے ماہر
باتوں میں تری پیمبرانہ انداز
تکیہ ترا اقرآں، تو حکیم و شاعر

اقبالؔ کو مولانا رومی سے والہانہ عقیدت تھی اور ان کے لئے مولانا رومی کی شخصیت سب سے زیادہ جاذبِ توجہ تھی اس لئے ایثارؔ نے انھیں رومی کے پرستار کہا ہے۔ اقبالؔ کی زندگی پر مولانا رومی کی شخصیت نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے انھوں نے اپنے کلام میں بیشتر جگہ ان کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہے۔ جاوید نامہ میں عالمِ افلاک کی سیر میں رومی اقبال کی رہبری کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں اقبالؔ کو مسائلِ حیات کی تفہیم میں دشواری پیش آتی ہے وہ مولانا رومی سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کا ذکر ایثارؔ اپنی رباعی میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

درویشِ خدا مست مریدِ ہندی!
تو مستِ ولائے بندگانِ علوی
تو سائرِ افلاک، تو آنسوئے فلک
رومیؔ ترے دل میں، تو بدستِ رومی!

اردو شاعری کی ایک اہم خصوصیت فکری عنصر بھی ہے۔ ایثارؔ کی رباعیات میں انسانیت پسند اقدار اور اخلاقیات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مسائل کا بیان بھی تواتر سے ملتا ہے۔ انھوں نے ایک دردمند فنکار کی حیثیت سے اپنے ملک و معاشرے کے مفلس پسماندہ اور مظلوم طبقات کے مسائل و مصائب کو محسوس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

چڑھتے ہوئے قبروں پہ چڑھاوے دیکھے
کھنڈروں پہ بھی کچھ تازہ گلاوے دیکھے
مفلس کی تھی دیوار کہ گر کر نہ اٹھی

ہر روز کے جلتے ہوئے آوے دیکھے

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں سائنس وٹکنالوجی کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی حدیں ہر لمحہ وسعت پذیر ہیں۔ تجسس انسانی فطرت کا لازمی حصہ ہے اسی خصوصیت کی بنا پر انسان دیگر مخلوقات کے بالمقابل انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی تعقل پسندی کی بنا پر اس نے سائنس وٹکنالوجی کے استعمال سے بے شمار ایجادات کئے ہیں اسی سلسلے میں ایثاؔر نے کہا ہے کہ:

تسخیر کی دھن میں چل پڑا ہے انسان
ہر گوشۂ ہستی پہ کھڑا ہے انسان
کافی ہے صحیفوں کی صداقت پہ ثبوت
اشیاء سبھی چھوٹی ہیں، بڑا ہے انسان

ایثاؔر کہتے ہیں کہ اللہ نے ذرات میں بے پناہ طاقت پوشیدہ رکھی ہے اگر اس کا استعمال صحیح کاموں میں لائیں تو یہ نعمت ثابت ہوں گی ورنہ اس کے منفی استعمال سے کافی نقصان ہوسکتا ہے۔

ذرات میں بھی بند بڑی قوت ہے
کس شان کی نعمت ہے، بڑی حکمت ہے
ڈھانے کو قیامت بھی یہ ڈھا سکتی ہے
گر کام میں لائیں تو بڑی نعمت ہے

ایثاؔر کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ان کا عزم واعتماد ہے وہ ہمیشہ نئے عزم اور پختہ ارادوں کے ساتھ منزل کی طرف بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کوئی جامد اور ساکن شئے نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل اضطراب، جدوجہد اور جستجو کا نام زندگی ہے۔ انسان چاہے تو اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پہاڑ جیسی مشکلات کا سامنا بھی کرسکتا ہے۔

مایوس ہے تو کس لئے اے دل، اے دل

کیا چاہئے اب اس سے سوا اے غافل
ٹل جائیں گی مشکلیں جو ہو رو بہ عمل
آسانی ہو، مشکل نہ رہے گی مشکل

پتھر سے نکلتے ہوئے دھارے دیکھے
ظلمت میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے
ایثآر کئی حوصلہ مندوں نے یہاں
پستی سے بلندی کے نظارے دیکھے

انسان اپنی زندگی میں جن حالات و حادثات سے دوچار ہوتا ہے یا جن مشاہدات سے اثر قبول کرتا ہے وہی اس کے احساس کو جنم دیتے ہیں اور جہاں احساس کی شدت اشعار کی تخلیق کا سبب بنتی ہے وہیں فکر کی گہرائی اس میں جان ڈال دیتی ہے۔اور یہی فکر کی گہرائی، شدتِ احساس، فطری صداقت ایثآر کے کلام میں پایا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی رباعیات میں انسان کے گم ہوتے ہوئے رشتوں اور ٹوٹتی بکھرتی تصویروں کا نقشہ المیاتی انداز میں کھینچا ہے اور ان میں اس قدر درد اور افسوس کا احساس ہے گویا یہ وہی کیفیتیں اور آہٹیں ہیں جو ہمارے دل سے گزرتی ہیں ملاحظہ کیجیئے :

لو چیر کے سینہ رکھ دیا دل ہم نے
آئینے کو کر دیا مقابل ہم نے
ایثآر جو بدظن تھے وہ بدظن ہی رہے
ہر چند دیا ثبوت کامل ہم نے

بہتان پہ دولت کی اکڑنے والوں
ہڈی کے لئے اپنوں سے لڑنے والوں

دولت کو اکٹھا کئے جاؤ گے کہاں
پتوں کی طرح سوکھ کے جھڑنے والوں

ایثارؔ محکمۂ جنگلات سے وابستہ تھے انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دشتِ نوردی میں گزارا۔ اس شعبے سے ان کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

پھر جاتے ہیں آنکھوں میں حسین نظارے
اشجار ہرے بھرے وہ وادی ٹیلے
مدت ہوئی ذہن میں ہیں تازہ اب تک
جنگل کے مناظر جو بھلائے نہ گئے

پگڈنڈیوں پر وہاں وہ چلنا پھرنا
غفلت میں قدم روڑے پہ رکھنا، گرنا
زود اٹھ کے وہیں ذرا سنبھل کے چلنا
رستہ نہ ملے تو جھاڑیوں میں گھرنا

ان رباعیوں میں ان کا دلکش اسلوب پوری جلوہ سامانی کے ساتھ موجود ہے۔ سادہ لب و لہجہ، سوز واثر لیا ہوا آہنگ اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی آواز ان کی رباعیوں کو ممتاز بناتی ہیں۔ عمر کی ڈھلان پر احساس خستگی و درماندگی نے ان سے اس طرح کی رباعیات کہلوائی ہیں۔ ان رباعیات میں موجود شدتِ احساس اور کربِ باطن کو سمجھنے کے لئے دردمند دل ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

پیری کہ جب آثار ابھر آتے ہیں
دکھ درد سبھی ڈھونڈتے گھر آتے ہیں
اور ضعف کے دھارے بھی ڈبونے کے لئے

بل کھاتے ہوئے سانپ سے درآتے ہیں

اپنی عمر رسیدگی کے باعث وہ اپنے آپ کو سنبھل کر چلنے اور سرشت کو بدلنے کی تلقین کر رہے ہیں:

بوڑھے ہوئے اب سنبھل کے چلنا ہوگا
اعصاب کو بھی ضعف میں ڈھلنا ہوگا
بے کار یہ چشم و گوش ، بے کار بدن
یعنی کہ سرشت کو بدلنا ہوگا

اس صنف کی فنی عظمت کا گہرا احساس ایثآر کی ہاں ملتا ہے۔ رباعی کہنے کے لئے جو زبان و بیان کی پختگی، شعریت وغنائیت، عروضی مہارت اور فنی گرفت درکار ہے وہ سب کچھ ایثآر کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ''ترانہ وترنگ'' کی رباعیات ایثآر کے ہمہ جہت خیالات، جذبات واحساسات کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے شاعری کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو حقیقی، فطری اور پائیدار ہے۔ مختصر مگر جامع انداز میں وہ مشکل سے مشکل خیالات کو ادا کرنے میں ماہر ہیں۔ سادہ اسلوب، گہری فکر و وسعتِ نظر اور مناسب الفاظ نے ان کی رباعیات کے حسن میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔ بقول گوہر تریکیروی:

''رباعیات 'اسرارِحیات' جناب ایثار صاحب کا ایک عظیم اور ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے جسے انھوں نے فکر ونظر، حسن و بیان اور مختلف موضوعات کو تخیل کے سانچے میں ڈھال کر جس فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔''۲۹؎

ایثآر کی غزلوں اور رباعیات میں بڑی حد تک معنوی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان میں یکسانیت اور مشترک مقاصد کی تکمیل کا عزم کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ ان کی رباعیات میں وہی

فلسفیانہ مضامین، بلندی کردار کی تبلیغ، انسان دوستی کی تلقین، عشق کی پاکیزگی وغیرہ کا ذکر ہے جو ان کی غزل کا امتیاز ہے۔ان رباعیوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ متعدد موضوعات پر مشتمل یہ رباعیاں سید احمد ایثآر نے محض یونہی نہیں کہی ہیں بلکہ انھیں صنفِ رباعی سے فطری لگاؤ ہے اور وہ رباعی کی اثر انگیزی سے بھی واقف ہیں اس لئے انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے رباعی کو ذریعہ بنایا جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

قطعات

اردو ادب کے بیشتر شعراء نے قطعہ کی صنف میں محض تبدیلیٔ ذائقہ کے طور پر طبع آزمائی کی اسے مکمل طور پر وسیلۂ اظہار نہیں بنایا۔ دراصل قطعہ کو ایک عرصے تک آزاد اور جداگانہ صنفِ سخن کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اس کا اطلاق ان اشعار پر ہوتا رہا جو غزل میں مطلع اور مقطع کے درمیان اتفاقی طور پر وجود میں آجاتے تھے اس قسم کے اشعار کو قطعہ بند کہا جاتا تھا جس کا غزل سے ہٹ کر کوئی دوسرا وجود نہ تھا۔ قطعہ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل بیان کیا گیا ہو۔ قطعہ کے لئے کوئی موضوع مقرر نہیں ہے۔ قطعہ نگار ہر طرح کے واقعات و بیانات۔ نظریات و خیالات اور احساسات و جذبات کو نظم کر سکتا ہے بشرطیکہ پورا قطعہ معنوی اعتبار سے مکمل اکائی ہو۔ کلیم الدین احمد قطعہ کو ایک ضمنی چیز قرار دیتے ہیں ان کے مطابق:

> ''کسی واقعہ، کسی خیال، کسی تجربے کا کچھ ادھورا سا بیان ہوتا ہے، جیسے کسی چیز کو بیچ سے بیان کیا جائے اور اس کی ابتداء اور انتہا کا ذکر نہ ہو یا کوئی یکا یک یاد پڑ جائے، اس کا سرسری طور پر یا ضمناً ذکر کر دیا جائے۔'' ۳۰

رام بابو سکسینہ تاریخِ ادبِ اردو میں لکھتے ہیں:

> ''قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اس کو قصیدے اور غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو یا زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لئے ہم قافیہ

ہو نا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔قطعات میں اکثر پند ونصائح کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔''۳۱

عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

''قطع کے لفظی معنی کاٹے ہوئے کے ہیں،لیکن اصطلاح میں قطعہ نظم کی اس صنف کو کہتے ہیں جو غزل یا قصیدے سے کاٹا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے ،اس میں قافیہ کی وہی ترتیب ہوتی ہے جو غزل یا قصیدے کی ہے،مگر اس میں مطلع نہیں ہوتا۔''۳۲

مندرجہ بالا آرا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قطعہ غزل اور قصیدے کا جز ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہے۔اور ایک صنف سخن کی حیثیت سے اس کی پہچان یقینی ہے۔دراصل قطعہ اور غزل میں جو بات مختلف ہے وہ قطعہ میں مطلع کا نہ ہونا ہے۔اور اس کے علاوہ قطعہ میں اشعار میں بے ربطی نہیں ہوتی بلکہ مضمون تسلسل کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔

اردو میں قطعہ نگاری کو قبولیت انیسوی صدی کے شعراء نے بخشی جن میں حالی ،شبلی ،اسماعیل میرٹھی ، چکبست وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اکبرالہٰ آبادی نے خصوصاً اس کی طرف توجہ دی۔ان کی ظریفانہ شاعری عموماً قطعات کی صورت ہی میں ہیں۔اقبالؔ نے بھی کثرت سے قطعات کہے اور اسے ہر قسم کے مضامین کا متحمل بنا دیا۔اکبر اور اقبالؔ کے زیرِ اثر بیسویں صدی کے بیشتر شعراء نے قطعات کہے جن میں احسان دانش، سیماب اکبر آبادی،اختر انصاری، جوش ملیح آبادی، وغیرا ہم ہیں۔ان شعراء میں اختر انصاری نے قطعات کے فنی امکانات زیادہ بہتر طور پر نمایاں کیا۔اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اختر انصاری رقمطراز ہیں:

''میرے قطعات کے وجود میں آنے سے قبل اردو میں قطعے کی
صنف ''ہر چند کہیں کہ ہے، کہیں نہیں ہے'' کی تفسیر و تعبیر تھی،
شعراء اپنی غزل زدگی کے سبب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں
دیکھتے تھے، رباعی پر جتنی توجہ صرف ہوتی تھی قطعہ کو اتنی توجہ کا
مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔''۳۳؎

اختر انصاری کے قطعات کو خاصی قبولیت حاصل ہوئی۔ اس میدانِ خاص میں اور بھی شعراء جن میں احمد ندیم قاسمی، نریش کمار شاد، اور جانثار اختر کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے سیاسی سماجی، طنزیہ، مزاحیہ ہر موضوع پر قطعات کہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سید احمد ایثآر بھی ہیں۔ ایثآر علمی وادبی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص تعمیری نقطۂ نظر بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کو وقتی تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ ہی اسے لفظی بازی گری کا مشغلہ سمجھتے ہیں۔ وہ شاعری کو اعلیٰ ارفع اور عظیم تر حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ترانہ وترنگ شعری مجموعہ میں بعنوان ''نوائے زندگی'' قطعات کہے ہیں جو ان کے منفرد نقطۂ نظر کے مظہر ہیں۔ ان قطعات میں انھوں نے راست بازی، شعروادب، قولِ پیغمبر، زمانہ کی نیرنگی، طلوعِ صبح، نورِ سحر، ہلالِ عید، شکوہ شکایت، وغیرہ موضوعات پر اپنے خیالات نظم کئے ہیں۔ ان قطعات میں انھوں نے جہاں زندگی کے عام تجربات و مشاہدات کو پیش کیا ہے وہیں انسان کے عمل اور غلط رویوں کا اظہار بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ زندگی کے نازک اور پیچیدہ مسائل کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہوئے ساری انسانیت کے لئے صحیح راہ کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات و تجربات کو لفظ و بیان کا پیکر عطا کرنے میں جس فنکارانہ آگاہی کا ثبوت دیا ہے اس سے ان کی تخلیقی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق میں ہئیت کا اثر موضوعات پر ہوتا ہے لیکن ایک ماہر اور ذہن فنکار ہئیت کا اپنا مطیع بنا کر اپنی فنکاری کے ذریعے اسے ایک نیا رنگ اور الفاظ کی ایک نئی کائنات بخشتا ہے۔ اور یہ صلاحیت ایثآر میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایثآر نے تصوف کے رموز کو ایک دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً:

خم بھی تو، بادہ بھی تو، سبو بھی تو
جس کو دیکھو وہ ہو بہو تو ہے
بن ترے رونقِ حیات کہاں
نورِ جاں، جانِ آرزو تو ہے

ایثآر نے پیغمبر کے قول کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قطعہ میں یوں نظم کیا ہے۔

بے دردی سے درد و غم ہے
پیار سے پیدا جذبِ بہم ہے
قولِ پیغمبر سبحان اللہ
من لاّ یرحم لا یرحم ہے

عید کے چاند کی منظر کشی خوبصورت استعاروں کی مدد سے نہایت دلکش انداز میں کی ہے ملاحظہ کیجیے:

ہلال عید حسیں عکس، ابروئے جاناں
وہ نیلے چرخ میں نازک کمان چمکیلی
نظر جماؤ تو پاؤ وگرنہ محرومی
بہت مہین ہے گویا لکیر ہلکی سی

ایثآر قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے بیشتر قطعات میں قرآنی آیات جیسے اِنہٗ ینظُر بنورِ الله ،لیسَ لِلانسان اِلّا ما سعیٰ ،کل شیی ءِ ھالک کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ چند قطعات درج ذیل ہیں۔

اک نظر بھی ڈال دے گر مست مینائے خلیل

اِنہٗ ینظُر بنورِ اللہ کی بن کر دلیل
بطنِ صحرا سے جنم لیں تازہ تازہ گلستاں
پھوٹ نکلے سنگ کے سینے سے جوئے سلسبیل

تیرے حق میں سب مقدر کا کیا
تیرا مسلک بس توکل بر خدا
سن! خداوالے خدا کا قول سن
لیسَ لِلانسان اِلّا ما سعیٰ

آج ہے سب کچھ، کل کیا ہوگا؟
آواز آئی اللہ مالک
یہ خلعت، یہ دولت، حشمت
بولا کل شییٔ ھالک

آثار کے قطعات ہمارے شب و روز کے آئینہ دار ہیں۔ یہ قطعات ہمیں خواب نہیں دکھاتے بلکہ حقیقت کا وہ منظر نامہ بیان کرتے ہیں کہ زبان بے ساختہ شاعر کے اعجاز وقلم کو داد دینے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ چند قطعات پیش ہیں جو شاعر کے فکر وفن اور عصری حالات پر اس کی گہرائی نگاہ کے خوبصورت ترجمان ہیں۔

صبح کو اٹھے جو لیں امید نے انگڑائیاں
فکر نے دکھلائیں اپنی ہر طرف جولانیاں
شام تک محو تگ و دورہ کے لوٹ آئے عبث
لے چلے دکھ کو ڈبونے نیند کی گہرائیاں

کس کو خوب وخراب کی تمیز

سب کی آنکھوں پہ چھا گئے جالے
ہے دھندلکوں کا راج عالم سب
آفتوں میں گھرے ہیں رکھوالے

ایثارؔ ایسے باکمال شاعر ہیں جو زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو کمال ہنر مندی اور فنکاری کے ساتھ شاعری کے پیکر میں ڈھالنے میں قدرت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے عہد کی کربنا کیوں اذیتوں اور انسانیت کی شکست وریخت کو بڑی بے باکی اور ہنر مندی کے ساتھ شعری پیراہن عطا کیا ہے۔وہ اپنے عہد اور عہد کے حوالے سے اشخاص اور ان کے گرد و پیش ماحول میں رونما ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

آدمی انس کے بغیر نہیں
آپسی بیر، وجہِ خیر نہیں
رنگ وخوں کی تمیز کارِ فساد
سبھی اپنے ہیں کوئی غیر نہیں

ایثارؔ نے اپنے کلام سے اصلاح کا کام بھی لیا ہے اور اس میں طنز کی گہری کاٹ جلوہ گر ہے۔عصری مسائل پر گہری نظر اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کا جو جذبہ ہے وہ ان کی شاعری کو انفرادیت بخشتا ہے۔انہوں نے مسائلِ حیات کو کمال ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔

بھوک کی شدت سے روتا ہے کوئی
لقمہ تر کھا کے سوتا ہے کوئی
کوئی بدبختی پہ ہے ماتم سرا
اس پہ خوش بے درد ہوتا ہے کوئی

یہ عجب دورِ آدمیت ہے
پڑ گئے ہیں محبتوں میں شگاف
مطمئن آج کوئی ملک نہیں
اک قیامت ہے، قاف سے تا قاف

ایثؔار نے ذاتی مشاہدے سے مکمل استفادہ کرتے ہوئے حیات و کائنات کے تمام اہم امور پر بھرپور غور و فکر کیا ہے۔ انھوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ کسی خاص نظریہ یا اصول کے تحت نہیں ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے زندگی کے مشکل مسائل اور انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کے لئے مسلسل فکر و تامل سے کام لیا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں زندگی کے تمام رنگ اپنی پوری معنویت اور گہما گہمی کے ساتھ سموئے ہوئے ہے وہیں اسی زندگی سے جڑے کئی سوالات ذہن میں بیدار ہوتے ہیں۔

زندگانی عذاب ہے گویا
کب تلک دشمنی، فریب، دروغ
نفسی نفسی کا حال برپا ہے
کون دے گا محبتوں کو فروغ

سکوں نا آشنا یہ زندگی کیوں؟
خدا کی دین ہے سب جز رسی کیوں؟
تفوق کا جنوں اک دوسرے پر
ہے دشمن آدمی کا آدمی کیوں؟

ایثؔار کا دل مسلکی اختلافات سے کڑھتا ہے۔ ان نظریاتی اختلاف سے وہ دل برداشتہ ہو جاتے

ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پوری قوم وملت متحد ہو جائے کیونکہ اتحاد میں ہی طاقت ہے۔وہ کہتے ہیں:

وحدتِ قوم عین قوت ہے
بڑی دولت ہے وجہ رحمت ہے
اپنی ملت کا یہ حصارِ عظیم
جب سے ٹوٹا ہے دورِ نکبت ہے

شاعری میں صداقت اور واقعیت کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔کسی شاعر کا کلام اگر اس خوبی سے خالی ہو تو اس کی شاعری فنِ تنقید کی کسوٹی پر کھری نہیں اترے گی۔ایثارؔ کے مطابق شاعری سوز و آہنگ کا کرشمہ ہے۔لہٰذا شاعری میں سوزِ دل کی عکاسی بھی شرط ہے۔اور سوزِ دل کی کیفیت اسی وقت شاعری میں نمایاں ہوگی جب شاعر اپنے تجربات اور دلی کیفیات کو خوبی سے بیان کرے یعنی غم ونشاط کے لطیف جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں شاعر کو کمال حاصل ہونا چاہئے۔

سوز و آہنگ کا کرشمہ ہے شعر
کبھی چنگاریاں اگلتا ہے
بجلیاں دوڑتی ہیں نس نس میں
خرمنِ عقل و ہوش جلتا ہے

تجربہ کوئی زندگانی کا
صاف لفظوں میں ڈھل کے آتا ہے
روشنی میں جھلک حقائق کی
ہوتی ہے، شعر جگمگاتا ہے

ایثارؔ خود آگاہ شاعر ہیں اپنے کلام کے متعلق وہ کہتے ہیں

ذہن میں کچھ نقوش ابھرتے ہیں
رنگ موز ونیت کے بھرتا ہوں
دے کے جذبات کی جلا ان کو
روشن آئینے پیش کرتا ہوں

انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔فطرت کی تسخیر اس کا مقصدِ حیات ہے جس کے لئے وہ اپنی مخفی و پوشیدہ قوتوں کو مسلسل بروئے کار لانے میں مصروف ہے جس کا ثبوت نئی نئی ایجادات اور سائنس و ٹکنالوجی میں زبردست کامیابی ہے۔

رسائی اس کی ہے شمس و قمر تک
سحاب و آسماں و بحر و بر تک
بلند و پست پر چھانے چلا ہے
احاطہ اس کا حدِ نظر تک

ایثؔار انسان کو مشیتِ رب کے سامنے مجبور تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنی اس مجبوری پر راضی بہ رضا ہرگز نہیں۔اس لئے وہ مسلسل کوشش و جستجو میں مصروف رہتا ہے۔

طبیعت اس کی رہنِ جستجو ہے
دل اس کا گرم سیرِ چارکو ہے
قرار اک لمحہ بھی اس نے نہ پایا
نیا مقصد سدا اک روبرو ہے

انسان کی اسی راضی بہ رضا نہ رہنے والی جبلت کو ایثؔار انسان کی انفرادیت، عظمت، اور اثباتِ ذات کی کاوش کا مخزن قرار دیتے ہیں۔دورِ حاضر میں انسان مادی، سائنسی اور مشینی دور سے گزر رہا ہے۔وہ سائنس اور انسان کی حیران کن ترقی کا پرتپاک انداز میں خیر مقدم کرتے ہیں۔

گہر لائے گا دریا کی تہوں سے
اجالے آسمانی قمقموں سے
بنالے گا یہ آپ ہی اپنی راہیں
الگ ہیں رابطے اسکے سبھوں سے

اہلِ فن کے نزدیک شاعری جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔اس میں جس قدر واقعیت ہوگی اسی قدر جوش اور خلوص ہوگا۔اور جس قدر تصنع ، بناوٹ اور لفظی بھرمار ہوگی ،شعر تاثیر اور واقعیت سے دور ہوتا جائے گا۔ایثؔار کی شاعری کلاسیکی روایت کی حامل ہونے کے باوجود عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسان دوستی کا پیغام اور احترامِ آدمیت کا درس دیا ہے۔ان قطعات میں سلاست ،روانی ،بیان کی برجستگی اور دلکش اسلوب جلوہ گر ہے۔ایثؔار کے تخیلات بلند ہیں انہوں نے محض اپنے تخیل ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قطعات میں علم بدیع و بیان کی رنگینی سے اس فن کو چار چاند لگایا ہے۔جذبات نگاری ہو یا فطرتِ انسانی کی عکاسی انہوں نے نادر تشبیہات و استعارات کے ذریعے ان کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔مجموعی اعتبار سے یہ قطعات بامقصد ،گراں قدر اور فنی کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔

حوالے

۱۔شاعری کیا ہے،ڈاکٹر عبادت بریلوی،ص۹،ادارۂ ادب وتنقید،لاہور

۲۔اردو شاعری پر ایک نظر،ص۲۸ ، بک امپوزیم،سبزی باغ پٹنہ

۳۔اردو شاعری پر ایک نظر،ص۱۳، بک امپوزیم،سبزی باغ پٹنہ

۴۔شاعری کیا ہے،ڈاکٹر عبادت بریلوی،ص۲۲،ادارۂ ادب وتنقید،لاہور

۵۔اردو شاعری پر ایک نظر،ص۱۵۱، بک امپوزیم،سبزی باغ پٹنہ

۶۔زاویہ نظر باردوم،ڈاکٹر شفیق اعظمی،ص۱۳۶

۷۔بحوالہ مضمون،مظہر امام: پروفیسر آل احمد سرور،شعرائے بنگالہ،مرتب الف انصاری ص۸۲

۸۔اردو غزل،ڈاکٹر کامل قریشی،ص۱۱

۹۔غزل اور غزل کی تعلیم،اختر انصاری،ص۳۹،مکتبہ عالیہ،لاہور

۱۰۔اردو شاعری کا فنی ارتقا،ڈاکٹر فرمان فتح پوری،ص۴۲،اردو اکیڈمی،سندھ

۱۱۔روایت اور انفرادی صلاحیت (ترجمہ مختار صدیقی)،ٹی ایس ایلیٹ،ص۱۸،سویرا لاہور

۱۲۔شعر العجم،شبلی نعمانی،ص۱۰،دار المصنفین شبلی اکادمی،اعظم گڑھ

۱۳۔شعر العجم مولانا شبلی نعمانی،ص۳۴،معارف پریس اعظم گڑھ

۱۴۔یوسف حسین خان،اردو غزل،ص۱۷،آئینہ ادب،لاہور

۱۵۔روحِ تغزل،یوسف حسین خان،(مشمولہ) ماہ نو،ص۴۷،لاہور

۱۶۔مقدمہ شعر وشاعری،مولانا الطاف حسین حالی،ص۱۷۴،پاپولر پبلشنگ ہاوس،لاہور

۱۷۔ڈاکٹر سید تقی عابدی،رموزِ شاعری،ص۵۷،القمر انٹر پرائزز،لاہور

۱۸۔نظمِ جدید کی کروٹیں،وزیر آغا،ص۱۱،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ

۱۹۔کاروانِ نظم ،ڈاکٹرمحمد حسن، کتاب نما،جنوری ۱۹۶۶ء

۲۰۔نگار،مضمون،اردو نظم کا تاریخی وفنی ارتقاء، پروفیسر احتشام حسین،ص۱۲۹،جنوری ۱۹۵۷ء

۲۱۔ڈاکٹرمحمد حسن،جدید اردوادب،ص۹۵،غضنفر اکیڈمی، پاکستان،کراچی

۲۲۔مجموعہ نظم حالی،حالی،ابتدائیہ(حالی کی کہانی حالی کی زبانی)،ص ۷،لاہور

۲۳۔جدید شاعری،ڈاکٹرعبادت بریلوی،ص۱۵

۲۴۔اردوشاعری کا مزاج،ڈاکٹر وزیر آغا،ص۳۵۵

۲۵۔بحوالہ'اردوزبان وقواعد'(حصہ دوم)،شفیع احمد صدیقی،ص ا،مکتبہ جامعہ نئی دہلی،2008

۲۶۔بحوالہ ماہنامہ،کتاب نما،نئی دہلی،اگست ۲۰۰۸،ص۴۳

۲۷۔اردوشاعری کا فنی ارتقاء ،فرمان فتح پوری،ص308-309

۲۸۔مقدمہ صنفِ رباعی،ڈاکٹرفرید پربتی،ص ۷،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۲۹۔وارداتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،ازمحمد اقبال،ص۲۹۰،ایثار پبلشنگ ھاوزٹرسٹ،بنگلور

۳۰۔اردوشاعری پر ایک نظر،کلیم الدین،حصہ اول،ص ا

۳۱۔تاریخِ ادبِ اردو،رام بابوسکسینہ،ص۹،علمی کتب خانہ،اردو بازار،لاہور

۳۲۔جدید اردوشاعری،عبدالقادرسروری،ص۵۰

۳۳۔مطالعہ وتنقید،ص۲۰۷

باب چہارم

﴾……سید احمد ایثارؔ بحیثیت مترجم……﴿

خالقِ کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا جن میں قوتِ گویائی سب سے اہم ہے،جس کے ذریعے انسان مختلف زبانوں اور علوم سے واقف ہوا۔اس کے علاوہ تسخیر کائنات کے لئے اللہ نے انسان کو تخلیقی قوت سے سرفراز کیا۔آج دنیا میں علم وادب کی جو رونق قائم ہے وہ اسی تخلیقی قوت کا کرشمہ ہے۔علم وادب تمام انسانوں کی مشترکہ میراث ہے چنانچہ مختلف زبانوں کے لوگ اور قومیں جب ایک دوسرے کے قریب آئیں تو انھوں نے زبان ہی کے ذریعے استفادہ کیا۔ایک دوسرے کے علم وادب کو اپنی زبان میں منتقل کر کے انسانی تہذیب کو مالا مال کیا۔لہٰذا علم وادب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کا نام ترجمہ ہے۔ادبیاتِ عالم میں ترجمے کے ذریعے اخذ واکتساب کا ایک سلسلہ جاری وساری ہے۔مختلف زبانوں کے ادب کے جائزے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ زبانوں کے ادب کی نشو ونما کے مختلف مراحل میں دوسری زبانوں کے تراجم کا بڑا دخل رہا ہے۔اس امر کی نشاندہی ظ انصاری نے یوں کی ہے:

> ''نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتی ہیں اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زبانوں کا سہارا لیتی ہیں، یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔اور ترجمہ ہی ایک سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے۔چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔''[1]

ڈاکٹر قمر رئیس کے الفاظ میں:

''ترجمہ نے ہی ایک قوم کے ذخیرۂ علم وادب کو دوسری قوم تک
پہنچایا ہے۔ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو
فیض اٹھانے کا موقع دیا ہے۔اس ذخیرہ میں جیسے جیسے توسیع
واضافہ ہوتا رہا ہے ترجمہ کی رفتار بھی تیز ہوتی رہی ہے یہ کہنا زیادہ
صحیح ہوگ کہ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے
اسباب اورعوامل رہے ہیں وہاں ترجمہ بھی ایک طاقتور محرک کا
رول ادا کرتا رہا ہے۔''[۲]

ترجمہ کے ذریعے ایک زبان دوسری زبان کے اظہار سے متعارف ہوکر وسعت حاصل کرتی ہے۔اسی کے ذریعے جہاں ایک طرف انسانی علوم میں اضافہ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف نئے نئے خیالات و احساسات زبان میں داخل ہوکر زبان کی قوتِ اظہار میں اضافہ کرتے ہیں۔جب دومختلف زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان تبادلۂ خیال اور اظہارِ خیال کے لئے مشکلات پیش آتی ہیں ایسے موقعوں پر ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہی ایک ایسا وسیلہ ہے جو ساری حد بندیوں اورلسانی رکاوٹوں کو عبور کرکے آپس میں محبت کی فضا قائم کرتا ہے۔ترجمہ کی اہمیت وافادیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظ انصاری لکھتے ہیں:

''سقراط اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں،
روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب کر رہ گئی تھیں اگر عربی
زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیاء
کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوامیں نہ لے گئے ہوتے ، بوعلی سینا،
ابن رشد، ابونصر فارابی کے کارنامے، یروشلم ،غرناطہ اور بغداد کے
محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے
انھیں اپنے یہاں منتقل کرکے تاریخ وفلسفے کے اگلے وقتوں کے
لئے محفوظ نہ کرلیا ہوتا۔''[۳]

انسانی علوم اور علم وادب کے فروغ میں ترجمے کا اہم رول رہا ہے۔ترجمے کے ذریعے مختلف زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالا جاتا ہے تاکہ نئے نئے موضوعات سے متعارف ہوسکیں ساتھ ہی نئی ہیئتیں اور انوکھے مفاہیم کے در ذہن وخیال پر وا ہوں۔ جب بھی دو تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوا ترجمہ ہی دونوں کو جوڑنے کا ذریعہ بنا۔ترجمے کی روایت ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ابتداء ہی سے ایسے جوہر قابل میسر آئے جو اردو کے علاوہ دیگر کئی زبانوں پر قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔اردو میں تراجم کا سلسلہ لگ بھگ چار سو سال سے جاری ہے۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو نثر نے ارتقاء کی تمام منازل تراجم کے ذریعے طے کی ہیں۔اور یہ تراجم ابتداء میں عربی وفارسی زبانوں سے کئے گئے۔ارضِ دکن کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اردو زبان کے ارتقاء میں اس کا حصہ برصغیر کے دیگر علاقوں سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ اردو تراجم کا آغاز دکن سے ہوا۔اردو تراجم کے پہلے دور میں زیادہ تر تصوف اور مذہب سے متعلق کتب کے تراجم ہوئے۔میراں جی خدانما اردو کے پہلے مترجم قرار پائے انہوں نے ابوالفضائل عبداللہ کی تصنیف ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا اردو ترجمہ کیا ۔دوسرا اہم ترجمہ ملا وجہی نے نیشاپوری کی فارسی تصنیف دستور عشاق کا ''سب رس'' کے نام سے ۱۶۳۵ء میں کیا۔شاہ ولی اللہ قادری نے ''معرفت السلوک'' کا ۱۷۰۴ء میں اور سید محمد قادری نے ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ کیا۔اسی زمانے میں ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہداء کا فضل علی فضلی نے ''کربل کتھا'' کے نام سے ۱۷۳۱ء میں ترجمہ کیا۔اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے دو بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے بالترتیب ۱۷۷۶ء اور ۱۷۹۵ء میں قرآن مجید کے اردو تراجم کئے۔اسی عہد میں میر عطا حسین خان تحسین نے قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ''نوطرز مرصع'' کے عنوان سے ۱۷۹۸ء میں کیا۔تراجم کے اس پہلے دور میں ترجمے کی کوششیں بیشتر انفرادی سطح پر ہوئیں۔اردو تراجم کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوا۔ڈاکٹر گل کرسٹ نے ہندوستان بھر سے اہل علم حضرات کو جمع کیا اور فارسی،عربی اور سنسکرت کی قابل قدر کتابوں کے تراجم اردو میں کروائے۔ان تراجم میں میر امن کی ''باغ و بہار''،حیدر بخش حیدری کی ''قصۂ لیلیٰ مجنوں''،بہادر علی حسینی کی ''اخلاق ہندی''،خلیل علی خان اشک کی ''داستان امیر حمزہ'' اور نہال چند لاہوری کی ''مذہب عشق'' وغیرہ شامل ہیں۔اردو تراجم کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی باقاعدہ کوشش دہلی کالج سے ہوئی۔اردو تراجم کے تیسرے دور کی ابتداء ۱۸۶۲ء میں سرسید کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی سے

ہوئی۔تراجم کے لئے با قاعدہ ملازمین کا تقرر کیا گیا اور علمی وسائنسی موضوعات پر تراجم کئے گئے۔اس کے علاوہ انجمن پنجاب اور دارالترجمہ حیدرآباد دکن جیسے اداروں نے اردو تراجم کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔اردو تراجم کے سلسلے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ ،انجمن ترقی اردو ہند کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔اردو کے نامور ادیبوں اور شعراء نے عربی، فارسی سنسکرت ،ترکی ،جرمن،اورانگریزی ادب وشاعری کے تراجم کرکے اردوادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔اہم ترجمہ نگاروں میں مولانا ظفرعلی خاں،سجاد حیدر یلدرم، خواجہ منظور حسین ،ڈاکٹر یوسف حسین ،مولانا عبدالماجد دریا بادی ،اور مجنوں گورکھ پوری کے نام سرفہرست ہیں۔

ترجمہ ادبی وتہذیبی ارتقا کی شناخت کا نام ہے۔یہ ایک مشکل عمل ہے جس میں بے انتہا دشواریاں اور پریشانیاں درپیش ہوتی ہیں۔مترجم کو خاردار جھاڑیوں سے گزر کر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہوتا ہے۔ادبی تراجم میں ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں اور ایک شعری ونثری روایت کو دوسری شعری ونثری روایت میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔تجربہ کار،کہنہ مشق اور تخلیقی ذہن رکھنے والا مترجم ان مسائل ومشکلات پر بآسانی قابو پالیتا ہے۔مترجم کے لئے محض یہ کافی نہیں کہ وہ دوسری زبان کے مفہوم کو اپنی زبان میں منتقل کرے بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔اس کے سامنے دو تہذیبیں ہوتی ہیں اسے پورے ثقافتی پس منظر کو اپنی زبان میں سمونا پڑتا ہے۔بقول ڈاکٹر حسن الدین احمد

> ”ترجمہ مصنف کے قلب وذہن کی گہرائیون میں اتر کر اس کے خیال اور فکر کے ابلاغ اور پھر اپنی زبان میں ترسیلِ خیال یا منتقلی کا ایسا عمل ہے جو اصل کے اندازِ ترسیل،طرزِ بیان،ادائے نگارش اور لب ولہجہ کے زیادہ قریب رہتے ہوئے کیا جائے تا کہ دوسری زبان میں منتقل ہونے کے باوجود اصل کا اندازِ تخاطب اور طرزِ تکلم برقرار رہے۔“[۱۲]

ترجمہ محض اصل تخلیق کا درست لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس میں مصنف کے نظریات،تصورات، اور

احساسات کی صحیح ترجمانی ضروری ہے۔ نیز ترجمے میں اصل تصنیف کی حقیقی روح ہونا چاہیے۔ ترجمے میں اصل تصنیف کا زور واثر اشد ضروری ہے، خصوصاً الفاظ کی موزونیت، چستیِ بندش اور حسنِ تربیت کی بنا پر اصل تخلیق معلوم ہونا چاہئے۔ ترجمہ بذاتِ خود ایک فنی کام ہے جس میں مہارت اور مشق بے حد ضروری ہے۔ اور اس کے لئے مترجم میں بلند تخیل، اعلیٰ ذوق اور وسیع مطالعہ جیسی اہم خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے اس میں مترجم مصنف کی شخصیت فکر اور اسلوب سے بندھا رہتا ہے ایک طرف اس زبان کا کلچر جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مترجم کو دونوں کا وفادار رہنا پڑتا ہے۔ یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے لیکن یہ تو ہر مترجم کا مقدر ہے۔ اس دوئی سے اسلوب کی سطح پر، خصوصیت کے ساتھ اس زبان کو فائدہ پہنچتا ہے جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس زبان میں نئے اسالیب کے بہت سے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اردو جملے پر تقریباً ڈیڑھ سو سال سے انگریزی زبان کے جملوں اور اسلالیب کا گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ اسالیب کی یہ تبدیلی دراصل کلچر کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک زبان کا جملہ جب دوسری زبان میں جم کر ترجمہ ہوجائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ دو کلچروں کا وصل ہوگیا۔'' ۵

ترجمہ خصوصاً ادب پاروں کا ترجمہ نہایت مشکل امر ہے کیونکہ ایک زبان کے تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے میں بہت سے مسائل حائل ہوتے ہیں۔ تراجم کی مشکلات کے متعلق مختلف دانشوروں

کے مختلف ومتضاد قول ہیں۔

والٹیر کے مطابق:

''تراجم کسی تخلیق کی کمی میں اضافہ کرتے ہیں اوراس کے حسن کو تہ وبالا کرتے ہیں۔''۶

بیرو کے مطابق:

''کسی ترجمے کی معراج یہ ہے کہ اس میں اصل کی بازگشت ہو''۔۷

سائج کا ماننا ہے کہ:

''ترجمہ اس وقت تک ترجمہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ اپنے الفاظ سے اصل شعر کا آہنگ نہ دے۔''۸

شمس الرحمٰن فاروقی رقمطراز ہیں کہ:

''کوئی بھی ترجمہ اصل کے حسن وخوبی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی فن پارہ کسی دوسرے فن پارے کے ہو بہو نہیں ہوسکتا، ترجمہ بذاتِ خود فن پارہ ہے لیکن اسے ترجمہ کہلانے کا حق اسی وقت ہے جب وہ اصل کی کیفیت یا احساس کو ممکن ترین حد تک خلق کرسکے۔''۹

کسی ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام کتنا مشکل ہے اس سے اہلِ نظر بخوبی واقف ہیں۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں:

''ترجمہ کرنا آسان کام نہیں بلکہ بعض اوقات ترجمہ کرنا طبع زاد تخلیق کرنے سے زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔جب تک

مترجم (ترجمہ نگار) کو دونوں زبان پر پورا پورا عبور حاصل نہ
ہو، وہ دونوں زبانوں کے اسالیبِ بیان، لفظی اور معنوی خوبیوں
، محاورات وتشبیہات، لسانی پس منظر، اور زیرِ ترجمہ نثر پارے کے
مصنف اور موضوع سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتا ہو، ترجمہ
نگاری میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔[۱۰]

مترجم ترجمے میں تخلیق کار کی طرح آزاد نہیں ہوتا اس کے فکر کی ڈور مصنف کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تخلیق کار کہیں تخلیقی زبان میں بات کرتا ہے تو کہیں علمی واستدلالی زبان اپناتا ہے۔ کہیں جذبات کا بہاؤ ہوتا ہے تو کہیں احساس اجاگر ہوتا ہے۔ ایسے میں مترجم کا بنیادی اور اہم فریضہ ہے کہ وہ اصل مفہوم کو ترجمہ میں ادا کرے کیونکہ ہر لفظ اپنے اندر ایک وسیع کائنات رکھتا ہے چنانچہ مترجم کو ہر لمحہ مصنف کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے مصنف کے لہجے، بیان کے تیور، اور ترسیل پر توجہ ضروری ہوتی ہے۔ ترجمہ کے ضمن میں یہ بات بھی زیرِ بحث رہتی ہے کہ ترجمہ لفظی ہونا چاہئے یا با محاورہ اور ترجمہ کرتے وقت اصل متن کا مفہوم زیادہ اہم ہے یا اس کی ہئیت۔ چنانچہ ترجمے کے مختلف طریقوں کے متعلق جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

''ترجمے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اصل
متن کا صرف لفظی ترجمہ کردیا جائے اور بس (اسے ترجمہ کرنا
نہیں کہتے مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں) دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ
مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی اور مقبول
اندازِ بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کردیا جائے تیسرا طریقہ یہ
ہوسکتا ہے کہ ترجمہ اس طور سے کیا جائے کہ اس میں مصنف کے
لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور
ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے
زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجمہ سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ

پہنچتا ہے کہ زبان کے ساتھ بیان کا ایک نیا سانچہ سامنے آجاتا
ہے۔دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئ شکل اختیار کر کے اپنی
زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔''[11]

اچھا ترجمہ عام فہم ہونا چاہئے۔اسلوب میں سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے وقت اصل متن کی اہمیت برقرار رہنی چاہئے۔ایسا ترجمہ جس میں مترجم ادیب کی حقیقی روح کو پا کر اپنی زبان کے ماحول و مزاج میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہو تو وہ ایک ایسا گوہر نایاب بن جاتا ہے، جیسے کوئی ادب کا کوئی نایاب شاہ پارہ وجود میں آ کر کسی تہذیب کی ساری روح کا اظہار بن جاتا ہے۔

ترجمے کی ضرورت واہمیت:

ترجمہ کی ثانوی حیثیت کے باوجود اسکی اہمیت سے گریز ممکن نہیں۔اردو کی کلاسیکی نثر، ناول کے ابتدائی نمونے، حالی وآزاد کی جدید شاعری اور اردو افسانے کی اولین کاوشیں مجموعی طور پر ترجمہ ہی کی بدولت ظہور پذیر ہو سکیں۔ترجمے ہی کی عطا ہے کہ امام غزالی، ابنِ رشد، رومی، بوعلی سینا جیسی شخصیات منظر عام پر آئیں۔ترجمے کے ذریعے ہی عمر خیام، رومی، حافظ، سعدی جیسے مفکرین کو مغرب میں شہرت نصیب ہوئی۔اور تراجم ہی کی بدولت ہومر کے تخیل اور فکر نے یورپ میں علوم وفنون کے میدانوں کو متاثر کیا۔اخذ واستفادے کی اس روایت ہی کے باعث تخلیقی ادب کے بہت سے شاہکار وجود میں آسکے۔اس لئے ترجمے کی ثانوی حیثیت بھی اپنی جگہ اہم ہے۔اس کے ذریعے تخلیق کو از سرِ نو زندہ کیا جاتا ہے۔اس کے ذریعے جہاں دوسری زبان کے افکار واقدار سے آگاہی ہوتی ہے وہیں فکر وذہن کو جلا ملتی ہے۔مولوی عبدالحق ترجمے کی افادیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم
بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل
ترجمہ ہوتی ہے۔اس لیے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں

رہتی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری کم سرمایہ اور ادنیٰ ہوں گی۔ اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے۔ اور پھر یہی ترجمے تصنیف وتالیف کے جدید اسلوب اور آہنگ سجائیں گے۔ ایسے میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابلِ قدر، زیادہ مفید، اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔'' ۱۲؎

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ ہے کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیبِ بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو ابھارا، پیرائیہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا۔ اور پیرائیہ اظہار کے نئے سانچے فراہم کئے۔ نیز یہ کہ نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔'' ۱۳؎

مختلف زبانوں کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان زبانوں کی نشو ونما کے عمل میں دوسری زبانوں کے اثر کا بہت دخل رہا ہے۔ حقیقتاً اکثر زبانوں کا سرمایۂ علم و ادب دوسری زبانوں کا رہینِ منت ہے۔ اور کسی بھی زبان کی ترقی کا راز اسی طریقے میں مضمر ہے۔ جس زبان میں دوسری زبانوں سے استفادہ کی صلاحیت جس قدر ہوگی اس کا دامن اتنا ہی وسیع اور فراخ ہوجائے گا۔ ترجمے کی افادیت کے حوالے سے ڈاکٹر احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

''اچھے ترجمے ہی ادب کا رخ موڑنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں نشاۃ ثانیہ ترجموں نے ہی شروع کی ہے ۔ بڑے مصنفین جن کو ادب کا ستون کہا جاتا ہے ترجموں کی ہی آبیاری سے سیراب ہوئے ۔اگر سولھویں صدی میں یونانی اور رومی شاہکاروں کے بے مثل ترجمے نہ ہوتے تو عہدِ الزبتھ کا بیش بہا ادب کہاں سے وجود میں آتا ؟ پلوتارک اور اطالوی نویلہ کے ترجموں کے بغیر شکسپیئر کہاں ہوتا؟ اس طرح جرمنی میں انگریزی ادب کے شاہکاروں کے ترجمہ کے بغیر گوئٹے بھی وجود میں نہ آتا۔''[۱۴۱]

ادبیاتِ عالم کا ارتقاء بڑی حد تک تراجم ہی کی مرہونِ منت ہے۔ترجمہ ہی کی بدولت اردو ادب میں نئے اسالیب نے جنم لیا۔ نیا طرزِ احساس پیدا ہوا۔پیرایۂ اظہار میں سلاست،متانت اور استدلال پیدا ہوئے۔تراجم کی باعث اردو ادب میں نئی نئی اصناف جیسے نظمِ معریٰ،سانیٹ،آزاد نظم،ناول،افسانہ،ڈرامہ روشناس ہوئیں۔نئی اصنافِ سخن کی وجہ سے نئی ہئیتیں ، نئے اسلوب و اندازِ اظہار،اورلوازماتِ فن اردو میں در آئے۔تراجم نے اردو زبان کو وسعت و گہرائی عطا کی اور نئی اصناف کو فنی وقار اور اعتبار بخشا۔

منظوم تراجم کے مسائل:

ادب میں خصوصی طور پر شعری ترجمہ نہایت مشکل فعل ہے۔کیونکہ مترجم کو بیک وقت اس کے معانی و مطالب،اغراض و مقاصد،معنوی و شعری نظام و خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعر کے دل و دماغ میں اتر کر اس کے احساسات و خیالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اشعار کو دوبارہ زندگی دینا ہوتا ہے۔اس لئے شعر کے منظوم ترجمے میں تخلیقی صلاحیت کے ساتھ طبیعت کی موزونیت درکار رہوتی ہے۔چونکہ ہر زبان کے ادب میں تشبیہات،علامات،تلمیحات اور محاوروں کے استعمال کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے ایسی صورت میں لفظی ترجمے

سے زیادہ اہم اس کے مفہوم کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سے الفاظ وتراکیب ایسے ہوتے ہیں جن کے ترجمے سے زیادہ اگر ترجمانی کی جائے تو مفہوم کے اعتبار سے تاثیر برقرار رہ سکتی ہے، لہٰذا شاعری کی اصناف میں فن کی باریکیوں، لطافتوں، تہذیب کی نزاکتوں اور زبان کی خوبیوں کو پیشِ نظر رکھکر ترجمہ کیا جائے تو ترجموں میں زور واثر قائم رہے گا۔ شاعری کے تراجم میں درپیش مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ممتاز حسین اپنے مضمون ''ترجمے کے چند پہلو'' میں لکھتے ہیں:

> ''شاعری میں جو ادب کی ایک مخصوص صنف ہے الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے اس میں اظہارِ خیال ہمیشہ احساس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، شعر کا ترجمہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ وہ اصل خیال کو اپنے احساسات سے گزارے اور یہ طریقۂ کار تقریباً نیم تخلیی ہو جاتا ہے کیونکہ احساسات داخلی ہوتے ہیں اور تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ دوسرے جسد میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ دوسروں کے احساسات پر اتنا قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا جتنا ان کے خیالات پر'' ۱۵

شاعری چونکہ تاثرات کا اظہار ہے اور منظوم ترجموں میں اصل تخلیق کے مجموعی تاثرات کو پیش کرنا ضروری ہوتا ہے، ترجمہ شاعر کے مرکزی خیال یا جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہوتی ہے۔ بقول حسن الدین احمد:

> ''منظوم ترجمہ کرتے ہوئے اصل تخلیق کے مرکزی خیال کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ یہ خود ایک تخلیقی عمل ہے، ہر تخلیقی عمل کی طرح تخلیقی ترجمے کا عمل بھی ایک ایسی پراسرار ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے جو

سراسر نا قابلِ توجیح ہے۔اس کاوش کے بارے میں یہ تعین کرنا بڑا مشکل ہے کہ اکتساب کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں اور وجدان کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔تخلیقی ترجمے کی ہر منزل ایک نیا تجربہ ہوتی ہے۔یہ حقیقتاً دشوار کام ہے۔شرح آرزو اپنی ہی زبان میں اور خود صاحب واردات کو بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔قلب پر جو وارداتیں گزرتی ہیں ان سب کا بیان لب پر یا نوکِ قلم پر نہیں آسکتا۔''۱۶

پروفیسر آل احمد سرور نظم میں استعمال ہونے والے الفاظ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''لفظ ایک پہلو دار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔''۱۷

یعنی مترجم کو لفظ کی پہلوداری پر گہری نظر رکھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کے الفاظ میں :

''اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں۔اس میں علامتوں،استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ترجمے کو حذف واضافہ سے پاک رکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بلیغ اشاروں ،حکیمانہ لفظوں،فلسفیانہ خیالات،جذبے کی رو اور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے اس میں بنیادی خیال،جذبہ یا فکر کے ساتھ زبان،تکنیک،اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا

خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔'' ۱۸؎

نثری ترجمہ اور منظوم ترجمہ کے مزاج میں ایک حد تک امتیاز پایا جاتا ہے۔نثری ترجمہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو متعلقہ علوم میں مہارت رکھتا ہو اور تحریر کا ہنر جانتا ہو۔لیکن منظوم ترجمہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔اس کے لئے مذکورہ شرائط کے ساتھ طبیعت کا موزوں ہونا بھی ضروری ہے۔ترجمے کے سلسلے میں ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ مترجم کو دونوں زبان پر قدرت حاصل ہو اور ساتھ ہی زبان کی ساخت ،مزاج اور اس کے تاریخی و تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی طرح آگاہی ہو۔اگر مترجم زبان کی باریکیوں اور اس کے تاریخی پس منظر سے نا واقف ہو تو اچھا ترجمہ نگار نہیں بن سکتا۔ترجمے کے عمل کے دوران آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم کی زبان و ادب کی پر گہری نظر ہو اور زبان کی تہذیبی روایات سے بھی واقفیت ہو۔مترجم کو اساسی زبان (Source language) اور حدفی زبان (Target language)دونوں سے واقفیت ہونی چاہئے نیز اپنی زبان پر قدرت حاصل ہونی چاہئے۔ساتھ ہی جس موضوع کا ترجمہ کر رہا ہو اس واقف ہونا ضروری ہے۔بہترین ترجمے میں شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال کا مجموعی تاثر ہوتا ہے۔ترجمے کی زبان دلکش ہوتی ہے نیز اس کے ذریعے ادبی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے۔منظوم ترجمے میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہونی چاہئے۔اور مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف دونوں زبانوں کی شاعری کی روایت سے واقف ہو بلکہ وہ خود بھی موزوں طبع ہو۔شعر کے حسن سے واقف ہو شعری تلازمات سے روشناس ہو۔

غرض ترجمے کا عمل نہایت پیچیدہ اور محنت طلب ہے جو تنقیدی بصیرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ترجمے کی اہمیت کسی بھی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ترجمہ کا مقصد تخلیق کو از سرِ نو پانا ہوتا ہے اس لئے امریکہ میں ترجمے کے لئے دوبارہ تخلیق کا (Recreation) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ترجمے کے ذریعے دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے واقفیت ہوتی ہے۔موجودہ دور ٹیکنالوجی کا تیز رفتار دور ہے۔اس دور میں ہر قوم کو مختلف علوم و فنون کا جاننا ضروری ہے۔ترقی اور ارتقاء کے عمل کو اپنی زبان میں منتقل کئے بغیر کوئی بھی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔چونکہ جس قدر آسانی اپنی زبان میں افہام و تفہیم سے ہوتی ہے دوسری زبان میں ممکن نہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ان علوم کو اپنی زبان میں ڈھال لیا جائے اور ترجمہ ہی اس کا واحد وسیلہ ہے۔

الف۔کلامِ اقبالؔ کے منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ

اقبالؔ کا شمار ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو ماضی کا اثاثہ ہونے کے ساتھ مستقبل کا بھی حصہ بنے ہیں۔اور جن کی پہلو دار اور ہمہ گیر شخصیت زمان ومکان کی حدود وقیود سے بالاتر ہے۔تخیل کی نیرنگی وندرت فکر وفن کی عظمت ،اور زبان واسلوب پر غیر معمولی قدرت ومہارت نے بیسوی صدی کے شعراء میں انھیں مثالی عظمت عطا کی۔اقبالؔ نے شاعری کے لئے اردو اور فارسی زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔ان کی بلند پایہ فکر سے مملوفن پاروں نے برِعظیم کے اندر اور باہر خاص وعام کو اپنی جانب راغب کیا۔چنانچہ متعدد اصحاب نے دنیائے ادب کی نئی اور مسحور کن آواز کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کی۔اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر یوسف کمال رقمطراز ہیں:

> ’’اپنے غیر معمولی مبسوط فکر وفلسفہ اور چونکا دینے والے شاعرانہ اسلوب کی بنا پر اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مترجمین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔‘‘[۹۱]

اقبالؔ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ہندوستان میں عوام کے ربطِ باہمی کا وسیلہ تھی۔اس لئے اقبال نے اس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا۔اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ ایسی عمیق ودقیق فلسفیانہ فکر پر مشتمل ہے جسے اقبال اثر انگیزی ،دلکشی اور جامعیت کے ساتھ اردو میں پیش نہیں کر سکتے تھے جتنی دلکشی اور کامیابی کے ساتھ انھوں نے فارسی اور انگریزی میں بیان کیا۔لہٰذا انھوں نے عالمی وآفاقی تناظر میں پورے کرہ ارض تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے فارسی اور انگریزی زبان کو منتخب کیا۔چونکہ ہندوستان اور اطراف واکناف میں بسنے والے شائقینِ اقبال کا ان تینوں زبان سے واقف ہونا مشکل تھا،چنانچہ افکارِ اقبال سے

متعارف ہونے کے سلسلے میں تراجم کا پہلو زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ کیونکہ جس قدر آسانی اپنی زبان میں افہام وتفہیم کی جاسکتی ہے دوسری زبان میں اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اقبال کے کلام کو ان زبانوں میں ڈھالا جائے جن کے قارئین تک پہنچانا مقصود ہے۔ اس امر کی صراحت رحمت یوسف زئی نے یوں کی ہے:

''ترجمے تفہیمِ اقبال میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زبانوں کے فاصلے دلوں کے فاصلے نہیں ہوتے، زبانوں کا اختلاف تراجم کی بدولت ختم ہوجاتا ہے۔ یوں بھی ادبی خزانے کو وسیع کرنے کے لیے دوسری زبانوں کے شاہکار ترجمہ کرکے اپنے ادب میں داخل کرنا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بھارت میں تقسیمِ ہند کے بعد اقبال کے مترجم کی حیثیت سے کئی اہلِ قلم ابھرتے ہیں۔ مترجمین کی اس صف میں اردو انگریزی، ہندی کشمیری، تلگو، مراٹھی، پنجابی، بنگلے، عربی اور ڈوگری جیسی زبانوں کے مترجمین کا نام لیا جاسکتا ہے۔''[۲۰]

اقبال کے جملہ فارسی شعری مجموعہ کلام، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، زبورِ عجم، ارمغانِ حجاز، پس چہ باید کرد کو ہندوستان میں فارسی زبان سے روشناس کروانے اور اردو کے دامن کو اقبال کے فارسی کلام کے جواہر پاروں سے مزین کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان تصانیف کو اردو کے قالب میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ متعدد مترجمین نے اقبال کی فارسی تخلیقات کو نثری یا منظوم تراجم کی صورت میں اردو زبان کے لبادے میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فخر عالم اعظمی لکھتے ہیں:

''اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں ترجمے کا ایک اہم سبب اقبال کا فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کا شاعر ہونا بھی ہے۔ انھوں نے اردو

داں طبقے کو اپنی اردو شاعری کی تپش و حرارت سے اتنا گرما دیا تھا
کہ اردو والے اپنے اس عزیز اور عظیم شاعر کی فارسی کی طرف
رجعت کے کربِ فراق کو برداشت نہ کر سکے اور ان کے فارسی
کلام کے مضامین کو اپنا لسانی حق اور ورثہ تصور کرتے ہوئے اس کو
اپنی زبان کا سرمایہ بنانے میں بڑے خلوص کے ساتھ منہمک
ہو گئے۔[۲۱]

جہاں تک اقبالؔ کے فارسی شعری مجموعوں کے اردو تراجم کا تعلق ہے منظوم ترجمہ کی صورت میں کلامِ اقبال کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اردو اور فارسی زبانوں کی گہری لسانی قربت نے ان مترجمین کا کام آسان بنا دیا۔ اور انھوں نے اقبالؔ کی فارسی تخلیقات کو اردو کے قالب میں بحسن و خوبی ڈھالا ہے۔ ان مترجمین کی عمدہ کاوشوں کو ڈاکٹر فخر عالم اعظمی سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہمارے مخلص مترجمین نے بڑی مغز زنی اور جانفشانی کے ساتھ
اقبال کے فارسی کلام کو اردو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی
ہے۔ فاضل مترجمین کا یہ کارنامہ لائق صد داد و تحسین ہے کہ جس
زبان کو شاعر مشرق نے اپنی عمیق، دقیق، اور پیچیدہ فکر کے لئے کم
تر خیال کیا۔ مترجمین کرام نے اسی نو عمر اور کم سن زبان میں اقبال
کے ''بحر خیالات'' کے ''گہرے پانی'' کو جذب کرنے کی سعی
مشکور کی اور اس طرح اقبال کی مکمل تصویر کو اردو کلام کے آئینے
میں عکس بار کیا۔''[۲۲]

اقبالؔ کے افکار کو مکمل یا جزوی تراجم کی صورت میں منظرِ عام پر لانے کی جو کاوشیں ہوئی ہیں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئیں ہیں۔ یہ تراجم ایک خاص لسانی اور فکری رجحان کا نتیجہ ہیں۔ ان مترجمین نے عوام کے

ذوق اور لسانی ضرورتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ترجمے کئے ہیں۔ان مترجمین کا اصل مقصد یہ ہے کہ اقبال شناسی کا دائرہ وسیع ہو اور فکرِ اقبال کی تفہیم آسان ہو جائے۔کلامِ اقبال کے مترجمین کی اس کہکشاں میں ہر مترجم ایک روشن ستارے کی طرح ہے۔کلامِ اقبال کی تراجم کی فہرست درج ذیل ہے۔

کلامِ اقبال کے اردو تراجم

پیامِ مشرق: شبیر علی سرخوش،عبدالرحمٰن طارق،مضطر مجاز

اسرارِ خودی: جسٹس ایس اے رحمٰن،عبدالرشید فاضل،عصمت جاوید

رموزِ بر خودی؛ عصمت جاوید،غلام دستگیر شہاب

جاوید نامہ: انعام اللہ خاں ناصر،رفیق خاور،مضطر مجاز

زبورِ عجم: جسٹس ایس اے رحمٰن،عبدالرحمٰن طارق

ارمغانِ حجاز: عبدالرحمٰن طارق،مضطر مجاز،منور لکھنوی

پس چہ باید کرد: ظفر احمد صدیقی،مضطر مجاز،رفیق خاور

کلامِ اقبال کے انگریزی تراجم

عبدالحلیم — THE MOSQUE OF CORDOA

نواب محمود علی خاں ٹائرو — REMONSTRANCE AND THE RESPONSE TO THE REMONSTRANCE

کے این سود — SELECTIONS FROM GHALIB AND IQBAL

خشونت سنگھ — COMPLAINT AND ANSWER

کے جی سیدین — IQBAL'S POETRY AS TRANSLATED BY KG

	SAIYIDAIN
نعیم صدیقی	BAAL-I-JIBREEL
پروفیسر سراج الدین	JAVID NAMA TRANSLATION OF MUNAJAT

کلامِ اقبال کے متفرق تراجم

پروفیسر سیف بن سلطان	شکوہ جوابِ شکوہ (عربی)
غلام رسول کامگار کشتواڑی	رموزِ بے خودی (کشمیری)
سلطان الحق شہیدی	پیامِ مشرق (کشمیری)
غلام قادر اندرابی	بالِ جبریل، مثنوی پس چہ باید کرد، جاوید نامہ (کشمیری)
سری پاد جوشی	ملانچے اقبال (مراٹھی)
ستیو مادھوراوٴ پگڑی	بانگِ درا (مراٹھی)
موتی لال پشکر	اقبال کادیہ درشنم (سنسکرت)

یوں متعدد مترجمین نے اقبال کی منشاء اور مافی الضمیر کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی سعی کی ہے۔ان میں وہ تراجم بھی ہیں جو پیامِ اقبال کے آئینہ دار ہیں اور وہ بھی جو ان کی نقطۂ نظر کے مطابق نہیں۔غرض اپنی ادبی ،معنوی اہمیت کے پیشِ نظر یہ تراجم ان کے لئے فکرِ اقبال سے آگاہی کا وسیلہ ہیں جو فارسی زبان سے نا واقفیت کی بنا پر اقبال کے فن پارں سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

عہدِ حاضر میں سید احمد ایثاؔر کا شمار اقبال کے اہم مترجمین میں ہوتا ہے۔ایثاؔر مترجمینِ اقبال میں واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اقبالؔ کے جملہ فارسی کلام یعنی پیامِ مشرق، جاوید نامہ، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم، ارمغانِ حجاز، اور پس چہ باید کرد کا مکمل اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ تراجم کمیت کے ساتھ ساتھ

بہ لحاظِ کیفیت بھی اردو ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ان تراجم کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایثآر نے اقبآل کے فکر وفن کو کس قدر اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

ایثآر نے ترجمے کے ساتھ فارسی متن کو بھی قارئین کی سہولت کے لئے شامل کر دیا ہے جس سے نہ صرف اقبآل کی فارسی شاعری کی لطافت وشیرینی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ موازنہ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ایثآر نے مترجم کے علاوہ ایک محقق کا بھی فریضہ سرانجام دیا ہے۔اپنے مقدموں کے ذریعے بہت سا علمی مواد بھی پیش کیا ہے۔ان مقدموں میں قرآنی تلمیحات، واقعات واحادیثِ نبوی، تاریخی معلومات اور متعدد شخصیات کے متعلق معلومات بھی ملتی ہیں۔اس باب میں ایثآر کے منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

تعارفِ اسرارِ خودی ورموزِ بے خودی:

علامہ اقبآل کا شمار اردو کے چند نمائندہ ترین شعراء میں ہوتا ہے۔اقبآل ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔لیکن انہوں نے خود کو نہ کبھی فلسفی مانا اور نہ شاعر بلکہ ایک محرمِ راز اور پیغامبر کی حیثیت سے خود کو متعارف کروایا۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور اپنے کلام کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔اس سلسلے میں ان کی شہرۂ آفاق مثنوی ''اسرارِ خودی''، علمی ادب کے شاہکاروں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔یہ اقبآل کی پہلی فارسی تصنیف ہے جس کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔اس مثنوی میں اقبآل نے اپنے افکار وتصورات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔اس میں انہوں نے ایک ایسا ضابطۂ حیات پیش کیا ہے جس کا محور اور مرکز خودی ہے۔خودی ان کے فلسفے کا نقطۂ عروج ہے۔اقبال کا نظریہ خودی اسلامی نظریات سے ماخوذ ہے جس کا سرچشمہ قرآن مجید اور احادیثِ رسول ہیں۔اس میں انہوں نے قرآنی تعلیمات بنا پر فلسفہ کو بیان کیا ہے اور اسی کے ذریعے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور اسے عمل پر

آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اقبالؔ کے نزدیک انسانی کامیابی کا انحصار خودی کی پرورش وتربیت پر ہے کیونکہ خودی کے ذریعے انسان حق وباطل کی جنگ میں سرخرو ہوسکتا ہے۔اگر خودی پائیدار ہوتو فقر میں بھی بادشاہی کی شان ہوتی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ متحرک نظر آنے لگتا ہے۔اسرارِخودی کے دیباچے میں اقبالؔ نے خودی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستیز ہوتے ہیں۔یہ پراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا انا یا میں جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی خودی عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد واقوام کا طرزِعمل اسی نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء وعلماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔''۲۳

خودی کا فلسفہ اقبال کے نزدیک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔بقول میکش اکبرآبادی

''خودی علامہ کے تمام تصورات کا مرکز اور ان کے تمام فلسفہ و شاعری کا محبوب ترین موضوع ہے''۔۲۴

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں:

''ان کے فلسفیانہ تفکر کا آغاز بھی خودی ہے وسط بھی خودی اور
انجام بھی خودی''[۲۵]

اقبالؔ نے اثباتِ خودی کو زندگی کا اصل محرک قرار دیا ہے۔ان کے مطابق اگر انسان صحیح معنوں میں خودی کو حاصل کر لے تو کائنات کو مسخر کرسکتا ہے اور کائنات کی تمام پوشیدہ حقیقتیں اس پر آشکار ہوسکتی ہیں۔خودی دراصل تلاشِ ذات سے لےکر تسخیرِ فطرت کے مرحلوں تک محیط ہے۔یہ جہاں کائنات کی وسعتوں سے ہمکنار کرتی ہے وہیں مسلسل جدوجہد کا تقاضہ کرتی ہے۔اقبالؔ کے کلام میں خودی انسانیت کے اعلیٰ ترین معیاروں اور ذات کے وسیع ترین تخلیقی امکانات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اسرارِ خودی کا بنیادی موضوع اگرچہ خودی ہے تاہم عشق ،فلسفہ،تصوف جیسے اہم موضوعات پر اقبال کے حکیمانہ افکار اس میں موجود ہیں۔اس مثنوی میں اقبال صرف مسلمان ہی سے نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت سے مخاطب ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرے تاکہ انہیں استعمال کرکے وہ اعلیٰ مقاصد تک رسائی حاصل کرسکے اور اپنے اندر حرکت اور بیداری کا جذبہ پیدا کرسکے۔اسرارِ خودی میں اقبال نے خودی کی ماہیئت ،حقیقت،قوت وصلاحیت اور انکی نشوونما اور استحکام کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کیا ہے۔اسرارِ خودی میں تمہید،خودی کی حقیقت،نظامِ عالم میں خودی کی حیثیت ،خودی کی استواری میں تخلیقِ مقاصد کا حصہ،خودی کے استحکام میں عشق ومحبت کا کردار،خودی کے ضعف کا ایک بڑا سبب سوال وغیرہ عنوانات کے ذریعے خودی کی وضاحت کی ہے۔

رموزِ بےخودی:

رموزِ بےخودی اقبال کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔یہ مجموعہ 1918ء میں شائع ہوا۔اقبال اسرارِ خودی کی تکمیل ہی کے زمانے سے اس مثنوی کا حصہ دوم لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔اصل میں رموزِ بےخودی کی تصنیف کوئی نیا منصوبہ نہ تھا۔ بلکہ ''اسرارِ خودی''ہی کی توسیعی صورت اور اسی کا تسلسل خیال تھی۔اس مثنوی میں اقبال

نےتعلیمِ خودی کا دوسرا رخ پیش کیا ہے۔اور جماعتی نظام میں فرد کوملت میں گم ہو جانے کا درس دیا ہے۔مثنوی ''رموزِ بےخودی'' کا نام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مجموعی طور پر قوم کی باطنی تربیت کے لئےلکھی گئی ہے۔ چونکہ افراد کے مجموعہ کا نام ہی قوم ہےاس لئے ان دونوں مثنوی کے مطالب بڑی ہم آہنگی ہے۔اس میں اقبال نے اپنے تصورِخودی کے بارے میں واضح طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔فرد کے لئے جماعت سے ربط رکھنا بے حد ضروری ہے۔یعنی فرد کی خودی کے لئے اپنے آپ کو جماعت کی خودی میں گم کر دینا ضروری ہے۔

رموزِ بےخودی کا تعلق ملت اسلامیہ کی حیات سے ہے۔اس میں انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر پوری قوم کو خودی کی تربیت وارتقاءاور تسلسل کی راہیں دکھائیں گئی ہیں۔فرداورملت کے باہمی رشتوں کی اہمیت اوران کی استواری کے رہنما اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔اسی کے ساتھ مغرب کی قومیت پرستی کے خلاف آواز بلند کر کے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اگر کوئی فرد کمال کے درجہ تک پہنچنا چاہےتو اسے ایک باشعوراوراعلیٰ مرتبہ ملت کی ضرورت ہے۔یہ ملت اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ ہے۔ڈاکٹر عابد حسین کے لفظوں میں:

> ''یہ فرداورملت کے ربط کا قانون ہے جسے اقبال 'بیخودی' کہتے ہیں۔ان کے نزدیک ایک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اوراستحکام حاصل کر لیتی ہے۔وہ بلنداور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے۔اس کی قوتیں منظّم اور منضبط ہو جاتی ہیں اوراس کی خودی پائیداراور لازوال بن جاتی ہے۔''[۲٦]

علامہ اقبالؔ کے نزدیک بےخودی سے مراد ان کا فلسفۂ حیات ہے۔جوقرآن اوررسالت سے ماخوذ ہے۔اس کے حصول کے لئے سعی پیہم کی ضرورت ہے۔اوراستحکام پراس فلسفۂ حیات کی اساس ہے۔رموزِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت ،دفع مضرت،تعین

> عمل و ذوق حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشو ونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اس طرح ملت و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر' قومی انا کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا بتائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔'' ۲۷

رموزِ بے خودی کا اصل ملتِ اسلامیہ کے اسرارِ حیات کی تشریح ہے۔ اقبال کے مطابق کوئی قوم اس وقت تک اپنی زندگی میں استحکام پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنی تاریخ کو محفوظ نہ کر لے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب دریافت کرنا انسانی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ اجتماع کے مطابق اخلاقی اقدار کے بغیر فرد اپنی تکمیلِ ذات نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فرد اور معاشرے کے ملنے سے تمدن کی تخلیق ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے افراد اور قوم، توحید، لاتخف ولاتحزن، رسالت، اخوت، مساوات، اسلامی حریت، ملتِ اسلامی کی آفاقیت، ملت کی بنیاد، اجتہاد و تقلید، اتباعِ شریعت، نظامِ عالم کی تسخیر، تفسیر سورۂ اخلاص جیسے عنوانات کی وضاحت اس مثنوی میں کی ہے۔

ترجمۂ اسرار و رموز کا جائزہ:

سید احمد ایثارؔ کے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اردو منظوم ترجمے ایک ہی جلد میں بعنوان ''اسرار و رموز'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئے۔ ایثارؔ نے مثنوی اسرار و رموز کے ترجمے میں اپنی مہارت کے جوہر خوب نمایاں کئے ہیں۔ اور اسرار و رموز کو بڑے دلنشیں انداز میں اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان مثنویوں میں موجود اقبال کے خیالات و جذبات کو اپنے تراجم میں من وعن پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ انہوں نے جہاں اقبالؔ کے فکر و تخیل کو صحیح صورت میں پیش کیا وہیں شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ

اکثر مقامات پرترجمہ تخلیقی اورطبع زادمعلوم ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹرسید یحییٰ نشیط :

''اگر فارسی و اردو کی دونوں کتابیں سامنے نہ ہوں تو بعض
مقامات پر اقبال وایثار کی شاعرانہ شخصیت اور دونوں کے جذبات
واحساسات میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔''۲۸

اسرارِخودی کے تمہیدی اشعار میں اقبالؔ نے اپنے پیغام کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔اقبال اپنی قوم کی بے عملی اور زبوں حالی سے پریشان ہیں انھی خیالات واحساسات کو انھوں نے تمہیدی اشعار میں منظوم کیا ہے۔ایثارؔ نے اقبالؔ کے خیالات ،احساسات اور پیغام کو بڑی ہنرمندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ تراجم میں پیش کیا ہے۔اسی سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اقبالؔ:

ذرہ ام مہرمنیر آنِ من است
صدسحرا ندرگریبانِ من است
خاکِ من روشن تراز جام جم است
محرم از نازادہ ہائے عالم است
فکرآں آہوسرِ فتراک بست
کہ ہنوزازنیستی بیروں نہ جست

ترجمہ:

ذرہ ہوں ہم رتبۂ خورشید میں
کس قدر صبحیں مرے دامن میں ہیں
جامِ جم سے خاک روشن تر مری
ان کی محرم ، جونہیں پیدا ابھی

فکر کرتی ہے اس آہو کا شکار
جو نہ ہو پایا ابھی تک آشکار

ان اشعار کے تراجم میں ایثآر نے نہایت کامیابی سے اقبآل کے فکروفن پر قابو پایا ہے۔انہوں نے اصل مفہوم کو کامیابی کے ساتھ ترجمے میں سمویا ہے۔اقبآل پہلے شعر میں کہہ رہے ہیں کہ اگر چہ میں ذرہ ہوں لیکن اس زمانے کو روشن کرنے والا سورج میرا ہے،سینکڑوں صبحیں میرے گریبان میں ہیں۔ایثآر نے یہاں ''صدسحر''کو''کس قدر صبحیں'' کہاہےاور''گریبانِ من''کو''مرے دامن'' سےتعبیر کیا ہے جو مناسب ہے۔دوسرے شعر میں اقبال کہہ رہے ہیں کہ میری خاک جام جم سے بھی زیادہ روشن ہے اور میری ذات کائنات کے ان اسرار سے بھی واقف ہے جو ابھی ظہور میں آئے بھی نہیں۔ایثآر نے اقبآل کی اس فکر کو نہایت کامیابی سے ترجمے میں پیش کیا ہے ۔زیرِنظر اشعار کا ترجمہ فکری وفنی خوبیوں سے مزین ہے۔

اقبآل:

نغمۂ من از جہانِ دیگراست
ایں جرس را کاروانِ دیگراست
اے بسا شاعر کہ بعدازمرگ زاد
چشمِ خود بر بست وچشم ما کشاد

ترجمہ:

میرے نغموں کا جہاں ہی اور ہے
اس جرس کا کارواں ہی اور ہے
کتنے شاعر پائے مرکر زندگی
موندی آنکھ اپنی ہماری کھول دی

ان اشعار کے ترجمہ میں شاعرانہ خوبی ودلکشی موجود ہے۔اس ترجمہ میں ایثآر نے جہاں اقبآل کے تصوروخیال کو کامیابی کے ساتھ ترجمہ میں پیش کیا ہے وہیں غنائیت کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ذیل

میں ترجمے کی چند اور مثالیں پیش ہیں جو اقبال کی فکر کی مکمل آئینہ دار ہیں۔

اقبالؔ:

صد جہاں پوشیدہ اند ذاتِ او
غیر او پیدا است از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را

ترجمہ:

اس کے باطن میں ہیں سو عالم چھپے
غیر ثابت اس کے ہی اثبات سے

دشمنی کا بیج بویا اس نے ہی
اور خود کو غیر سمجھا اس نے ہی
خود بنائے پیکرِ اغیار کو
تا بڑھائے لذتِ پیکار کو

مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ دلکش اور مثالی ہے۔ سادہ و سلیس الفاظ میں ایثارؔ نے اقبال کے تخیل کو گرفت میں لینے کی کامیاب سعی کی ہے۔ بعض جگہوں پر ترجمہ میں اقبالؔ کی فارسی تراکیب کا تاثر قائم رکھنے کے لئے جوں کا توں رکھا ہے مثلاً آخری شعر میں پیکرِ اغیار اور لذتِ پیکار۔ اسرارِ خودی کے منظوم ترجمے میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں ایثارؔ کی زبان شستہ اور ان کا طرزِ بیاں رواں ہے۔ مثال کے طور پر ''در بیان اینکہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است''، جس کا ترجمہ ایثارؔ نے یوں کیا ہے ''اس بیان میں کہ خودی کی حیات

تخلیقِ مقاصد پر منحصر ہے۔''اس باب کے چند اشعار پیش ہیں جن میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی آرزو سے متعین ہوتی ہے۔فطرت کی ہر شئے آرزو پر مبنی ہے آرزو ہی اس دنیا کی حسن و زینت کا باعث ہے۔اور یہ آرزو ہی ہے جس کی بدولت دلوں میں جذبات واحساسات اور تڑپ پائی جاتی ہے۔

اقبالؔ:

زندگی در جستجو پوشیدہ است

اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

ترجمہ:

زندگی پوشیدہ اندر جستجو

جستجو پوشیدہ اندر آرزو

دوسرے مصرعے میں جستجو لفظ اضافی ہے۔جبکہ اقبال کے شعر میں محض پہلے مصرعے میں اس کا استعمال ملتا ہے۔اس مصرعہ کا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا تھا''اصل ہے پوشیدہ اندر آرزو''۔

اقبالؔ:

آرزو را در دل خود زندہ دار

تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو غبار

ترجمہ:

زندہ رکھ سینے کے اندر آرزو

تا کہ بن کر گرد کھو جائے نہ تو

یہاں پہلے مصرعے میں دل کی بجائے مترجم نے سینہ کا استعمال کیا ہے البتہ اصل مفہوم ترجمہ میں واضح ہے یہاں''ترجمہ یوں بھی کیا جاسکتا تھا''زندہ رکھ تو دل کے اندر آرزو''۔

اقبالؔ:

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا

سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

ترجمہ:

سینے میں دل آرزو سے بے قرار

اور چمک سے اس کی سینہ تابدار

اگرچہ پہلے مصرعے میں رقص کے لئے بےقرار کا استعمال کیا ہے لیکن شعر کا مفہوم ادا کر دیا ہے اور شعر کے تاثر بھی برقرار ہے۔ ترجمے کے دوران بعض جگہوں پر ایثاؔر نے بوقتِ ضرورت ترجمہ کی جگہ ترجمانی سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں ضرورتِ شعری کی بنا پر اشعار میں ایک یا دو الفاظ کے ترجمے کے علاوہ فارسی متن کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔

اقبالؔ:

علم از سامانِ حفظِ زندگی است

علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

ترجمہ:

علم وفن سامانِ حفظِ زندگی

علم وفن اسبابِ تقویمِ خودی

اس شعر کے ترجمے میں لفظ 'فن' اضافی ہے۔ لیکن شعر کے مفہوم کے اعتبار سے یہ اضافہ مناسب ہے اور اصل خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔

اقبالؔ:

از محبت می شود پایندہ تر

زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

ترجمہ:

عشق سے ہوتی ہے وہ پائندہ تر

زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

اقبالؔ:

برخوانم زفیضِ پیر رومؒ

دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

ترجمہ:

پھر سناؤں میں فیوضِ پیر رومؒ

دفترِ سر بستۂ اسرارِ علوم

اقبالؔ:

می شود از بہرِ اغراض وعمل

عامل ومعمول واسباب وعلل

ترجمہ:

بنتی ہے خود بہرِ اغراض وعمل

عامل ومعمول واسباب وعلل

''حکایتِ الماس وزغال'' سے چند اشعار اور اس کا ترجمہ پیش ہے۔ حکایت الماس وزغال میں اقبالؔ نے دراصل ہیرے اور کوئلہ کے مکالمے کے ذریعے حکایت بیان کی ہے اور خودی کا پیغام دیا ہے۔ کوئلہ ہیرے سے کہتا ہے کہ اگرچہ ہم دونوں عناصر ترکیبی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں لیکن ایسی کیا خاصیت ہے کہ تیرا مقام تاج شاہی میں ہے اور میرے مقدر میں بھٹی میں جل کر راکھ ہونا رقم ہے۔ اس کے جواب میں الماس کہتا ہے کہ یہ مجھ میں موجود سختی کے باعث ایسا ممکن ہوا ہے حالانکہ ہماری اصلیت میں کوئی فرق نہیں لیکن میں نے اپنی خودی کو مضبوط کر کے خود میں وہ چمک پیدا کی کہ میں سب کی نگاہوں میں بیش قیمت بن گیا ہوں۔

اقبالؔ:

از حقیقت باز بکشایم درے
با تو می گو ہم حدیثِ دیگرے
گفت باالماس درمعدن زغال
اے امینِ جلوہ ہائے لایزال
ہمدمیم وہست و بودِ ما یکیست
در جہاں اصل، وجودِ ما یکست
من بہ کاں میرم بہ دردِ ناکسی
تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی
قدرمن از بدگلی کمتر ز خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک
روشن از تاریکیٔ من مجمر است
پس کمالِ جوہرم خاکستر است
پشت پا ہر کس مرا بر سر زند
بر متاعِ ہستیم اخگر زند
بر سروسامانِ من باید گریست
برگ وسازِ ہستیم دانی کو چیست
موجۂ دودے بہم پیوستۂ
مایہ دارِ اک شرارِ جستۂ
مثلِ انجم روئے تو ہم خوئے تو
جلوہا خیزد ز ہر پہلوئے تو

گاہِ نوردِ دیدۂ قیصر شوی
گاہ زیب دستۂ خنجر شوی

ان اشعار میں موجود معانی و مفاہیم کو ایثؔار نے اپنے ترجمے میں یوں پیش کیا ہے:

اک حقیقت اور عیاں کرتا ہوں میں
قصہ اک دیگر بیاں کرتا ہوں میں
کوئلہ ہیرے سے کیا اک دن سوال
''اے امینِ جلوہ ہائے لایزل''
ہم ہیں ہمدم ایک اپنی ہست و بود
ہے ہماری اصل ایک ہی، اک وجود
خاک ہونا کان میں قسمت مری
ہے رسائی تاج شاہی پر تری
بدگلی سے اپنی ہوتا ہوں میں خاک
حسن سے تیرے دل آئینہ چاک
میری ظلمت نور آتش دان کا
راکھ ہو جانا ہے میری انتہا
ہر کوئی ٹھوکر لگاتا ہے مجھے
بھر کے بھٹی میں جلاتا ہے مجھے
لائق ماتم ہے جو بھی ہے مرا
میرے ساز و برگ کیا، ہستی ہے کیا
میری ہستی بس دھواں ہے منجمد
میرا سرمایہ شرارِ منفرد

مثلِ انجم تیری صورت، تیری خو

حسن برساتا ہے ہر پہلو سے تو

تو ہے نورِ دیدۂ قیصر کبھی

اور ہے زیب دستۂ خنجر کبھی

ترجمہ میں اصل مفہوم پوری طرح جلوہ گر ہے ۔ پہلے مصرعے کا ترجمہ کیا ہے ''ایک حقیقت اور عیاں کرتا ہوں میں'' جبکہ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ میں حقیقت کا ایک اور باب کھولتا ہوں ۔ دوسرے شعر کے مصرعہ اول کا ترجمہ ہے ''کوئلہ ہیرے سے کیا اک دن سوال'' ۔ یہ ترجمہ اس طرح بھی ہوسکتا تھا ''کوئلہ نے ہیرے سے پوچھا اک سوال'' بعض اشعار کے تراجم میں الفاظ وتراکیب کا دلکش اضافہ کیا ہے تو بعض الفاظ وتراکیب کو نادر تشبیہات اور عمدہ اصطلاحات میں پیش کر کے کمال دکھایا ہے ۔کئی الفاظ وتراکیب کو اتنی شگفتگی سے استعمال کیا ہے گویا لڑی میں درتاباں پروئے ہوئے ہوں جن کی تابانی سے قاری متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ''پس کمالِ جوہرم خاکستر است'' کا ترجمہ ''راکھ ہو جانا ہے میری انتہا'' جو قابلِ ستائش ہے۔مجموعی طور پر ترجمہ عمدہ اور دلکش ہے۔ایثارؔ نے اکثر اشعار کا ترجمہ سلیس سادہ اور آسان الفاظ میں کیا ہے۔

اقبالؔ:

پیکرم از پختگی ذوالنور شد

سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

ترجمہ:

پختگی سے میری ہستی نور ہے

جلووں سے سینہ مرا معمور ہے

اقبالؔ:

شیخ از گفتارِ شہ خاموش ماند

بزم درویشاں سراپا گوش ماند

ترجمہ:

شیخ سن کر گفتگو خاموش تھے

ساتھ فقرا بھی سراپا گوش تھے

اقبالؔ:

از خودی مگزر بقا انجام باش

قطرۂ می باش و بحر آشام باش

تو کہ از نورِ خودی تابندۂ

گر خودی محکم کنی پائندۂ

ترجمہ:

رکھ خودی قائم ، بقا انجام بن

بوند ہی رہ کر، تو بحر آشام بن

ہے خودی کے نور سے تابندہ تو

ہے خودی کے زور سے پائندہ تو

یہاں پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں ''خودی مگزر''یعنی ''خودی سے نہ گزر''منفی بات کو مثبت انداز میں پیش کرتے ہوئے'' خودی قائم رکھ'' کہا ہے جو نہایت موزوں ہے۔ دوسرے شعر کا ترجمہ مکمل اور پر تاثر ہے۔

اقبالؔ:

چوں خبر دارم زساز زندگی

با تو گویم چیست رازِ زندگی

ترجمہ:

جانتا ہوں کیا ہے سازِ زندگی
آ بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی

اب چند مثالیں رموزِ بے خودی کے ترجمے سے پیش ہیں۔ رموزِ بے خودی کے ترجمے میں اردو میں موجود فارسی کے قابلِ قبول الفاظ و فرہنگِ اقبال کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے اصطلاحاتِ اقبال من وعن سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں بیک وقت فارسی کلامِ اقبال اور منظوم اردو ترجمہ دونوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ ترجمہ بدلے ہوئے الفاظ کی صورت میں بھی اقبال کے صوت و آہنگ کے قریب رہنے کی ایک شعوری کاوش محسوس ہوتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

اے ترا حق خاتم اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

ترجمہ:

اے کہ تو ہی خاتم اقوام ہے
تجھ پہ ہر آغاز کا انجام ہے

اقبالؔ:

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آب خود می گیرم از سنگِ گراں

ترجمہ:

سخت کوشی میں ہوں خنجر کا جواب
سان کے پتھر سے لیتا ہوں میں آب

اقبالؔ:

پردۂ رنگم شمیم نیستم
صیدِ ہر موجِ نسیم نیستم

ترجمہ:

رنگ ہوں میں پھول کی خوشبو نہیں
دوں ہوا کا ساتھ میری خو نہیں

اقبالؔ:

مثلِ گل از ہم شگافم سینہ را
پیشِ تو آویزم ایں آئینہ را

ترجمہ:

مثلِ گل سینے کو اپنے چیر کے
رکھ دیا آئینہ تیرے سامنے

اقبالؔ:

جانم از صبر و سکوں محروم بود
وردِ من یا حیُ یا قیوم بود

ترجمہ:

دل سکون و صبر سے محروم تھا
ورد بس یا حی یا قیوم تھا

ایثارؔ میں ترجمہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ایثارؔ بھی بعض جگہوں پر مشکلات سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود انہوں نے ترجمہ میں اصل کی کیفیت کو برقرار رکھنے کی حتی المقدور

کوشش کی ہے۔

اقبالؔ قومی زندگی میں فرد کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ جب تک افراد میں قومی تشخص اور ملی شعور پیدا نہیں ہوگا تب تک فرد کی اجتماعی زندگی میں حرکت و عمل اور قوتِ حیات پیدا نہیں ہوسکتی۔ اقبالؔ چاہتے تھے کہ قوم کے سامنے ایک صحت مند معاشرہ بطور نصب العین پیش ہوتا کہ خودی کی تربیت کے ساتھ تکمیلِ ذات کرنے والے افراد اپنی روحانی قوتوں کو ملت کی تعمیر کے لئے کام میں لائیں۔ اقبالؔ نے فرد اور جماعت کے باہمی ربط کو گہرائی سے سمجھا۔ ان کے نزدیک رموز بے خودی محض فرد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہئیت اجتماعیہ کا نام ہے۔ اس لئے کوئی مسلمان ملت سے جدا ہوکر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔

اقبالؔ:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینۂ یکدیگر اند
سلک و گوہر کہکشاں واختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

ترجمہ:

ربطِ ملت فرد کو ہے حسبِ حال

اس کے جوہر کو ہے ملت سے کمال

با جماعت تا بہ امکاں یار رہ

رونق ، ہنگامۂ احرار رہ

حرز جاں ہو جائے قولِ آنحضورؐ

''ہے جماعت سے سدا شیطان دور''

فرد و قوم آئینۂ خود یک دگر

کہکشاں و اختر و تار و گہر

فرد کو ملت سے حاصل احترام

پاتی ہے افراد سے ملت نظام

اس ترجمے میں روانی اور ترنم برقرار ہے۔ ایثآر نے اقبال کے افکار کی روح کی ترجمانی بڑے سلجھے اور خوبصورت انداز میں کردی ہے۔ پہلے مصرعہ میں ''رحمت'' کے لئے ''حسبِ حال'' لفظ کا استعمال کھٹکتا ہے۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ فرد کے لئے جماعت سے ربط پیدا کرنا رحمت کا باعث ہے اور اس کے تمام جوہروں کو ملت ہی کے باعث کمال حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کا ترجمہ اصل کا عکس ہے۔ وہیں دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ''تا توانی'' کے لئے ''تا بہ امکاں'' ترجمہ قابلِ ستائش ہے۔ اسی طرح ''ہست شیطاں از جماعت دورتر'' کا ترجمہ ''ہے جماعت سے سدا شیطان دور'' عمدہ ہے۔ علاوہ ازیں اس خدشے کے پیش نظر کہ اقبال کے نازک مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے دوران کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے، ایثآر نے فارسی الفاظ وتراکیب کو تبدیل نہیں کیا مثلاً ہنگامۂ احرار، حرزِ جاں، آئینہ، کہکشاں واختر وغیرہ۔

اقبآل:

در جہانِ کیف وکم گردید عقل

پے بہ منزل برد از توحید عقل

ورنہ ایں بیچارہ رامنزل کجاست
کشتیٔ ادراک راساحل کجاست

ترجمہ:

عقل سرگرداں جوتھی شام وپگاہ
پا گئی توحید سے منزل کی راہ
ورنہ اس بیچاری کی منزل کہاں
کشتیٔ ادراک کو ساحل کہاں

بلاشبہ ترجمہ میں اصل جیسا رنگ پیدا کرنا امر محال ہے تاہم ایثاؔر نے اقباؔل کے رنگ و آہنگ کو پیش کرنے کی بھرپور کاوش کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ''کیف وکم'' کی جگہ مترجم نے ''شام وپگاہ'' استعمال کیا ہے۔ وہیں دوسرے مصرعے میں لفظ عقل کو نظر انداز کیا ہے لیکن ترجمہ میں مفہوم پوری طرح جلوہ گر ہے۔

اقباؔل:

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند

ترجمہ:

قطع اس درجہ اخوت ہو گئی
ملک پر تعمیرِ ملت ہو گئی
مرکزیت جب وطن کو ہم نے دی
نوعِ انسانی گروہوں میں بٹی

ان اشعار کا ترجمہ دلکش ہے اور مفہوم سے قریب ہے البتہ مترجم نے ''آں چناں'' کو اس طرح کے

بجائے ''اس درجہ'' کے معنی میں لیا ہے جو مناسب ہے۔علاوہ ازیں شمع محفل کی بجائے مرکزیت کہہ کر تشریحانہ انداز اپنایا ہے۔چند اور مثالیں پیش ہیں۔

اقبالؔ:

حرفِ بے صوت اندر ایں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم

ترجمہ:

اس جہاں میں ہم تھے حرفِ بے صدا
مصرعِ موزوں رسالت نے کیا

اقبالؔ:

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم، ما اقوام را

ترجمہ:

رونقِ بزمِ جہاں ہم ہو گئے
خاتمِ رسل آپؐ، ہم اقوام کے

اقبالؔ:

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ممکن است

ترجمہ:

عشق مومن سے ہے مومن عشق سے
عشق ناممکن کو بھی ممکن کرے

اقبالؔ:

آں کند تعمیر تا ویراں کند
ایں کند ویران کہ آباداں کند

ترجمہ:

وہ کرے تعمیر، ڈھانے کے لئے
یہ کرے ویراں بسانے کے لئے

اقبالؔ:

عقل گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو

ترجمہ:

عقل بولے شاد رہ آباد رہ
عشق بولے بندہ بن آزاد رہ

منظوم ترجمے کی بہ نسبت ایک زبان کے نثری فن پارے کو دوسری زبان کی نثر میں منتقل کرنا قدرے آسان ہے لیکن کسی زبان کے نظم کے منظوم ترجمے کے لئے حد درجہ احتیاط اور فنکارانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسرار و رموز کے منظوم ترجمے کے مطالعے سے ایثارؔ کی نہ صرف شاعرانہ عظمت و انفرادیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بہ اعتبارِ زبان و بیان ان تراجم میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اس منظوم ترجمے کی زبان صاف، سادہ اور بیان نہایت رواں ہے۔ مترجم کتنا ہی لائق اور قابل کیوں نہ ہو جب تک دونوں زبانوں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتا ہو یعنی کسی زبان کے فن پارے کا ترجمہ کرنا مُقصود ہے تب تک ترجمے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اسرار و رموز کے منظوم ترجمے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایثارؔ فارسی و اردو زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں اور دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان مثنویوں کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ ان کے تراجم اصل متن سے نہ صرف قریب تر

ہیں بلکہ سلاست سے بھی پر ہیں۔اسرار ورموز کا یہ اردو منظوم ترجمہ اردو کے دیگر منظوم ترجموں میں منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

پیامِ مشرق کا تعارف:

پیامِ مشرق اقبال کا تیسرا فارسی مجموعہ کلام ۱۹۲۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس کتاب کے دیباچہ میں اقبال نے یہ واضح کیا ہے کہ اس تصنیف کا محرک گوئٹے کا مغربی دیوان ہے۔اس کا مقصد ان اخلاقی اور مذہبی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔پہلا حصہ بعنوان لالہ طور میں رباعیات ہیں ان میں فلسفہ کے ادق مسائل نظم کئے گئے ہیں۔ان رباعیات میں اقبآل نے خودی، بےخودی، عقل، عشق، یقیں، فقر، استغنا جیسے مضامین کو بہت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔دوسرے حصہ کا عنوان ''افکار'' ہے جو اقبآل کی فکر انگیز نظموں پر مشتمل ہے۔اس میں اقبآل نے خدا، انسان اور کائنات سے متعلق علمی و اہم نکات شاعرانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔تیسرا حصہ ''مئے باقی'' کے عنوان سے موسوم ہے جس میں اقبآل کی دلکش غزلیات ہیں یہ حصہ کتاب کا سب سے دلکش ترین حصہ ہے۔ بقول یوسف سلیم چشتی:

> ''یہ حصہ اس کتاب کا سب سے زیادہ دلکش حصہ ہے اور میرا قیاس ہے کہ اگر یہ حصہ اس کتاب میں شامل نہ ہوتا تو شاید یہ کتاب دو یا تین مرتبہ سے زیادہ شائع نہ ہوتی۔''۲۹

چوتھا حصہ بعنوان ''نقش فرنگ'' ہے جس میں حکمائے مغرب پر تنقید ہے۔پانچواں حصہ ''خردہ'' چند قطعات اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے اس میں حکیمانہ نکات کو ظریفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ پیامِ مشرق کا جائزہ:

پیامِ مشرق کا منظوم اردو ترجمہ ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پیامِ مشرق کا زیرِ نظر ترجمہ اپنی مضامین کی فکری و فلسفیانہ پیچیدگی، اور مضامین کے تنوع کے باعث خاصہ مشکل فعل تھا تاہم ایثآر نے ایک پختہ کار مترجم ہونے کے باعث بڑی عمدگی سے تمام نظموں کے لہجوں کو برقرار رکھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اقبآل کے اس تخلیقی کرب کو بھی اپنے اظہار کی گرفت میں لیا ہے جسے اقبآل نے اپنی غیر معمولی قادرالکلامی، منفرد لفظیات، اور محاکات کے ذریعے مخصوص اسلوبِ اظہار میں اپنایا تھا۔ ذیل میں ان تراجم کا تنقیدی جائزہ پیش ہے۔ پیش کش سے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ جو مثالی اور دلکش ہے۔ مترجم ایثآر نے اصل کا عکس پیش کرنے میں حد درجہ کمال دکھایا ہے۔ ایسے کئی مقامات ہیں جہاں اصل کا گمان ہوتا ہے۔

اقبآل:

اے امیر کامگار اے شہر یار
نوجوان و مثلِ پیراں پختہ کار

ترجمہ:

اے امیر! اے بادشاہِ کامراں
جیسے پیراں پختہ کار اور نوجواں

اقبآل:

ہمتِ تو چوں خیالِ من بلند
ملتِ صد پارہ را شیرازہ بلند

ترجمہ:

تیری ہمت، جوں میری فکرِ بلند
ملتِ صد پارہ کی شیرازہ بند

اقبآل:

تاشناسائے خودم خود بیں نیم

با تو گویم او کہ بود و من کیم

ترجمہ:

خود سے جب واقف ہوں بیجا زعم کیوں

سن ذرا وہ کون تھا، میں کون ہوں

اقبالؔ:

حق رموزِ ملک و دین بر من کشود

نقشِ غیر از پردۂ چشم ربود

ترجمہ:

حق نے سکھلائے رموز ملک و دیں

نقش غیر اب میری نظروں میں نہیں

یہ تراجم ایثارؔ کی تخلیقی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا عمدہ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایثارؔ متعدد نازک مقامات سے بآسانی گزرے ہیں۔ اگر بے ساختگی، روانی اچھے ترجمے کی خصوصیات ہیں تو یہ خصوصیات ان کے ترجموں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ لالۂ طور کی رباعیات کے ترجمے میں ایثارؔ نے اپنی مہارت کے خوب جوہر نمایاں کئے ہیں اور بڑے دل نشیں انداز میں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اقبالؔ:

سحر می گفت بلبل باغباں را

دریں گل جز نہالِ غم نہ نگیرد

بہ پیری میرسد خارِ بیاباں

ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

ترجمہ:

یہ بلبل نے بتایا باغباں کو

اگاتی ہے نہالِ غم ہی یہ خاک
پہنچ جاتے ہیں پیری تک بھی کانٹے
جوانی ہی میں ہو جاتے ہیں گل پاک

اقبالؔ:

رہے در سینۂ انجم کشائی
ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے بر خود کشا چوں دانہ چشمے
کہ از زیر زمیں نخلے برآئی

ترجمہ:

خبر رکھتا ہے تاروں کے نہاں سے
نہ جانے تو نے پر احوال اپنے
ذرا دیکھ آپ خود کو مثلِ دیوانہ
زمیں سے تا کہ پودا بن کے نکلے

ان رباعیات میں اقبال کا فکر و فن اپنی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس فکری رفعت اور فنی حسن کو ترجمے میں برقرار رکھنا بڑا دشوار فعل تھا۔ ایثارؔ نے ان مشکل مراحل کو پار کرنے کی پوری کوشش کی ہے اکثر مقامات پر کامیابی بھی حاصل کی۔ کئی مشکل مقامات پر ترجمہ کی جگہ ترجمانی سے کام لیا۔ البتہ بعض مقامات پر لڑکھڑائے بھی ہیں۔ درج ذیل رباعی کا ترجمہ دیکھیں:

اقبالؔ:

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید

شہیدِ سوز و سازِ آرزو یم

ترجمہ:

مثالِ بو پریشاں پھر رہا ہوں
نہیں معلوم میں کیا چاہتا ہوں
بر آئے آرزو یا بر نہ آئے
میں سوز آرزو پر ہی فدا ہوں

پہلے مصرعے میں لفظ گلشن کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرا اور تیسرا مصرعے کا ترجمہ اصل سے بے حد قریب ہے۔ اور آخری مصرعہ میں شہید کو فدا سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اور مثال پیش ہے:

اقبالؔ:

شہید نازِ او بزمِ وجود است
نیاز اندر نہادِ ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب
بہ سیمائے سحر داغِ سجود است

ترجمہ:

کہ و مہ ہیں شہید نازِ دلبر
ہے فطرت کا تقاضا عجز یکسر
نظر آتا نہیں یہ مہرِ تاباں؟
ہے داغِ سجدہ سیمائے سحر پر

اس رباعی کے ترجمے میں ترجمانی سے کام لیا گیا ہے۔ ایثارؔ نے اس ترجمے میں نقشِ اول کی روح سے آشنا کروانے کے لئے اگر چہ سہل اور آسان فہم لفظیات کا سہارا لیا ہے لیکن اقبالؔ کے ان افکار کی ترسیل عام زبان میں ممکن بھی نہ تھی۔ اس مجبوری کے عالم میں انہیں شاعرانہ زبان کا سہارا لینا پڑا ہے۔ دوسرے مصرع

کا ترجمہ یقیناً بالکل الٹ معلوم ہوگا لیکن منظوم ترجمہ میں ہر جگہ ترجمہ نہیں کیا جاتا ہے کہیں کہیں ضرورتِ شعری کی بنا پر ترجمانی بھی کرنی پڑتی ہے اور اصل پیغام و مدعا کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اس دوسرے مصرع کا کچھ اور منظوم ترجمہ کیا جاسکتا ہے مگر غالباً ترجمہ نگار کے ذہن میں اس کا وہ معنی تھا جو مصرع کی زیریں لہروں میں رواں دواں تھا اس لیے انہوں نے اسی کو لفظوں کی زبان دے دی اور ظاہری لفظوں سے صرفِ نظر کیا۔

اقبالؔ:

من اے دانشوراں در پیچ و تابم
خرد را فہم ایں معنیٰ محال است
چساں در مشت خاکے تن زند دل
کہ دل دشتِ غزالانِ خیال است

ترجمہ:

خردمندو! بڑی مشکل ہے مجھ پر
سمجھنے سے اب عقل عاجز ہے میری
سما سکتا ہے دل کیوں مشت گل میں
کہ ہے دشتِ غزالان خیالی

پیچ و تاب کا ترجمہ ایثارؔ نے ''مشکل'' سے کرکے بڑی مہارت سے ترجمے کے تقاضے پورے کیے ہیں اور پھر ''محال'' کا ترجمہ ''عاجز'' یہاں بہترین اور مناسب ترجمہ کہا جائے گا۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں جب تک انسان بھرپور ریاضت نہ کرلے اسے یہ قدرت کلام اور لفظوں کی جڑوں تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ رسائی صرف سید احمد ایثارؔ جیسے مترجم کے لیے ہی مخصوص ہے۔ لفظوں کی نفسیات سمجھنا اور پھر اسی کے مطابق اسے برتنا ایثارؔ کا کمال ہے۔ یہ لفظوں کی جادوگری ہے جو ایثارؔ نے دکھائی ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ آخری مصرع ''کہ دل دشت غزالان خیال است'' کا جو ترجمہ انہوں نے کیا ہے وہ واقعی بڑے کمال کا ہے: ''کہ ہے دشت غزالان خیالی''۔ اقبال کے یہاں تیسرے اور چوتھے دونوں مصرعوں میں

لفظ 'دل' لایا گیا ہے مگر ترجمہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے صرف آخری مصرع ہی میں 'دل' رکھ کر شعر کی معنویت پوری طرح اجاگر کر دی ہے۔

اقبالؔ:

ہزاراں سال با فطرت نشستم
با و پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگزشتم ایں دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

ترجمہ:

جو صدیاں ساتھ فطرت کے گنوایا
بھلایا خود کو رشتہ اس سے جوڑا
مگر کل داستاں دو حرف ہے بس
تراشا، اس کو پوجا اور توڑا

پہلے مصرع کے ترجمہ اصل سے دور معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ''صدیاں'' کے ساتھ ''گنوایا'' کا استعمال ذہن میں گراں گزر سکتا ہے کیوں کہ صدیاں مونث استعمال ہوا ہے تو پھر صیغہ تانیث ہی استعمال کیا جانا چاہیے تھا چونکہ قافیہ ''جوڑا'' اور ''توڑا'' کی رعایت کرتے ہوئے مترجم کو مجبوراً ''گنوایا'' کا استعمال کرنا پڑا ہے۔ اور ایثارؔ نے ''نشستم'' کا ترجمہ ''گنوایا'' کیا ہے جو اصل مفہوم سے یکسر الگ ہے۔ تیسرے مصرع میں سرگزشت کا ترجمہ داستاں کیا ہے جو کہ بہترین ترجمہ ہے۔ ایثارؔ نے ترجمے کو اصل سے قریب تر رکھنے کی شعوری سعی کی ہے۔

اقبال:

زمن با شاعرِ رنگیں بیاں گوئے
چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی

نہ خود را می گدازی ز آتشِ خویش

نہ شامِ دردمندے برفروزی

اقبالؔ اس رباعی میں کہہ رہے ہیں کہ شاعرِ رنگیں نوا کو میری طرف سے کہو، اگر تو گل لالہ کی طرح جلا تو کیا جلا، نہ تو نے اپنی آگ سے اپنے آپ کو گداز کیا اور نہ کسی دردمند کی شام روشن کی۔ ایثارؔ نے اس رباعی کا ترجمہ کرتے وقت فارسی کے شعری مزاج اور اردو کے اندازِ بیان کو مدغم کرتے ہوئے اقبالؔ کے پیغام کو یوں پیش کیا ہے:

ترجمہ:

کہو یہ شاعرِ رنگیں بیاں سے

کہ ہے بے سود جلنا جیسے لالہ

نہ اپنی آگ سے تو خود ہی پگھلا

نہ دیکھا دردمندوں نے اجالا

اقبالؔ کی فکر اور پیغام کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایثارؔ نے کوشش کی ہے کہ اصل متن اور الفاظ و تراکیب کے قریب ترین رہتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔ ابتداء کے تینوں مصرعوں کا ترجمہ خوب کیا ہے، چوتھے مصرعہ ''نہ شامِ دردمندے برفروزی'' کا ترجمہ ''نہ دیکھا دردمندوں نے اجالا'' کر کے اقبال کی فکر و پیغام کو قابو میں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پیامِ مشرق میں بعنوان ''افکار'' نظمیں شامل ہیں۔ ذیل میں نظم ''حدی'' اور اس کا ترجمہ پیش ہے۔

اقبالؔ:

ناقہ سیارِ من

آہوئے تاتارِ من

درہم و دینارِ من

اندک و بسیارِ من

دولت بیدار من

تیز ترک گام زن منزل مادور نیست

دل کش وزیباستی

شاہد رعناستی

روکش حوراستی

غیرت لیلاستی

دختر صحراستی

تیز ترک گام زن منزل مادور نیست

ترجمہ:

ناقہ سیار تو

آہوئے تاتار تو

درہم ودینار تو

ذرہ وکہسار تو

دولت بیدار تو

اورذرا تیز چل، پاس ہے منزل یہیں

دل کش وزیبا ہے تو

شاہد رعنا ہے تو

روکش حورا ہے تو

غیرت لیلیٰ ہے تو

دختر صحرا ہے تو

اورذرا تیز چل، پاس ہے منزل یہیں

''حدی (نغمۂ ساربان حجاز)'' کے نام سے معنون یہ نظم ایک طویل نظم ہے۔زیرِنظر اشعار اس کے پہلے دو بند ہیں۔اس کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔فارسی کلام کو اردو کا جامہ پہناتے ہوئے اگر اسی بحر کو استعمال میں لایا جائے تو حسنِ ادا اور مفہوم کے قائم رہنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں ایثارؔ کے تراجم اسی خوبی سے متصف ہیں۔یہ نظم اس دعوی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اقبالؔ نے ہر مصرع میں تین تین لفظوں کا ذخیرہ ساتھ لیا ہے تو ایثارؔ نے تین تین لفظوں کو ہی اپنے ترجماتی سفر کا توشہ بنایا ہے۔دوسری بڑی اہم خوبی اس نظم کی یہ ہے کہ اقبالؔ کے یہاں 'من' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ایثارؔ نے 'تو' سے کیا ہے حالاں کہ 'من' کا ترجمہ 'میں' ہوتا ہے مگر ایثارؔ نے 'تو' سے ترجمہ کر کے یہ بتا دیا ہے کہ وہ کس پائے کے ترجمہ نگار ہیں اور لفظوں کی نفسیات سے کس قدر گہری واقفیت رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بخوبی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اقبالؔ کے فکر و فلسفے سے کس قدر آگاہ اور ان کے ذہن سے کس درجہ قریب ہیں۔یوں ہی 'منزل ما دور نیست' میں لفظ 'نیست' کا ترجمہ ظاہر ہے کہ 'نہیں' ہے مگر ترجمہ نگار نے اس پورے مصرعے کا ترجمہ 'پاس ہے منزل یہیں' کر کے ترجمہ نگاری میں اپنی گہری بصیرت کے شواہد اپنے قارئین کے سامنے رکھے ہیں۔اس ترجمے کی اضافی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے اقبالؔ کے فارسی اسلوب اور نفسِ مضمون کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا انداز بھی اپنایا ہے۔

مئے باقی میں شامل غزلیں اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کی آئینہ دار ہیں۔ان کے فلسفۂ حیات کی مکمل تفسیر ہیں اور ان کے جمالیاتی ذوق کی نشاندہی کرتی ہیں۔انہوں نے افکار و نظریات کو نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی بہت حسن و خوبی سے پیش کیا ہے۔عرفیؔ ،حافظؔ ،رومیؔ اور غالب کی مشترکہ مرکب میراث کے ساتھ ساتھ کافی مقدار میں ایسے اجزا بھی موجود ہیں جو محض اقبال ہی کی شناخت اور انہی سے مختص ہیں۔ان کی یہ غزلیں فنی خوبیوں سے مزین ہیں۔اقبالؔ نے اپنی بیشتر غزلوں کے لیے مترنم بحروں، دل کش پیرایۂ بیان اور عمدہ قافیوں اور ردیفوں کا انتخاب کیا۔ایثارؔ نے ان غزلوں کے تراجم میں بڑی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں:

اقبالؔ:

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی

ولیکن سوئے مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بیباک تر نہ درِحریمِ جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانۂ آخر چرادزدانہ می آئی

بغارت می بری سرمایۂ تسبیح خواناں را
شبخونِ دل زناریاں ترکانہ می آئی

گہے صد لشکر انگیزی کہ خونِ دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیانہ می آئی

تو برنخل کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمے صورتِ پروانہ می آئی

بیا اقبال جامی از خمستانِ خودی درکش
تو از میخانۂ مغرب زخود بیگانہ می آئی

اس غزل کا لہجہ خطیبانہ ہے۔اس میں اقبالؔ براہِ راست مسلمانوں سے مخاطب ہیں کہ انسان ہمیشہ تذبذب میں مبتلا رہتا ہے اور خدا کو زمین و آسمان میں تلاش کرتا ہے جب کہ خدا کا مسکن،خود انسان کا دل ہے یعنی اگر انسان اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو جان لے تو گویا وہ خدا کو پہچان لے گا۔اقبالؔ کے اس مفہوم کو ایثارؔ نے اپنے ترجمہ میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ملاحظہ ہو:

اقبالؔ:

حرم کی سمت جاتا ہے نہ تو بتخانہ آتا ہے
جو ہیں مشتاق انکی سمت مشتاقانہ آتا ہے

بلا کھٹکے چلے آنا حریم جانِ عاشق میں

یہ تیرا ہی مکاں ہے کس لئے دزدانہ آتا ہے

ثنا خوانوں کا سرمایہ کبھی تو لوٹ لیتا ہے
تو شبخوں مارتا کفار پر ترکانہ آتا ہے

کبھی ہے لشکر آرا دوستوں کا خوں بہانے کو
کبھی محفل میں لیکر شیشہ و پیمانہ آتا ہے

غضب کی شعلہ افشانی ہے تیری نخل سینا پر
چراغِ مصطفیٰؐ پر صورتِ پروانہ آتا ہے

ترجمہ میں نہایت روانی اور غنائیت موجود ہے۔ مترجم نے ترجمے میں متن کے مفہوم اور روح کو برقرار رکھا ہے۔ یہ ترجمہ سلیس، رواں، جامع ، فاضلانہ اور ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ ''قدم بیباک'' کا نہایت شائستہ ترجمہ 'بلا کھٹکے چلے آنا' قابلِ ستائش ہے۔ اسی طرح مصرع ''گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی'' کا ترجمہ ''کبھی محفل میں لیکر شیشہ و پیمانہ آتا ہے'' کرنا ایثاؔر ہی کا کمال ہے۔ اسی طرح چھٹا شعر میں اقباؔل کی اس بات کو کہ مسلمان مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اپنی خودی کو فراموش کر کے غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیتے ہیں، نہایت خوبصورتی سے ترجمے کی شکل عطا کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خودی کے میکدے سے ایک ساغر نوش کر اقبال!
مئے مغرب چڑھا کر خود سے تو بیگانہ آتا ہے

غرض پورے ترجمے میں مترجم کی سلیقہ مندی، حسنِ بیان، اور اظہارِ مطالب پر ان کی قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور مثال دیکھیں:

اقباؔل:

دانۂ سبحہ بہ زنار کشیدن آموز

گر نگاہ تو دو بین است ندیدن آموز

پا زخلوت کدہ غنچہ بروں زن چو شمیم
با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا
خیز د بر داغ دل لالہ چکیدن آموز

اگرت خارِ گل تازہ رسے ساختہ اند
پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز

باغباں گر ز خیابانِ تو بر کند ترا
صفت سبزہ دگر بار دمیدن آموز

تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں
عزلت خم کدۂ گیرو رسیدن آموز

ترجمہ:۔

دانۂ سبحہ میں زنار کو لانا سیکھو
ہو دو بیں آنکھ تو اَن دیکھے ہی جانا سیکھو

جیسے بو بطن سے کلیوں کے رہائی پا کر
ہمرہ باد صبا پھیلتے جانا سیکھو

اوس کی بوند سی کم مایہ سہی بود اپنی
خود کو داغِ دلِ لالہ پہ گرانا سیکھو

تم کو خارِ گلِ تازہ بھی بنائے وہ اگر
چبھ کے ناموس گلستاں کو بچانا سیکھو

باغباں نے تمہیں کیاری سے اکھیڑا ہے اگر
سر کو سبزے کی طرح پھر سے اٹھانا سیکھو

تیز تر تاکہ بنو، ناکہ ہو تلخی کو فروغ
عزلتِ میکدہ میں پختگی پانا سیکھو

زیرِ نظر غزل کے ترجمے کی زبان سلاست اور شگفتگی کی مظہر ہے جسکے باعث اصل متن کے مفہوم تک رسائی ممکن ہوئی ہے۔ بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ یہاں پھر وہی بات دوہرانی پڑ رہی ہے کہ بعض اشعار بالکل اصل معلوم ہوتے ہیں، ان پر ترجمے کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ہو پاتا۔ نمونے کے طور پر اس پوری غزل کا ترجمہ دیکھیں مگر بطور خاص شعر نمبر ۳ اور شعر نمبر ۵ دیکھیے نہایت پر کیف ترجمہ ہے جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں شعر منظوم ترجمے کی عمدہ مثال تو ہیں ہی ساتھ ہی ان میں جو پیغام ہے وہ بھی لازوال ہے اور راز حیات اور وجہ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک اور غزل کا ترجمہ پیش ہے جس میں طبع زاد کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

اقبالؔ:

خاکیم و تند سیر مثالِ ستارہ ایم
در نیلگوں یمے بتلاشِ کنارہ ایم

بود و نبودِ ماست ز یک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

با نوریاں بگو کہ ز عقلِ بلند دست

ماخالیاں بہ دوشِ ثریا سوارہ ایم

درعشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
درکارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن
رو بند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم

پانچ اشعار پر مشتمل اس خوبصورت غزل میں اقبالؔ نے انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا آشکار کیا ہے۔انسان کی انفرادی وجود اور اس میں پوشیدہ صلاحیتوں اور امکانات کو واضح کیا ہے۔اس غزل میں موجود معنی و مفاہیم کو ایثارؔ نے اپنے منظوم ترجمے میں یوں پیش کیا ہے:

اقبالؔ:

خاکی ہیں تند سیر مثالِ ستارہ ہم
بحرِ فلک میں ڈھونڈ رہے ہیں کنارہ ہم

اصلِ وجود اپنی ہے اک شعلۂ حیات
لیکن خودی کے ذوق میں ہیں پارہ پارہ ہم

کہد و ملائکہ سے ہیں گو خاک اصل میں
ہیں زور سے خرد کے ستارہ سوار ہم

ہیں عشق میں وہ غنچہ جو لرزے نسیم سے
ہیں کاروبارِ زیست میں مانندِ خارہ ہم

ہم بھی چمن میں رکھتے ہیں نرگس کی طرح آنکھ

رخ سے نقاب اٹھا، ہیں سراپا نظارہ ہم

بعنوان ''خردہ'' میں اقبال نے متفرق اشعار درج کر کے حکیمانہ نکات کو آسان انداز میں پیش کیا ہے۔

اقبالؔ:

طاقت عفو در تو نیست اگر
خیز و با دشمنان درآ بہ ستیز
سینہ را کارگاہِ کینہ مساز
سرکہ در انگبین خویش مریز

ترجمہ:

تاب گر عفو کی نہیں تجھ میں
دشمنوں پر تو گر بھڑاس نکال
کینہ سینے میں اپنے بھر کے نہ رکھ
شہد میں اپنے دیکھ سرکہ نہ ڈال

ان اشعار میں اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ اگر تجھ میں معاف کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اٹھ اور جنگ کر اپنے سینے کو کینے کا گھر مت بنا، شہد میں سرکہ مت انڈیل۔ ایثارؔ نے اقبالؔ کے پیغام کو کامیابی سے اپنے ترجمے میں پیش کیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''جنگ کرنے'' کو ''بھڑاس نکال'' کہا ہے جو کہ مناسب ہے۔ مجموعی طور پر ترجمہ دلکش ہے اور ایثارؔ نے فکر اقبال کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ پیامِ مشرق کا یہ منظوم ترجمہ جہاں ایک طرف اقبالؔ کے ساتھ ایثارؔ کی بھرپور ذہنی وابستگی کی دلیل ہے وہیں دوسری طرف بطور مترجم ایثارؔ کہ کہنہ مشقی اور اخذِ مطالب پر قدرت کا غماز بھی ہے۔ یہ ترجمہ نہایت پرکیف اور دلکش ہے اور اردو ادب میں بیش قیمت سرمایہ ہے۔

زبورِعجم کا تعارف:

زبورِعجم اقبالؔ کی فارسی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۲۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ زبورِعجم غزلوں کا مجموعہ ہے۔ البتہ اس کے آخری حصہ میں ''گلشنِ راز جدید'' اور'' بندگی نامہ'' کے عنوان سے دو مختصر مثنویاں بھی شامل ہیں۔ زبور وہ الہامی کتاب ہے جو حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی تھی۔ اسی مناسبت سے عارفانہ اور حکیمانہ کلام کو بھی مجازاً الہام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دیوان حکمت وعرفان سے مالا مال ہے۔ اس لئے اقبالؔ نے اپنی اس تصنیف کو زبور سے تعبیر کیا ہے۔۔ اس تصنیف پر اقبالؔ کو بہت ناز تھا۔ اس ضمن میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقمطراز ہیں:

> ''میری رائے میں ''زبورِعجم'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ کو اپنی اس تصنیف پر بڑا ناز تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اہلِ ذوق سے اس کتاب کے مطالعہ کی خود سفارش کی ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں۔
>
> اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِعجم
>
> فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں'' ۳۰؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اہلِ ذوق کو اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی تلقین کی تھی کیونکہ اس کی تمام غزلیں نغمات عشق ومحبت سے معمور ہیں۔ عبدالشکور زبورِعجم کے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''اس کتاب میں سوز و ساز کی ایک منفرد اور بے مثال کیفیت ہے۔ موسیقی کی جو فراوانی اور متنوع دلکشی اس مجموعہ میں ہے، شاعر کی کسی دوسری کتاب میں نہیں۔ اس کے جذب ومستی اور وفورِ شوق کی متلاطم کیفیت وجد آفرین نغموں میں جھلک رہی

ہے۔اس میں شاعر کے نالۂ نیم شب کا نیاز بھی ہے اور دل کی
پوشیدہ بیتیاں بھی۔اس کی امنگیں اور آرزوئیں بھی ہیں اور اس کی
جستجوئیں بھی،اس کے جذبات و افکار،نغمہ و آہنگ کے طوفان
میں ڈھل کے نکلے ہیں۔''[۱۳]

زبورِعجم کل چار حصوں میں منقسم ہے۔حصہ اول کے ابتداء میں ''بخوانندگان کتاب زبور'' کے عنوان سے کتاب کے قاری کے لئے نصیحت ہے۔اس حصہ میں خالقِ کائنات سے خطاب ہے اور کل ۵۵ غزلیں ہیں۔حصہ دوم میں انسانوں سے خطاب ہے اس حصہ میں کل ۷۳ غزلیں ہیں۔ان تمام غزلوں میں اقبالؔ نے فلسفیانہ تصور کی وضاحت کی ہے۔ان اشعار کی جامعیت اس قدر ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔اسلوبِ بیان بھی اس قدر دلکش ہے کہ اشعار براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔ان غزلیت میں رنگا رنگ دلکشی کثرت سے موجود ہے۔مثلاً

ایں جہان چیست صنم خانہ پندار من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است

تیسرا حصہ گلشنِ راز جدید پر مشتمل ہے۔''گلشنِ راز جدید'' شیخ محمود شبستری کی تصنیف ''گلشنِ راز'' کے جواب میں لکھی ہے۔شیخ محمود شبستری تیرہوی صدی عیسوی میں ایران کے ایک مشہور صوفی تھے۔شیخ کی یہ تصنیف علم تصوف میں بے حد مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں ارباب وعلم و دانش نے اس کتاب (گلشنِ راز) سے استفادہ کیا ہے۔گلشنِ راز کی طرح ہی اقبال نے گلشنِ راز جدید میں کہیں بھی شاعری کا رنگ نہیں بلکہ یہ خالص تصوف کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔چوتھا حصہ بندگی نامہ ہے جس میں اقبال نے غلامی اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔

زبورِعجم کے اشعار سوز و ساز کا دلکش مرقع ہیں۔اس میں اقبالؔ نے اپنے مخصوص انداز یعنی شعری تلمیحات،قرآنی آیات اور احادیث کا بھی ذکر کیا ہے۔گویا اقبالؔ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مختلف

کیفیات کو جذبات کی زباں میں سمو دیا ہے۔ مختصر اًزبورِ عجم جذبات کی ایک منفرد اور بے مثال تصنیف ہے۔

ترجمۂ زبورِ عجم کا جائزہ:

زیرِ نظر کتاب ''زبورِ عجم'' کا ترجمہ بھی ایثآر کی فن کاری اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس تصنیف کی اشاعت ۱۹۹۹ء میں عمل میں آئی۔اس ترجمہ میں ایثآر نے اقبآل کے کلام کی باریکیوں اور پیچیدگیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔اور منظوم ترجمہ میں اصل مفہوم کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔زبورِ عجم کے حصہ اول کی پہلی نظم ''بخوانندۂ کتاب زبور'' کا ترجمہ دیکھیے :

اقبآل:

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است و لے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے!

ترجمہ:

پردہ بن جاتا ہے آنکھوں کا پرِ کاہ کبھی
اک نظر میں دو جہاں فاش ہیں ناگاہ کبھی

وادیٔ عشق اگرچہ ہے بہت دور و دراز
طے ہوا راستہ صدیوں کا بہ اک آہ کبھی

کوشش اپنی سی کیئے جا کبھی نومید نہ ہو
وہ بھی دولت ہے جو حاصل ہے سرِ راہ کبھی

اس تصنیف میں اقبالؔ نے قارئین کو نصیحت کی ہے۔تین اشعار کی اس نظم میں اقبالؔ اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ انسان بہت ضعیف ہے اس لئے جب تک فضلِ الٰہی شامل حال نہ ہو، محض اپنی کوشش سے کامیاب ہونا ممکن نہیں۔تینوں اشعار کا ترجمہ نہایت رواں دواں اور نغمگی سے بھر پور ہے۔ ان تینوں اشعار میں دوسرے شعر کا ترجمہ سب سے زیادہ خوبصورت اور سلیس محسوس ہوتا ہے۔سلاست اور روانی کے معاملے میں تیسرا اور آخری شعر بھی دوسرے شعر سے کم نہیں ہے۔

اقبالؔ:

نوائے من ازاں پرسوز و بے باک و غم انگیز است
بخاشاکم شرارا فتاد و باد صبح دم تیز است

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشۂ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

مرا در دل خلید ایں نکتہ از مردِ دادانے
زمعشوقاں نگہ کاری تر از حرفِ دل آویز است

بہ بالینم بیا یکدم نشیں کز دردِ مہجوری
تہی پیمانۂ بزمِ ترا پیمانہ لبریز است

بہ بستاں جلوہ دادم آتشِ داغِ جدائی را
نسیمش تیز تر می سازد و شبنم غلط ریز است

ترجمہ:

مرے نغمات ہیں پر سوز و بے باک اور غم انگیز
ہے چنگاری مرے خاشاک میں، بادِ صبا ہے تیز

بجز تیشہ نہیں ہے عشق کا ساماں کوئی دیگر
اسے کہسار ڈھانا ہے، نہیں وہ دشمنِ پرویز

کھٹکتا ہے یہ نکتہ مرد دانا کا مرے دل میں
نگہ معشوق کی گفتار سے بڑھ کر ہے دل آویز

مرے بالیں پہ آ بیٹھ اک گھڑی آلام فرقت سے
تہی پیمانہ کا پیمانہ اب ہونے کو ہے لبریز

چمن میں لے کے آیا آتش داغ جدائی کو
صبا نے اس کو بھڑکایا، تو شبنم نے کیا پرہیز

سید احمد ایثاؔر نے ان اشعار میں بھی سلاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، روانی کا بھی بھرپور خیال

رکھا ہے اور اقبال کے معانی و مفاہیم بھی بحسن وخوبی اردو میں منتقل کر دیے ہیں۔ یہی تو ترجمے کا وصف ہے ،انہی خوبیوں سے سید احمد ایثاؔر نے اس ترجمے کو ذرہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس ترجمے میں قاری کو کوئی تکلف نہیں محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے پانی کا بہاؤ ہے جس میں قاری بہتا چلا چلا رہا ہے، اسے راستے میں خس وخاشاک سے واسطہ نہیں پڑتا کہ اس کا ذہن مکدر ہو جائے ، بھاری بھرکم لفظوں کے پتھر بھی نہیں کہ قاری ترجمے سے گزرتے ہوئے ان سے ٹکرا جائے یا تھوڑی دیر کے لیے اپنا مطالعاتی سفر روک دے۔ ایک آدھ مقام پر ترجمہ سے زیادہ ترجمانی کا احساس ہوتا ہے مگر یہ تو ترجمہ نگار کی مجبوری ہے کہ اسے اقبالؔ کے پیغام کی ترسیل کرنی ہے ،اس پیغام سے انحراف ممکن نہیں کیوں کہ جب اصل پیغام اور مدعا کی ترسیل ہی نہ ہو سکے تو پھر ترجمہ، ترجمہ نہیں رہ جاتا، لفظوں کا ڈھیر بن جاتا ہے اور بس۔ برسبیل تذکرہ یہ بات بھی یادرکھنے کی ہے کہ ترجمہ نگاری کرتے وقت مترجم کے سامنے بہت بار ایسے مقامات آتے ہیں جہاں مترجم کو ترجمے سے زیادہ ترجمانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی کام سید احمد ایثاؔر نے کیا ہے۔ ایک اور مثال پیش ہے یہ ترجمہ غنائیت کی دولت سے مالا مال ہے اور ترجمہ کیف وسرور اور مفہوم پر پورا اترتا ہے اور مترجم اقبال کے فکر وفن کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب نظر آتا ہے ملاحظہ ہو:

اقبالؔ:

نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گذرد
مرا بگیر کہ کارم ز چارہ می گذرد

بہ دیگراں چہ سخن گسترم ز جلوۂ دوست
بیک نگاہ مثالِ شرارہ می گذرد

رہے بمنزلِ آں ماہ سخت دشوار است
چناں کہ عشق بدوشِ ستارہ می گذرد

زپردہ بندیٔ گردوں چہ جائے نومیدی است
کہ ناوکِ نظرِ ما ز خارہ می گذرد

یمے است شبنمِ ما، کہکشاں کنارۂ اوست
بیک شکستنِ موج از کنارہ می گذرد

بخلوتش چو رسیدی نظر باُو مکشا
کہ آں دمے ست کہ کار از نظارہ می گذرد

ترجمہ:

وہ رہ نشینوں سے بے گانہ وار جاتا ہے
بنا کے بےخود و بے اختیار جاتا ہے

بتاؤں غیروں کو کیا حالِ جلوۂ جاناں
وہ اک نظر میں مثالِ شرار جاتا ہے

رسائی بارگہِ یار میں کٹھن ہے بہت
یہ عشق بھی تو ستارہ سوار جاتا ہے

جو پردہ داری کرے آسماں تو کیا حاصل
نظر کا تیر تو خارا سے پار جاتا ہے

یہ قطرہ اوس کا دریا ہے آسماں ساحل
جو ٹوٹے موج سا ساحل کے پار جاتا ہے

اگر نصیب ہو خلوت تو آنکھ اٹھا کے نہ دیکھ
ورائے دید بہت ہے جو ہار جاتا ہے

پوری غزل کے ترجمہ میں ایک تسلسل ہے جو بے حد پر کیف اور دل آویز ہے۔ ''جاتا ہے'' کے ردیف نے ترجمے میں حسن و کیف کا وہ جادو جگایا ہے جو بہت کم ہی کسی کے حصے میں آیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ موسیقی کا دلکش رنگ پیدا کر دیا ہے جس سے اس نظم پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔

اقبالؔ:

ہوائے خانہ و منزل ندارم
سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

سحر می گفت خاکستر صبارا
فسردا ز باد ایں صحرا شرارم

گذر نرمک پریشانم مگرداں
ز سوز کاروانے یادگارم

ز چشم اشک چوں شبنم فرو ریخت

کہ من ہم خا کم و در رہگذارم !

بہ گوش من رسید از دل سرودے
کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم

ازل تاب وتب پیشینۂ من
ابد از ذوق وشوق انتظارم

میندیش از کفِ خاکے میندیش
بجانِ تو کہ من پایاں ندارم !

ترجمہ:

سرِ منزل نہ فکرِ کارواں ہے
مسافر ہوں، وطن میرا کہاں ہے!

یہ بولا راکھ کا تودہ صبا سے
ہوں سرد، مجھ میں اب چنگاری کہاں ہے

چل آہستہ نہ کر مجھ کو پریشاں
مری ہستی نشان کارواں ہے

میں رو یا سن کے خاکستر ہوں میں بھی
وجود اپنا بھی رستے کا نشاں ہے

مرے کانوں میں گونجا نغمۂ دل
میں ہوں چشمہ، جہاں جوئے رواں ہے

ازل میری تڑپ ہے ابتدائی
ابد کیا؟ انتظارِ جاوداں ہے

نہ کر اندیشہ اپنی مشت گل کا
قسم تیری مرادم جاوداں ہے

سید احمد ایثآر نے نہایت خوبصورتی اور فنکاری سے اقبال کے پیغام کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ رواں اور معنی خیز ہے۔ اقبآل کے ان اشعار کو اگر ایک طرف رکھ دیں اور سید احمد ایثآر کا منظوم ترجمہ ہی پڑھ لیں تو قطعاً یہ محسوس ہی نہیں ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے۔ ایثآر نے لفظوں کو کس قدر خوبصورتی، مہارت اور فن کاری سے یہاں برتا ہے کہ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا، ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے، ترجمے کی یہ ایسی خوبی ہے جو کسی بھی مترجم کو بہترین اور لازوال مترجم بنا دیتی ہے۔ اقبال کے ان فارسی اشعار میں ایک آدھ مقام پر ایسا لگتا ہے کہ اصل پیغام لفظوں میں کہیں گم ہو گیا ہے وہاں سید احمد ایثآر نے اپنی ترجمہ نگاری کی مہارت سے ابہام کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ مثلاً آخری شعر سے پہلے والا شعر دیکھیں۔

ازل میری تڑپ ہے ابتدائی
ابد کیا؟ انتظار جاوداں ہے

اس کے فارسی قالب میں تھوڑا بہت ابہام سا نظر آتا ہے مگر اردو قالب میں یہ ابہام بالکل چھٹ گیا ہے اور پورا پیغام صاف وشفاف آئینے کی طرح ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ ''ابد کیا'' کے آگے مترجم نے سوالیہ نشان لگا کر اسے ایسا کھول دیا کہ قاری اب اس کے اندر کی گہرائی میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے

اورمعانی کے گوہرتاب دارتک پہنچ سکتا ہے۔ پہلے شعر سے لے کرآخری شعرتک ہرجگہ سلاست اورروانی کادریاہے جو بہتا چلا گیاہے۔باذوق قاری اس میں اگرایک باراتر جائے تواس کا بہاؤاس کے سفرکو پرلطف اور پرکیف بنادیتاہے۔ایک اورغزل کے چنداشعار کا ترجمہ پیش ہے جوغنائیت،موسیقیت اورشعریت کی دولت سے بھرپور ہیں:

اقبالؔ:

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجاست؟
عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست؟

بزیرِ خرقۂ پیراں سبو چہ ہا خالی است
فغاں کہ کس نہ شناسد مئے جوانہ کجاست

دریں چمن کدہ ہرکس نشیمنے سازد
کسے کہ سازد و وا سوزد آشیانہ کجاست؟

ہزار قافلہ بے گانہ وار دید و گذشت
ولے کہ دید باندازِ محرمانہ کجاست؟

ترجمہ:

عرب جو عام کرے محفلِ شبانہ کہاں؟
عجم بہائے جو دریائے عاشقانہ کہاں؟

چھپے ہیں خالی سبو صوفیوں کے خرقوں میں

کسے ہے علم گئی وہ مئے جوانہ کہاں؟

چمن میں ہر کوئی اک آشیاں بناتا ہے
بنا کے پھونک سکے خود جو آشیانہ کہاں؟

ہزار قافلے بیگانہ وار دیکھ چلے
جو دیکھتا ہو بہ اندازِ محرمانہ کہاں؟

مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ جامعیت سے بھرپور ہے۔ پہلا شعر جس میں اقبال کہتے ہیں کہ وہ عرب کہاں جو پھر وہی محفلِ شبانہ سجائے اور وہ عجم کہاں جو دریائے عشق کو از سرِ نو زندہ کرے۔ اس خیال کو بے حد خوبصورت انداز میں ترجمہ کی شکل میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں اقبال کی اس بات کو کہ صوفیوں کے پاس خرقہ تو ہے لیکن ان کے سبو معرفت سے خالی ہیں اور کسی کو علم نہیں کہ مئے جواں کہاں ہے، من وعن ترجمہ میں سمویا ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر کے ترجمہ میں بھی اصل کا ذائقہ موجود ہے۔

اقبالؔ:

بہار آمد نگہ می غلطد اندر آتشِ لالہ
ہزاراں نالہ خیزد از دل پرکالہ پرکالہ!

فشاں یک جرعہ بر خاک چمن از بادہ لعلے
کہ از بیم خزاں بے گانہ روید نرگس و لالہ

جہانِ رنگ و بودانی و لے دل چیست میدانی؟

مہے کز حلقۂ آفاق ساز دگر دِخود ہالہ!

ترجمہ:

بہار آئی نگاہیں ہوگئیں دیوانۂ لالہ
دلِ صد پارہ سے برپا ہے صد ہنگامۂ نالہ

چھڑک خاکِ چمن پر ایک چلو بادۂ لعلیں
بھُلا کر خوف پت جھڑ کا اُگیں گے نرگس و لالہ

جہان رنگ و بو دیکھا، حقیقت دل کی بھی جانی؟
یہ جیسے چاند ہے، آفاق اس کے گرد اک ہالہ

اس ترجمے میں بھی اصل کا احساس ہوتا ہے۔اقبال کا فارسی شعر اور ایثاؔر کا اردو ترجمہ دونوں آمنے سامنے رکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مترجم نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ترجمہ کمال کا ہے کیوں کہ ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے بلکہ یہ مستقل اشعار معلوم ہوتے ہیں۔مجال ہے کہ کوئی لفظ ادھر سے ادھر ہوا ہو۔سید احمد ایثاؔر نے اقبال کا پیغام جوں کا توں اردو قاری کے روبرو رکھ دیا ہے۔جوزور اقبال کے فارسی کلام میں ہے وہی زور ایثاؔر کے منظوم ترجمے میں بھی محسوس ہوتا ہے۔دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں لگتا۔فارسی کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ''ہزاراں'' کے لفظ کا ترجمہ محترم ترجمہ نگار نے ''صد'' سے کیا ہے ۔بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ ہزار کا ترجمہ صد یعنی سو(۱۰۰) کیسے ہوسکتا ہے مگر یہاں یہ یادرکھنا چاہیے کہ اقباؔل کا ''ہزاراں'' دراصل کثرت کو بتانے کے لیے ہے،کوئی متعین مقدار نہیں اسی لیے مترجم نے بھی ''صد'' کا لفظ استعمال کیا کہ یہ بھی کثرت پر ہی دلالت کرتا ہے۔مقصد تو فقط اقباؔل کے پیغام کی وسیع تر ترسیل ہے جو ترجمے سے بحسن وخوبی انجام کو پہنچ رہا ہے اس لیے 'ہزاراں' کی جگہ 'صد' کا استعمال عیب نہیں خوبی ہے اور اس خوبی کا مالک سید احمد ایثاؔر جیسا کوئی ماہر ترجمہ نگار ہی ہوسکتا ہے۔

اقبالؔ:

گنہ گار غیورم مزد بے خدمت نمی گیرم
از اں داغم کہ بر تقدیر او بستند تقصیرم

زفیض عشق و مستی بردہ ام اندیشہ را آنجا
کہ از دنبالہ چشم مہر عالم تاب می گیرم

من از صبح نخستیں نقشبند موج و گرد ابم
چو بحر آسودہ می گردد ز طوفاں چارہ بر گیرم

جہاں را پیش ازیں صد بار آتش زیر پا کردم
سکون و عافیت را پاک می سوزد بم وزیرم

ترجمہ:

مری غیرت کو یہ اجرت بلا محنت نہیں بھاتی
بھلا کیوں تہمت اس کم بخت پر تقصیر ہے میری؟

تخیل کو کہاں تک لے چلا میں عشق و مستی میں!
کرن کو چھو کے آنکھیں بند کر سکتا ہوں سورج کی

ازل سے میری ہستی باعث گرداب و طوفاں ہے
کیا مواج، دریاؤں میں سستی جب کبھی دیکھی

جہاں کو مبتلا رکھا ہے میں نے بے قراری میں
مٹا ڈالی ہے مرے نغموں نے سب کی عافیت کوشی

اس غزل کے ترجمہ میں بھی وہی سلاست، روانی، بے تکلفی،، برجستگی، بے ساختگی اور مہارت ہے جو ایثار کے فن کا خاصہ ہیں۔ سید احمد ایثار نے نہایت خوبصورتی اور برجستگی سے اقبال کے فارسی قالب کو اردو قالب پہنا دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ لفظوں کی ایک قطار ہے جو آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور ایثار انہیں جہاں چاہتے ہیں، فٹ کر دیتے ہیں۔ لفظوں کا یہ انتخاب ایثار کا ہی کمال ہے۔

اقبال:

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو ست

گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست!

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیرون و اندروں زبر و زیر چارسوست!

ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکئے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

پنہاں بہ ذرہ ذرہ و نا آشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و بآغوشِ کاخ وکوست

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست؟

اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ انسان نے اپنے خالق کو بھلا دیا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا اسے اپنانا چاہتا ہے اس پر اپنی رحم و کرم کی بارش برسانا چاہتا ہے لیکن انسان اللہ کی طرف سے بالکل بے گانہ ہوگیا ہے اور دنیاوی خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہے۔ تمام کائنات اللہ کی ذات وصفات کی غمازی کر رہی ہے خواہ وہ لالہ کی پتیاں ہوں یا پرندں کی آہ وفغاں ہر طرف خالق کے جلوؤں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن انسان اپنی غفلت کے باعث ان جلوؤں کو دیکھ نہیں پاتا۔ اقبالؔ کی اس فکر کو ایثارؔ نے اپنے ترجمہ میں بڑی خوبصورت اور چابکدستی سے یوں پیش کیا ہے:

گم گشتہ ہم ہیں اور خدا محوِ جستجو
اپنی طرح ہے وہ بھی گرفتارِ آرزو

اوراق لالہ پر کبھی وہ لکھ دیا پیام
بطنِ طیور میں کبھی گویا بہ ھاوہو

نرگس میں بس کے دیکھ رہا ہے ہمیں وہی
کیوں ہو رہی ہے دیکھ نگاہوں میں گفتگو

ہے ہجر میں ہمارے ہی آہِ سحر گہی
زیروزبر بھی ظاہر و باطن میں چارسو

سب اہتمام ہے پئے دیدارِ آدمی
ہے دید کا بہانہ تماشائے رنگ و بو

ہے ذرہ ذرہ میں وہی پھر بھی ہے اجنبی
مانندِ ماہتاب بہ آغوشِ کاخ و کو

ان اشعار میں ایثاؔر نے اقباؔل کی فکر کو قابو میں لانے کی پوری کوشش کی ہے ۔دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں سینۂ مرغاں کو بمعنیٔ بطن طیور استعمال کیا ہے ۔اسی طرح چوتھے مصرعہ میں ''بیرون و اندروں'' ''کو ظاہر اور باطن'' سے تعبیر کیا ہے جو مناسب ہے ۔آخری شعر کا ترجمہ نہایت خوب کیا ہے اقبال کہتے ہیں ہم میں زندگی کا گوہر گم ہے یہ گم شدہ موتی ہم ہیں یا وہ؟ ایثاؔر نے نہایت شگفتہ ترجمہ کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

مفقود اس جہاں میں ہے گوہر حیات کا
گم گشتہ کون ہے وہ گہر؟ ہم ہیں یا کہ وہ

بندگی نامہ سے چند اشعار پیش ہیں۔جن کا ترجمہ ایثاؔر نے نہایت بامعنی اور شگفتہ کیا ہے۔

از غلامی دل بمیرد در بدن
از غلامی روح گردد بارتن

اقباؔل کہہ رہے ہیں کہ غلامی کے باعث انسان کا دل مردہ ہوجاتا ہے اور غلامی کی وجہ سے روح جسم کا

بوجھ بن جاتی ہے۔اس خیال کو ایثاؔر نے اپنے ترجمہ میں یوں پیش کیا ہے:

دل غلامی کے سبب بےنورِ جاں
جاں غلامی کے سبب تن پر گراں

ایک اور مثال دیکھیں:

اقبالؔ:

از غلامی بزم ملت فرد فرد
ایں و آں با این و آں اندر نبرد

ترجمہ:

قوم کے افراد اس سے در بدر
برسرِ پیکار باہم یک دگر

اس شعر کے ترجمہ میں پہلے مصرعہ میں اگر چہ غلامی لفظ کو چھوڑ دیا ہے لیکن شعر کے سیاق وسباق میں پڑھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اس سے اشارہ غلامی کی طرف ہے۔لیکن پھر ملت کے ٹوٹنے پارہ پارہ ہونے کو در بدر سے تعبیر کیا ہے۔اس شعر کا ترجمہ قریب المفہوم ہے۔ذیل میں چند اور مثالیں پیش ہیں جو ترجمے کی ضمن میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اقبالؔ:

زمین و آسماں را بر مراد خویش می خواہد
غبارِ راہ و با تقدیر یزداں داوری کردہ

ترجمہ:

زمین و آسماں چاہے مطابق اپنی مرضی کے
غبارِ راہ نے تقدیرِ حق پر داوری کی ہے

اقبالؔ:

گہے با حق درآمیزد، گہے با حق درآویزد
زمانے حیدری کردہ، زمانے خیبری کردہ

ترجمہ:

کبھی یہ حق کا حامی ہے، کبھی اس کا مخالف ہے
کسی دم حیدری کی ہے کسی دم خیبری کی ہے

اقبالؔ:

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا
خضرِ من! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

ترجمہ:

حکمت و فلسفہ سے میری طبیعت بوجھل
اے مرے خضر! ذرا بوجھ مرے سر سے ہٹا

اقبالؔ:

بجانم آرزو ہا بود و نابو دِ شرر دارد
شبم را کوکبے از آرزوئے دل نشینے دہ

ترجمہ:

ہے چنگاری سی ہست و بود اپنی آرزوؤں کی
مری شب کو ضیائے آرزوئے دل نشیں دیدے

اقبالؔ:

بدستم خامۂ دادی کہ نقشِ خسروی بندد
رقم کش ایں چنینم کردۂ لوحِ جبینے دہ

ترجمہ:

قلم بخشا مجھے تا نقش شاہی کھینچ کر رکھ دوں
تو پھر تحریر کی خاطر مجھے لوحِ جبیں دیدے

اقبالؔ:

زعلم و دانش مغرب ہمیں قدر گویم
خوش است آہ وفغاں تا نگاہ نا کام است

ترجمہ:

ہے علم و دانشِ مغرب مری نظر میں یہی
فغاں سے کام اسے جب تک نگاہ ہے نا کام

مختصراً زبورِ عجم کا ترجمہ نہایت دلکش ہے اور بعض اشعار ایسے ہیں جن پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ مترجم نے اقبالؔ کی فکر و تخیل کو صحیح صورت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ، ترجمہ ہوتا ہے اصل کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا لیکن مترجم اپنی فنکاری سے اسے اصل صورت میں شعر و شاعری کی فنی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کرتا ہے۔

جاوید نامہ کا تعارف:

جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آیا۔ جاوید نامہ فلسفیانہ افکار کے ساتھ ادبی فنکاری سے مالا مال ہے۔ اقبالؔ نے اس میں ایسے حقائق اور معارف بیان کئے ہیں جن کا تعلق جہانِ دیگر سے ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالشکور احسن:

''حقیقت یہ ہے کہ اس میں حقیقت و تخیل کو جس انداز میں ہم

آہنگ کیا گیا ہے اوراس میں افکار کے عمق، تخیل کی توانائی وفسوں
کاری اورقوتِ بیانیہ کے سحر واعجاز کے ساتھ ساتھ جرأت اظہار کا
جو انداز ملتا ہے ،اس نے علامہ کے اس شاہکار کو یکتائے
روزگار ادبی اورفکری تخلیق بنادیا ہے۔''۳۲

جاوید نامہ میں اقبالؔ نے سیر افلاک کے ذریعے اپنے فلسفۂ حیات اوربعض اہم سیاسی اور اجتمائی مسائل کو پیش کیا ہے۔اس میں مولانا روم کے ہمراہ تمام افلاک کی سیر کی ہے۔اوررومی نے ہرمرحلہ پران کی رہنمائی کی ہے۔اس میں واقعات بھی ہیں اور مکالمات بھی،صدا بھی ہے اور فضا بھی،اس میں حقیقی کردار بھی ہیں اورخیالی ومثالی بھی،اس میں غزل کی کیفیت بھی ہے اورقطعہ بندی کے آثار بھی۔اس میں تاریخ کا وہ عنصر بھی ہے جس کا عکس اوراقِ پارینہ میں جلوہ گر ہے اور وہ نقوش بھی ہیں جن کا نقشہ شاعر کے تصور میں جاگزیں ہے۔غرض یہ تخلیق ایسا مرقع ہے جس میں متعدد رنگوں کی آمیزش ہے۔اس سلسلے میں عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

''اپنے مضامین کی وسعت ،موضوعات کے تنوع،کرداروں کی
رنگا رنگی ،مناظر کی دلکشی اور افکار کی گہرائی ،اشعار کی ساحری
،تصورات کی آفاقیت اور مقاصد کی رفعت کی لحاظ سے دنیا کی کوئی
شعری تخلیق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی یہ وہ شاعری ہے جو دانتے
کے بس کی بات نہیں۔''۳۳

لاطینی شاعر دانتے الیگری کی مشہور تصنیف ''ڈیوائن کامیڈی'' دراصل جاوید نامہ کی محرک ہے۔یہ کتاب ۱۵۵۵ء میں منظرِعام پرآئی۔یہ تصنیف دانتے کی فکر وفلسفہ،تہذیبی اقدار،مذہبی عقائد،تلاش وتجسس اور جذبات واحساسات کی ترجمان ہے۔اس تصنیف میں دانتے نے اپنی محبوبہ بیترس کو زندہ وجاوید بنانے کی سعی کی ہے۔نیرنگ خیال لاہور کا خصوصی شمارہ اقبال نمبر میں ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ کے متعلق یہ تحریر درج تھی:

''سات سو سال ہوئے کہ اطالوی شاعر ڈانٹے نے دنیا کو ایک
پیغام دیا تھا کیونکہ ڈیوائن کامیڈی کے ہر سطر میں مسیحیت کے
بجائے قدیم رومی شاہنشاہیت کی روح جلوہ گر تھی۔ چنانچہ ڈانٹے
کی یہی تصنیف جاوید نامہ کی ترتیب کی محرک ہوئی اور مشرق کے
اس فقید المثال شاعر نے آفاق و انفس کے لطیف و نازک حقائق
کو ایسے مجتہدانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے کہ اس کا یہ دیوان
مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق کی گم کردہ راہ قوموں کے لئے
خضر ہدایت ثابت ہوگا۔''۳۴؎

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے یہ حصہ چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں احساس تنہائی اور موجوداتِ جہاں کی بے حسی کا ذکر ہے۔ دوسرے بند میں وقت کی ناپائیداری کا ذکر ہے۔ تیسرے اور چوتھے بند میں انسان کی عظمت و فضیلت کا بیان ہے۔ پانچویں بند میں عشق کی بے پناہ قوتوں کا اظہار ملتا ہے۔ چھٹے بند میں شاعر دعا گو ہے کہ ان کا پیغام آئندہ نسلوں کے لئے ہدایت اور تقویت کا ذریعہ بنے۔ مناجات کے بعد تمہیدِ آسمانی میں آسمان کی زبانی زمین کو طعنہ دیا گیا ہے۔ آسمان اپنی بلندی پر نازاں ہے وہ زمین پر طنز کرتا ہے کہ زمین تاریک و بے نور ہے۔ جسے سن کر زمین خجل ہو جاتی ہے اور اللہ سے شکوہ کرتی ہے تب ایک ندا آتی ہے کہ وہ غمگین نہ ہو کیونکہ اسے بہت بڑی امانت دی گئی ہے۔ اس غیبی آواز سے زمین کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے بعد تمہیدِ زمینی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں سیاحت سماوی کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا رومی کے ہمراہ فلکِ قمر سے سیاحت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں ایک غار میں عارف ہندی وشوامتر جسے اقبال نے جہاں دوست کہا ہے ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ عارف ہندی انہیں حقائق و معارف سے روشناس کرواتا ہے اور ساتھ ہی حیات و ممات اور دوسرے کئی اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد رومی اقبال کو وادئ یرغمید (وادئ طواسین) کی سیر کراتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال رومی کی رہنمائی میں فلک عطارد پہنچتے ہیں۔ یہاں ان کی ملاقات جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا سے ہوتی ہے۔ یہاں دین و وطن، اشتراکیت و ملوکیت، شرق و

غرب اور زمین کی حقیقی ملکیت جیسے مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ساتھ ہی مشرق ومغرب کے فطری رجحانات و اختلافات کی کیفیتوں پر بھی تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔فلک عطارد میں افغانی روسیوں کو پیغام دیتے ہیں کہ وہ وہی غلطی نہ کریں جو مسلمانوں نے کی۔پچھلی صدیوں میں مسلمانوں نے قرآن کو بھول کر ہاتھ آئی دولت کو کھو دیا تھا۔روسیوں کو چاہئے کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ اپنے ہر عمل میں قرآن کو اپنا رہنما بنائیں۔اس کے علاوہ 'محکمات عالمِ قرآنی' میں اقبال کا عورت کی ہستی کو زبردست خراج ملتا ہے۔وہ عورت کی حیا اور اس کے حجاب کے قائل ہیں۔فلکِ زہرہ پر اقوامِ قدیمہ کے دیوتاؤں کی محفل ہے۔ جہاں وہ اپنے دوبارہ زندہ ہونے کے سلسلے میں ثبوت فراہم کررہے ہیں۔اور اس بات سے خوش ہیں کہ انسان اب دوبارہ ان کی پرستش کرے گا۔اس فلک پر فرعون اور برطانوی جنرل لارڈ کچنر کے عبرت ناک حشر کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس باب کا اہم حصہ مہدی سوڈانی کا وہ پیغام ہے جو انہوں نے اقوامِ عرب وافریقہ کو دیا ہے کہ وہ بیدار ہوں اور مدینہ سے فیض حاصل کریں۔ نیز اقبال نے مادہ پرستی اور مغربی تہذیب کو نشانہ بناتے ہوئے وطن پرستی کے منفی پہلوؤں کے فروغ کی مذمت کی ہے۔

اقبالؔ اور رومی آگے بڑھتے ہوئے فلک مریخ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں اقبال کے تخیل نے اس ستارے کو ایک فلاسفر کہا ہے جس کا نام حکیم مریخی ہے جو انجم شناس ہے ساتھ ہی زمین کی سیاحت بھی کر چکا ہے۔اور دنیا کے حالات سے آگاہ ہے۔اقبالؔ اور حکیم مریخی میں تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے۔ اقبالؔ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔اس فلک پر حاکم ومحکوم کی تفریق نہیں ہے یہاں نہ کوئی سائل ہے نہ کوئی محروم نہ کوئی غلام ہے اور نہ کوئی آقا علاوہ ازیں اس فلک پر تقدیر، تغیر، ترقی، مذہب وغیرہ موضوع پر رومی سے معنی خیز گفتگو ہوتی ہے۔اس کے بعد اقبالؔ اور رومی فلک مشتری پر پہنچتے ہیں یہاں ان کی ملاقات قرۃ العین طاہرہ، منصور حلاج اور غالب سے ہوتی ہے اور ان سے شاعرانہ گفتگو ہوتی ہے۔اس فلک پر ابلیس کا بھی ذکر ہے جو انسان کی کمزوری اور اپنی آسان فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے کسی مردِ حق کی آرزو کرتا ہے۔آگے بڑھتے ہوئے اقبال اور رومی فلکِ زحل پر پہنچتے ہیں جہاں ہندوستان کی سیاسیات پر بحث کی گئی ہے۔اس فلک کو اقبال نے ارواحِ رذیلہ کا مقام قرار دیا ہے۔جنہوں نے ملک وملت سے غداری کی۔میر جعفر اور میر صادق کی روحیں عذاب میں مبتلا ہیں۔ان کی غداری کی وجہ سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تھا۔اقبالؔ ہندوستانیوں

کوغداران ملک وملت سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔اس کے بعد اقبالؔ اور رومی سفر کرتے ہوئے افلاک سے آنسوئے افلاک پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ان کی ملاقات حکیم المانوی نیٹشے سے ہوتی ہے جسے اقبال نے مجذوب فرنگی کہا ہے۔اقبالؔ کا خیال ہے کہ نیٹشے کو اگر صحیح رہنمائی ملتی تو وہ توحیدِ اسلامی کا قائل ہوجاتا۔اس کے بعد اقبالؔ رومی کے ہمراہ جنت الفردوس میں داخل ہوتے ہیں جہاں عیش وعشرت کے تمام سامان میسر ہیں۔ یہاں ایک شاندار محل ہے جوشرف النساء کا ہے جونواب خالق بہادر کان کی بیٹی اور عبدالصمد کان کی پوتی تھیں جوصوبہ پنجاب کے گورنر تھے۔شرف النساء نے قرآن اور تلوار کو زندگی کا مقصد بنایا تھا۔اقبال کی نظر میں وہ ایک مثالی خاتون تھیں۔انہوں نے اپنی زندگی انتہائی شرعی اور فعال گزاری۔اس کے بعد سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری سے ملاقات ہوتی ہے۔ان کی گفتگو میں خطۂ کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل پر گراں بہا خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے وہ شاعری کے محرکات سے بحث کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ شعر میں سوز آرزو سے ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔آگے نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور شہید ٹیپو سلطان سے ملاقات ہوتی ہے۔اس کے علاوہ یہاں ایرانیوں کے موجودہ رجحانات، ملت افغانیہ اور دریائے کاویری کے نام پیغامات شامل ہیں۔اس کے بعد عین 'حضور' میں حاضری ہوتی ہے جہاں علم وعشق کے حقائق، نئے الفاظ اور نئے انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہاں اقبال تقدیرِ مشرق ومغرب کو بے حجاب دیکھنے کی آرزو کرتے ہیں کہ اچانک تجلیٔ جلال نمودار ہوتی ہے اور اقبال جلوے کی تاب نہ لاکر گر جاتے ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ ''خطاب بہ جاوید'' پر مشتمل ہے۔جس میں نوجوانوں کو حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سلیقے بتائے گئے ہیں۔مثلاً توحید کی حقیقت، اسلامی عبادات اسلامی شعار پر غور وفکر کرنے کی اہمیت، خودی، تقویٰ، احترامِ آدمیت، جذبہ فقر، صدق اخلاص کی روش جیسی حکیمانہ نصائح کا گراں مایہ سرمایہ موجود ہے۔غرض جاوید نامہ فکر وفن دونوں اعتبار سے بلند اور رجائیت سے بھرپور شاہکار ہے۔

ترجمۂ جاوید نامہ کا جائزہ:

ایثارؔ کا یہ ترجمہ ۲۰۰۳ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ایثارؔ نے جاوید نامہ کو اردو کا

منظوم،خوبصورت اوردلکش لباس زیب تن کیا ہے۔جاوید نامہ چونکہ ایک طویل تمثیلی نظم ہے اور جہانِ دیگر سے متعلق ہے۔مزید اقبال کی زبان جو رمز وکنایہ،تشبیہ واستعارہ اور فلسفے سے لبریز ہے اسے سمجھنے کے لئے ادب تاریخ،فلسفہ،تصوف دینیات،اخلاقیات اورشاعرانہ تلازمات سے آگہی ضروری ہے۔ایثاؔرایسے تجربات میں کماحقہ کامیاب ہوئے ہیں۔ترجمہ کی زبان سادہ اوررواں ہے اورمترجم کی محنت قابل تعریف ہے مثال کے طور پرمناجات سے چنداشعار پیش ہیں جن میں ترجمے کی شان نظر آتی ہے۔

اقباؔل:

دیدہ ام روزِ جہانِ چار سوے
آنکہ نورش برفروزد کاخ وکوے
از رمِ سیارۂ اورا وجود
نیست اِلا اینکہ گوئی رفت وبود
اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست
صبح او را نیم روز و شام نیست

ترجمہ:

روز روشن میں نے دیکھے چار سو
جن سے روشن ہیں جہاں کے کاخ وکو
حرکتِ سیارہ سے ان کا وجود
یعنی ان کی کل حقیقت رفت و بود
خوب وہ دن جونہیں ایام سے
جونہیں وابستہ صبح و شام سے

ان اشعار کے ترجمے میں اقبال کے افکار کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے۔سادہ وسلیس الفاظ میں اصل کی عکاسی کی ہے۔مترجم نے اصل قوافی کا سہارا لے کر ترجمہ کیا ہے۔مجموعی طور پر ترجمہ دلکش و پرمغز

ہے۔

اقبالؔ:

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من

جلوۂ داری دریغ از جانِ من

ترجمہ:

تیرا رخ ایماں مرا، قرآں مرا

جلوہ اس جاں سے ہے کیوں پنہاں ترا؟

اقبالؔ:

گرچہ برگردوں ہجومِ اختر است

ہر یکے از دیگرے تنہا تر است!

ترجمہ:

یوں تو تارے ہیں فلک پر بے شمار

سب اکیلے دور دوران کے مدار

نظم زمزمۂ انجم سے چند اشعار پیش ہیں جس میں ایثارؔ نے اقبال کے پیغام کو من وعن پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اقبالؔ:

عقلِ تو حاصلِ حیات عشقِ تو سرِ کائنات

پیکرِ خاک! خوش بیا ایں سوے عالمِ جہات

زھرہ و ماہ و مشتری از تو رقیبِ یک دگر

از پئے یک نگاہِ تو کش مکشِ تجلیات

در رہِ دوست جلوہ ہاست تازہ بتازہ نو بنو

صاحبِ شوق و آرزو دل نہ دہد بکلیات
صدق وصفاست زندگی، نشو ونماست زندگی
تا ابد از ازل بتاز ملکِ خداست زندگی
شوقِ غزلسرائے رارخصتِ ہاے وہو بدہ
باز بہ رند ومحتسب بادہ سبو سبو بدہ

ترجمہ:

عقل ہے حاصلِ حیات، عشق ہے سرِ کائنات
پیکرِ خاک آذرا چھوڑ کے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ ومشتری تجھ سے رقیب اک دگر
دعوتِ دید ہے تجھے کش مکشِ تجلیات
جلوے ہیں راہِ یار میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو
صاحبِ شوق کے لئے کافی نہیں ہیں کلیات
صدق وصفا ہے زندگی، نشو ونما ہے زندگی
دوڑ ازل سے تا ابد، ملکِ خدا ہے زندگی
شوقِ غزل سرائی کو لذتِ ہائے وہو بھی دے
رند کو محتسب کو تو بادہ سبو سبو بھی دے

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''خوش بیا'' کا ترجمہ ایثؔار نے ''خوشی خوشی آ کے بجائے''،'' آذرا چھوڑ کے'' کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں فارسی اور اردو کے لسانی قرب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیشتر الفاظ کو جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ جیسے ''رقیبِ یک دگر، کش مکشِ تجلیات، تازہ بتازہ نو، صاحبِ شوق'' وغیرہ۔ چوتھے شعر کا ترجمہ بہت خوب کیا ہے اس میں اصل کا لطف آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

صدق وصفاست زندگی، نشو ونماست زندگی

تا ابد از ازل بتاز ملکِ خدا است زندگی

ترجمہ:

صدق وصفا ہے زندگی، نشو ونما ہے زندگی
دوڑ ازل سے تا ابد، ملکِ خدا ہے زندگی

فلکِ قمر سے چند اشعار پیش ہیں:

اقبالؔ:

ایں زمیں وآسماں ملکِ خدا است
ایں مہ وپرویں ہمہ میراثِ ماست
اندریں رہ ہر چہ آید در نظر
با نگاہِ محرمے او را نگر
چوں غریباں در دیارِ خود مرو
اے زخود گم اند کے بیباک شو!
این وآں حکمِ ترا بر دل زند
گر تو گوئی ایں مکن آں کن، کند

ترجمہ:

ملک اللہ کی زمین وآسماں
اپنا ورثہ مہر و ماہ و کہکشاں
راہ میں اپنی تو پائے گا جنہیں
با نگاہِ محرمانہ دیکھ انہیں
اپنی دنیا میں نہ پھر بیگانہ وار
چل ذرا بیباک اے غفلت شعار

ہیں سبھی پا بند تیرے حکم کے
گر کہے تو یہ نہ کر وہ کر، کرے

اس پورے ترجمے میں ایثاؔر نے اصل کے معنی ومفہوم کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں اپنے ترجمے میں سمویا ہے۔ترجمہ نہایت رواں اور غنائیت سے بھر پور ہے۔اوراس غنائیت میں طبع زاد کا لطف آتا ہے ملاحظہ ہو:

اقباؔل:

چوں زمین وآسماں راطے کنی
ایں جہان وآں جہاں راطے کنی
از خدا ہفت آسماں دیگر طلب
صدزمان وصدمکاں دیگر طلب

اقباؔل کہہ رہے ہیں کہ جب تو زمین اورآسمان کو طے کرلے اس جہان اوراس جہان کو طے کرلے تو پھرآرام سے مت بیٹھنا بلکہ اللہ سے سات آسمان کوطلب کراورسوزمان اورمکاں طلب کر۔اس بات کوایثاؔر نے نہایت خوبصورتی سے اپنے ترجمے میں من وعن اس طرح پیش کیا ہے۔

ترجمہ:

جب زمین وآسماں کو طے کرے
اس جہاں اوراس جہاں کوطے کرے
مانگ پھر اللہ سے سات آسماں
پھر طلب کر سوز ماں اور سومکاں

مذکورہ تراجم اصل کا ایسا عکس پیش کرتے ہیں گویا اصل ہی ہیں۔ان تراجم سے ثابت ہوتا ہے کہ ایثاؔر نے ترجمہ کا حق ادکردیا ہے۔

اقبالؔ:

من چوں کوران دست بر دوش رفیق
پا نہادم اندراں غارِ عمیق
ماہ راا ز ظلمتش دل داغ داغ
اندر و خورشید محتاجِ چراغ!
وہم وشک بر من شبیخوں ریختند
عقل و ہوشم را بدار آویختند!
راہ رفتم رہزناں اندر کمیں!
دل تہی از لذتِ صدق و یقیں!
تا نگہ را جلوہ ہا شد بے حجاب
صبحِ روشن بے طلوعِ آفتاب!

ترجمہ:

جیسے اندھا دوشِ ہمدم تھام کر
غار کے اندر چلا میں بے خطر
اس کی ظلمت چاند کے سینے کا داغ
چاہئے سورج کو بھی اس میں چراغ
ہو گیا شک و گماں میں مبتلا
ہاتھ عقل و ہوش سے دھونا پڑا
گھات میں گویا کہ رہزن ہر کہیں
دل ہوا بیگانۂ صدق و یقیں
ہو گئے اک لخت جلوے بے نقاب

صبح نکلی بے طلوعِ آفتاب

ان اشعار کے ترجمہ میں ایثاؔر نے بیشتر جگہوں پر ترجمانی کی ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'بے خطر' لفظ اضافی ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ ''ماہ راازظلمتش دل داغ داغ'' کا ترجمہ ''اس کی ظلمت چاند کے سینے کا داغ'' کیا ہے۔ تیسرا شعر مکمل ترجمانی کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر تمام اشعار میں اصل متن کا مفہوم اجاگر کیا ہے۔ ''حرکت بہ وادیٔ برغمید کہ ملائکہ اوراوادیٔ طواسین می نامند'' سے چند اشعار کا ترجمہ پیش ہے۔

اقباؔل:

رومؔی آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل
گفت ''آں شعرے کہ آتش اندروست
اصل او از گرمیٔ اللہ ہوست!
آں نوا گلشن کند خاشاک را
آں نوا برہم زند افلاک را!
آں نوا برحق گواہی می دہد
بافقیراں پادشاہی می دہد!
خوں ازو اندر بدن سیارتر
قلب از روح الامیں بیدارتر
اے بسا شاعر کہ از سحر ہنر
رہزنِ قلب است وابلیسِ نظر!

ترجمہ:

رومؔی وہ عشق و محبت کے دلیل

عاشقوں کو ان کا نغمہ سلسبیل
بولے وہ نغمہ کہ جس میں آگ ہے
درحقیقت عشقِ حق کا راگ ہے
نغمہ وہ گلشن کرے خشاک کو
وہ کرے زیروزبر افلاک کو
وہ نوا حق وصداقت پر گواہ
وہ فقیروں کو بنا دیتی ہے شاہ
اس کے باعث تن میں خوں سیارتر
قلب بھی جبریل سے بیدارتر
شاعر اکثر ہوتے ہیں جادو بیاں
رہزن قلب ونظر ان کی زباں

درج بالا اشعار کا ترجمہ دلکش ہے۔ شاعر نے سیدھے سادے الفاظ میں اقبال کے تخیل کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ بعض جگہوں پر ترجمے کی بجائے ترجمانی سے کام لیا ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں تشنہ کاماں سے مراد ''پیاسے'' بمعنی عشق کے پیاسوں سے ہے لیکن ترجمہ میں ایثاؔر نے اس کی جگہ ''عاشقوں'' کا استعمال کیا ہے۔ آخری شعر کا دوسرے مصرعہ ''رہزنِ قلب است وابلیس نظر!'' کا ترجمہ ''رہزن قلب ونظر ان کی زباں'' پوری طرح ترجمانی ہے۔ جبکہ باقی اشعار کے ترجمے اصل سے بے حد قریب نظر آتے ہیں۔ منظوم ترجمے میں ایثاؔر جہاں ایک طرف شاعر کے تصور اور خیال کو دوسری زبان میں متعارف کرواتے ہے تو دوسری طرف عروض اور غنائیت کے دامن کو بھی تھامے رکھتے ہیں یہی ان کے فن کی اہم خوبی ہے۔ ''زیارت ارواح جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا'' کا ترجمہ دیکھیں:

اقبالؔ:

مشتِ خاکے کار خود را بردہ پیش

در تماشائے تجلی ہائے خویش !

یا من افتادم بدام ہست و بود

یا بدامِ من اسیر آمد وجود !

اندریں نیلی تتق چاک از من است؟

من ز افلاکم کہ افلاک از من است؟

یا ضمیرم را فلک در بر گرفت

یا ضمیرِ من فلک را در گرفت

اندرون است ایں کہ بیرون است؟ چیست؟

آنچہ می بیند نگہ چون است؟ چیست؟

پر زنم بر آسمانے دیگرے

پیش خود بینم جہانے دیگرے

عالمے با کوہ و دشت و بحر و بر

عالمے از خاکِ ما دیرینہ تر

عالمے از 'ابر کے' بالیدۂ

دستبرد آدمے نا دیدۂ

نقشہا نا بستہ بر لوحِ وجود

خردہ گیر فطرت آنجا کس نبود!

بترجمہ:

آگے آگے ہم یوں ہی بڑھتے چلے

خود جلو میں اپنے جلوؤں کو لئے

یا تو میں خود تھا اسیر ہست و بود

یا پھنسا خود میرے ہاں آکر وجود

چاک یہ نیلا تتق میں نے کیا؟
یا ہوں فلکی یا فلک خود ہے مرا؟
سینۂ گردوں میں میرا دل ہے یا
میرے دل میں آسماں خود آ بسا
میرے اندر ہے کہ باہر، ہے کہاں؟
کیا ہے ویسا ہی، یہ جیسا ہے عیاں؟
اڑتے اڑتے طے کیا اک آسماں
آ گیا پھر سامنے دیگر جہاں
اک جہاں با کوہ و دشت و بحر و بر
اپنی دنیا سے وہ دنیا کہنہ تر
گیس کا تشکیل دادہ اک جہاں
دست برد آدمی سے باا ماں
نقش اس کی لوح پر کوئی نہیں
کوئی فطرت پر نہیں تھا نکتہ چیں

ڈاکٹر اقبالؔ کے تصورات کی دنیا کی سیر کرتے ہوئے سید احمد ایثارؔ بھی وہاں تک جا پہنچے جہاں اقبالؔ اپنے قاری کو پہنچانا چاہتے ہیں۔'زیارت ارواح جمال الدین افغانی وسعید پاشا' کے عنوان سے یہ خاصی طویل نظم ہے۔ یہاں پہلا بند پیش ہے۔اس مشکل ترجمے کی پرخار وادی کو ایثارؔ نے بحسن وخوبی طے کرلیا ہے۔ اقبالؔ کے فارسی کلام کا ترجمہ کرنے سے قبل انہوں نے ترجمے کے اصولوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع ''درتماشائے تجلی ہائے خویش'' کا ترجمہ ''خود جلو میں اپنے جلووں کو لیے'' کرکے ایثارؔ نے کمال کردیا ورنہ کس کے پردۂ خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ 'تماشائے' کا مطلب یہاں 'جلو' اور 'تجلی' کا مطلب 'جلوہ' بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح آخری شعر سے پہلے کے شعر میں بھی غور کیجیے ۔یہاں اقبالؔ نے

'ابر کے' کا لفظ استعمال کیا ہے، ایثآر کے ذریعے کیے گئے ترجمے 'گیس' پر جب نظر پڑی تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے کہ ابر کے' کا اس سے بہتر ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ وہ سائنس کے طالبِ علم تھے ان کا سائنسی مطالعہ بھی بے حد وسیع ہے۔ انہوں نے 'ابر کے' کو یہاں 'گیس' سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایثآر کی ترجمہ نگاری پر کبھی کبھی سہل ممتنع کا گمان ہوتا ہے۔ مشکل مفہوم کو آسان اور سریع الفہم لفظوں میں پرو دینا ان کی فنکاری کا کمال ہے۔

اقبآل:

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علم حرف وصوت را شہپر دہد
پا کیِ گوہر بہ نا گوہر دہد
علم را بر اوجِ افلاک استِ رہ
تا ز چشمِ مہر بر کند د نگہ
نسخۂ ا و نسخۂ تفسیر کل
بستۂ تد بیر ا و تقد یرِ کل
دشت را گوید حبابے دہ دہد
بحر را گوید سرابے دہ دہد!
چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

ترجمہ:

حق نے حکمت کو کہا خیرِ کثیر
لے، جہاں بھی مل سکے، اے راہ گیر
علم حرف وصوت کو دیتا ہے پر

سنگ پارہ اس سے تابندہ گہر
علم کی افلاک پر ہے رہ گزر
تا کہ چھینے بڑھ کے سورج سے نظر
اس کا نسخہ ، نسخہ تفسیر کل
اس کی ہی تدبیر سے تقدیرِ کل
وہ جو مانگے دشت سے مل جائے آب
وہ بنا سکتا ہے دریا کو سراب
چھانتا ہے اندرونِ کائنات
دیکھنے رازِ درونِ کائنات

حدیث نبوی ہے:**الحکمة الضالة المومن فحیث وجدھافاحق بھا** یعنی حکمت مومن کی گمشدہ دولت ہے وہ جہاں بھی ملے اسے لے لینا چاہیے۔اقبالؔ نے اسی حدیث نبوی کو فارسی قالب عطا کیا تھا۔اقبالؔ نے اس قول عظیم کی نسبت ''خدا'' کی طرف کی ہے۔یہاں یہ اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تو حدیث نبوی ہے تو پھر اسے خدا سے کیوں منسوب کیا گیا،اس کا جواب یہ ہے کہ جوفرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے وہی فرمان خداعزوجل بھی ہے۔سیداحمد ایثارؔ نے اپنے منظوم ترجمے میں اقبالؔ کے پیغام کی بہترین ترسیل بھی کی ہے۔اورحدیث نبوی کو بھی بڑی خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ اردو کا جامہ پہنا دیا ہے۔پہلے مصرعے سے اخیر تک مطالعہ سے کہیں بھی ایسا نہیں محسوس ہوگا کہ ایثارؔ نے ترجمہ کرنے میں اصل متن سے دور ہو گئے ہوں وہ لفظوں کی تب وتاب،معنی کی تہہ داری اور لہجوں کی کھنک کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔

اقبالؔ:

دل اگر بندد بہ حق،پیغمبری است
ورزحق بیگانہ گردد کافری است
علم رابے سوزِ دل خوانی شراست

نو رِا و تا ریکیٔ بحر و بر است
عالمے از غازِ او کور و کبود
فرو دینش برگ ریزِ ہست و بود
بحرودشت وکوہسار وباغ وراغ
از بمِ طیارۂ او داغ داغ !

ترجمہ:.

حق رسا ہو وہ تو ہے پیغمبری
حق سے ہو بیگانگی تو کافری
سوز دل جس میں نہ ہو وہ علم شر
تیرہ اس کی روشنی سے بحر و بر
دھند سے اس کی سب عالم پر دھواں
باغِ ہستی کو بہار اس کی خزاں
بحر و دشت کو ہسار باغ و راغ
اس کے طیاروں کے بم سے داغ داغ

یہ ترجمہ روانی بحر، بے ساختگی اور شعری غنائیت سے لبریز ہے۔ پہلے مصرعے میں مترجم نے لفظ ’’دل‘‘ کونظر انداز کیا ہے لیکن مفہوم واضح ہے۔اسی طرح دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ’’خوانی‘‘ کونظر انداز کیا ہے۔’’کوروکبوذ‘‘ کی اصطلاح میں ’’دھواں‘‘ استعمال کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ منظوم ترجمہ نگاری میں وہ اقبال کی سطح تک پہنچ گئے ہیں مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اقبالؔ کی سطح کومس کرنے کی سعی ضرور کی ہے اور یہی ایثارؔ کے فن کی معراج ہے۔زیرنظر منظوم ترجمہ اس کا کھلا ثبوت ہے۔

اقبالؔ:

آنچہ دیدم می نگنجد در بیاں

تن ز سہمش بے خبر گردد ز جاں !

من چہ دیدم؟ قلزمے دیدم زخوں !

قلزمے طوفاں بروں طوفاں دروں !

در ہوا ماراں چو در قلزم نہنگ

کفچہ شب گوں بال و پر سیماب رنگ !

موجہا درندہ مانندِ پلنگ !

از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ !

بحر ساحل را اماں یک دم نداد

ہر زماں کہ پارۂ درخوں فتاد

موجِ خوں با موجِ خوں اندر ستیز

درمیانش زورقے درافت وخیز !

اندراں زورق دومردِ زردروے

زردرد، عریاں بدن، آشفتہ موئے !

ترجمہ:

جو بھی دیکھا کر نہیں سکتا بیاں

ڈر سے تن کھودیتا ہے احساس جاں

میں نے کیا دیکھا ہے؟ اک دریائے خوں

ایک طوفاں خیز دریا، دربروں

مار موزی تھے ہواؤں میں ادھر

پھن سیاہی پوش، اجلے بال و پر

پنجہ زن موجیں تھیں مانند پلنگ

ان کے ڈر سے مردہ ساحل پر نہنگ

بحر سے آ ر ا م سا حل کو کہا ں
کو ہ پا ر ے گر ر ہے تھے ہر ز ما ں
موج خوں سے موجِ خوں تھی جنگ پر
ا س میں کشتی ڈ ولتی ز یر و ز بر
ز ر د رو ہیبت ز د ہ ا س میں د و تن
با ل بکھر ے ، چہر ہ فق ، ننگا بد ن

'قلزم خونیں' کے عنوان سے اس نظم میں ڈاکٹر اقبالؔ نے بحرِقلزم کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں اور ایثارؔ کے منظوم ترجمے نے اردو کے قارئین کو بھی ان مشاہدات میں شریک کرلیا ہے۔ یوں تو ترجمہ قریب المفہوم ہے لیکن بعض الفاظ کر ترجمہ ذہن میں کھٹکتا ہے۔ جیسے قلزم کے لئے لفظ دریا۔ یہاں سلاست اور روانی مترجم کے ہاتھ سے جاتی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو مترحم کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کیوں کہ منظوم ترجمہ نگاری میں بہت سارے مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں مترجم اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود مجبور ہے اسے ردیف وقافیہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور مقصد برآوری بھی پیشِ نظر ہوتی ہے۔''درہوا ماراں چودر قلزم نہنگ'' کا ترجمہ ''مارموزی تھے ہواؤں میں ادھر'' کیا ہے۔ جو اصل سے دور محسوس ہوتا ہے۔اس میں قلزم اور نہنگ کا ذکر نہیں ملتا مترجم نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ بہت سارے لفظوں کا ترجمہ ایثارؔ نے اتنا بہترین کیا ہے کہ زبان پر بے ساختہ واہ واہ کی صدا بلند ہونے لگتی ہے جیسے ''اُفت وخیز'' کا ترجمہ ''زیروزبر'' اور'' آشفتہ موئے'' کا ترجمہ ''بال بکھرے'' کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ درندہ کو پنجہ زن کہا ہے جو کہ مناسب ہے۔اس کے علاوہ بھی اس منظوم ترجمے میں بیشتر اشعار کے تراجم ایسے ہیں جو طبع زاد معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقیت وغنائیت کی خصوصیت سے لبریز ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اقبالؔ:

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست

پیشِ صاحبِ نظراں حورِ جناں چیزے نیست!
ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی، گذرد
کوہ و صحرا و برو بحر و کراں چیزے نیست!

ترجمہ:

بادۂ کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
آنکھ والوں کے لئے حورِ جناں کچھ بھی نہیں
جس کو سمجھا ہے تو قائم وہ گزر جاتا ہے
کوہ و صحرا و برو بحر و کراں کچھ بھی نہیں

اقبالؔ:

جسم را از بہر جاں باید گداخت
پاک را از خاک می باید شناخت!
گر ببری پارۂ تن را ز تن
رفت از دستِ تو آں لختِ بدن!

ترجمہ:

جاں کی خاطر جسم کر دینا فنا
خاک سے یوں پاک کو پہچاننا!
کاٹ دے حصہ کوئی گر جسم کا
ہاتھ سے تیرے وہ حصہ کھو گیا

جاوید نامہ اقبالؔ کے فلسفیانہ خیالات سے لبریز ہے۔ اقبالؔ کی فکر اور پیغام کی اہمیت کے پیش نظر ایثارؔ نے کوشش کی ہے کہ اصل متن اور الفاظ و تراکیب کے قریب ترین رہتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔ اس ضمن میں

انہوں نے اقبال کی تمام تخلیقات کا ترجمہ ان کی اصل بحر ہی میں کیا ہے تا کہ اس مخصوص بحر کے استعمال سے اقبآل نے جو فضا تخلیق کی ہے وہ ترجمے میں محسوس ہو اور ان کا مخصوص آہنگ برقرار رہے۔

پس چہ باید کرد کا تعارف:

اقبآل کی نہایت فکر افروز مثنوی جس میں فکرِ اقبال کے متعدد پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے وہ ہے ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق''۔ ۱۹۳۳ء میں اقبال نے نادرشاہ کی دعوت پر مولانا سید سلیمان ندوی اور سر سید راس مسعود کے ہمراہ افغانستان کا سفر کیا اس سفر کی غرض و غائیت بعض مذہبی اور تعلیمی امور کے متعلق مشاورت تھی وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات اس مثنوی کی صورت میں نظم کئے ہیں۔ اور بعنوان مسافر کے نام سے شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں اسے مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کے ساتھ شائع کیا۔ اس مثنوی میں انہوں نے نادرشاہ، شہنشاہ بابر، حکیم سنائی، سلطان محمود غزنوی وغیرہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں اقبآل اپنے پیغمبرانہ منصب کا حق ادا کرنے کے لئے مضطرب نظر آتے ہیں۔ وہ اقوامِ مشرق کی زبوں حالی کو دیکھکر رنجیدہ ہوجاتے ہیں۔ مشرق کو مغرب کے تسلط سے آزاد کروانا چاہتے ہیں، اس مقصد کی خاطر انہوں نے ایک راہِ عمل تجویز کیا۔ اس مثنوی کا عنوان اسی راہِ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔

مثنوی مسافر کی تمہید میں اقبآل نے نادرشاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ اس کے بعد اپنی طلبی کا ذکر اور آخر میں اپنی روانگی کا حال قلمبند کیا ہے۔ دوسری فصل میں اقوامِ سرحد سے خطاب کیا ہے۔ جس میں دینِ اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اور افغانوں کو قرآن و حدیث کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔ اس کے بعد نادرشاہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضری، حکیم سنائی کے مزار پر حاضری کا حال قلمبند کیا ہے۔ آگے حکیم سنائی کی زبان سے فقر کا فلسفہ سپردِ قلم کیا ہے۔ سلطان محمد غزنوی کے مزار پر حاضری کے حالات کو نظم کیا۔ ''مرد شوریدہ'' میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر ماتم کرتے ہوئے اللہ سے دعا کی ہے کہ ان کے دلوں میں پھر عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کردے تا کہ انہیں دنیا میں کامیابی و سرخروئی حاصل ہو سکے۔ اس کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا حال بھی رقم کیا ہے۔ اور آخر میں ظاہر شاہ سے خطاب ہے جس میں اسے رموزِ سلطانی سے آگاہ کیا ہے۔

مثنوی پس چہ باید کرد کا مرکزی تصور پیغامِ عشق ہے۔ کیونکہ اقبال کے مطابق مسلمانوں کو کامیابی اور سربلندی اسی راہ پر گامزن ہونے پر حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ مثنوی ان کے تمام پیغامات اور فلسفے کی اجمالی تصویر ہے، اس مثنوی میں دین وسیاست کے وہ اسرار و رموز واضح کیئے ہیں جس سے آگاہ ہو کر اقوام دنیا میں سرخرو ہوسکتی ہے۔

ترجمۂ پس چہ باید کرد کا جائزہ:

پس چہ باید کرد منظوم اردو ترجمہ کی اشاعت ۲۰۰۶ء میں عمل میں آئی۔ ایثاؔر نے نہایت شگفتگی سے اقبال کی فکر کو ترجمہ میں پیش کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ترجمہ سلیس، سادہ اور دلچسپ ہے اور اقباؔل کی فکر و تخیل کو دلچسپ پیرائے انداز میں بیان کیا ہے۔ الفاظ و تراکیب اور محاورات کی ترتیب درست ہے۔ بیشتر جگھوں پر لفظی ترجمہ کی بجائے ترجمانی کی ہے۔ ذیل میں چند اشعار اور ترجمہ پیش ہے۔

اقباؔل:

نادرِ افغاں شہِ درویش خو
رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملت محکم از تدبیرِ او
حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
عہدِ صدیقؓ از جمالش تازہ شد!
عہدِ فاروقؓ از جلالش تازہ شد!

ترجمہ:

نادرِ افغانی شہِ درویشِ اصول
روح پر ان کی ہو رحمت کا نزول
قوم مضبوط آپ کی تدبیر سے
دین محفوظ آپ کی شمشیر سے

اک نمونۂ عہدِ صدیقی جمال
عہدِ فاروقی کا آئینہ جلال

پہلے مصرعہ میں ''درویش خو'' کو ''درویش اصول'' سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے شعر کا ترجمہ قابلِ ستائش ہے۔ روانی اور غنائیت کے ساتھ نہایت خوبصورت ترجمہ پیش کیا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال کہہ رہے ہیں ان کے جمال سے عہدِ صدیق کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کے جلال سے عہدِ فاروق کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس شعر کے ترجمے میں مفہوم تھوڑا مبہم محسوس ہوتا ہے۔ چند اور مثالیں دیکھیں:

اقبالؔ:

اے ز خود پوشیدہ خود را باز یاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب!
رمزِ دینِ مصطفیٰ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی است!
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

ترجمہ:

اے نہاں خود سے سمجھ اپنا مقام
ہے حجاب اندر مسلمانی حرام
رازِ دینِ مصطفیٰ خود آگہی
فاش کرنا خود کو ہی شہنشاہی
دیں حقیقت میں ہے عرفانِ خودی

گر نہ ہوں خود بیں تو جینا موت ہی

تینوں اشعار کے ترجمے قریب المفہوم ہیں۔ ''پوشیدہ'' کیلئے ''نہاں'' درست مترادف ہے البتہ بازیاب بمراد ''پالینا'' یا ''پھر سے پالینا'' ہوتا ہے جبکہ اسے ایثآر نے ''سمجھ اپنا مقام'' کہا ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں اقبال کا انداز سوالیہ ہے کہ ''کیا تو جانتا ہے کہ مصطفیٰ کے دین کا کیا راز ہے'' لیکن ایثار نے ترجمے میں بیانیہ انداز اپنایا ہے کہ ''رازِ دینِ مصطفیٰ خود آ گہی'' جبکہ دوسرا مصرعہ کا ترجمہ بالکل اصل سے قریب ہے۔ یہی بات تیسرے شعر کے ترجمے میں بھی نظر آتی ہے۔ ''چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش'' کا مطلب ''دین کیا ہے اپنے رازوں کو پالینا یا واقف ہونا''۔ جسکا ایثآر نے ترجمہ بجا طور پر ''دیں حقیقت میں ہے عرفانِ خودی'' کیا ہے۔

اقبآل:

خیز داز دل نالہ ہا بے اختیار

آہ! آں شہرے کہ ایں جا بود یار!

آں دیار وکاخ وکو ویرانہ ایست

آں شکوہ وفال وفر افسانہ ایست

گنبدے! در طوف او چرخ بریں

تربت سلطان محمود است ایں!

آنکہ چوں کودک لب از کوثر بشست

گفت در گہوارہ نام او نخست

برق سوزاں تیغ بے زنہار او

دشت و در لرزندہ از یلغار او

ترجمہ:

دل سے آہیں اٹھتی ہیں بے اختیار

آ ہ ! تھا آ با دکل تک جو د یا ر

و ہ د یا ر و کا خ و کو و یر ا نہ ا ب

و ہ شکو ہ و فا ل وفر ا فسا نہ ا ب

یہ شہِ محمو د کی آ ر ا م گا ہ

طوف میں اس کے فلک شام وپگاہ

با ت کے قا بل جہا ں بچہ ہو ا

ا ول ا س کا نا م جھو لے میں لیا

بجلیا ں تو ڑ ا کیا تلو ا ر سے

د شت و د ر پر کپکپی یلغا ر سے

اقبالؔ نے یہ اشعار سلطان محمود کے مزار پر کہے تھے۔اقبال نے یہاں اپنے دل کے نالے بیان کیے ہیں اور مترجم نے اردو قارئین کو بھی ہمنوا بنالیا ہے۔اس نظم میں اور بھی اشعار ہیں۔ایثارؔ کے ترجمے کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔بعض جگہوں پر ترجمہ پڑھ کر ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ترجمہ بہ تکلف کیا گیا ہے۔دوسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کے ترجمے کے مطالعے سے صاف جھلکتا ہے کہ مترجم کو منظوم ترجمہ نگاری کے پیکر میں ڈھالنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی اور یوں یہ ترجمہ تکلف سے پر ہوگیا ہے۔پہلے شعر سے برجستگی، بے ساختگی، سلاست اور روانی کی جولہر اٹھی تھی دھیرے دھیرے قائم نہ رہ سکی اور اس کا رخ دوسری سمت ہوگیا۔پانچویں شعر کے پہلے مصرع ’بجلیاں توڑا کیا تلوار سے‘‘ میں مفہوم ذہن میں کھٹکتا ہے۔اس نظم کا آخری شعر دیکھیے:

اقبالؔ:

تا نبودم بے خبر از راز او

سوختم از گرمی آواز او

ترجمہ:

میں نہ تھا آگاہ اس کے راز سے

جل رہا تھا گرمیِ آواز سے

اس آخری شعر میں ترجمے کی وہی کیفیت ہے جس کے لیے ایثؔار جانے جاتے ہیں۔ گویا پہلے شعر سے انھوں نے ترجمے کا سفر جن خوبیوں کے ساتھ شروع کیا تھا، وہ درمیان تک پہنچتے پہنچتے ان کا ساتھ چھوڑ گئیں لیکن اخیر تک پہنچتے ہی پھر سے شریک سفر ہوگئیں۔

''ظاہر شاہ کے نام خطاب'' میں اقبال نے ان کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں نادرشاہ اوراحمد شاہ کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس نظم سے چند اشعار اور اس کا ترجمہ پیش ہے جس میں ایثؔار نے اقبال کے پیام کو اردو کے قالب میں نہایت عمدگی سے ڈھالا ہے جو قابلِ ستائش ہے:

اقبؔال:

با مسلما ناں غمے بخشید ہ ا م
کہنہ شا خے را نمے بخشید ہ ا م
عشقِ من از زند گی دارد سراغ
عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟
با مسلماں حرفِ پرسوزے کہ گفت؟
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقامِ خویش برمن فاش گشت
حر فِ شوق آ موختم و ا سوختم
آ تشِ افسر د ہ با ز ا فر وختم!
با من آ ہِ صبح گا ہے دا د ہ اند
سطوتِ کو ہے بکا ہے دادہ اند

دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ!
در شرابِ من سرورِ لا الٰہ!
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست!
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام!

ان اشعار میں اقبالؔ نے یہ پیغام دیا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو نیا احساس دیا ہے۔ میں نے اس پرانی شاخ کو نمی دی ہے۔ میرا عشق زندگی کے معنی بیان کرتا ہے۔ میری شراب سے عقل کا جام روشن ہے۔ میں نے مسلمانوں کو شوق کی بات سکھائی اور انہیں سوزِ عشق سے گرمایا۔ میں نے عشق کی بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔ مجھے آہ سحر گاہی عطا ہوئی ہے۔ اس 'کاہ' کو 'کوہ' کی سطوت دی گئی۔ میں اپنے سینے میں لا اِلٰہ کا نور رکھتا ہوں۔ میری شاعری کے شراب میں لا الٰہ کا سرور ہے۔ اسی کے فیض سے میرا فکر فلک پیما ہے۔ اسی کے فیض سے میری ندی ناپیدا کنار ہے۔ ایک دو جام لے لے تاکہ تیغ بے نیام کی طرح چمک اٹھے۔ اقبالؔ کے اس پیام کو ایثارؔ نے من وعن اپنے ترجمے میں یوں سمویا ہے:

اقبالؔ:

بانٹتا ہوں میں مسلمانوں میں غم
شاخِ بے نم کو عطا کرتا ہوں نم
عشق میں میرے ہے ہستی کا سراغ
میری مے سے عقل ہے روشن چراغ
کون کہتا ہے رموزِ جاں فروز
کون مسلم کو عطا کرتا ہے سوز
دشت و در میں کی ہے مثلِ نے فغاں

تا مقام اپنا بھی ہو مجھ پر عیاں

عشق کو اپنا کے خود جلتا رہا

آتشِ افسردہ بھڑکاتے چلا

ہے عطا مجھ کو فغانِ صبح گاہ

کوہ کی سطوت کا حامل ہے یہ کاہ

میرے سینے میں ہے نورِ لا الٰہ

میری صہبا میں سرورِ لا الٰہ

تا بہ گردوں فکر میری ہے بلند

نہر یہ ساحل نہیں کرتی پسند

لے چڑھا صہبا سے میری اک دو جام

تا کہ چمکے مثلِ تیغِ بے نیام

ایثاؔر نے سیدھے سادے الفاظ میں اقبال کے عالی نکات کو ترجمے کا قالب عطا کیا ہے۔ الفاظ و تراکیب کی سلاست، اور ترجمہ کی روانی وغنائیت سے ترجمہ دلکش ہو گیا ہے۔اب پس چہ باید کرد سے چند مثالیں پیش ہیں۔ ''تمہید'' کے ترجمے میں اصل کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ملاحظہ ہو:

اقباؔل:

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر

کاروانِ عشق و مستی راامیر

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش

جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

از نئے آں نےنوازِ پاک زاد

باز شورے درنہادِ من فتاد

گفت جانہا محرمِ اسرار شد
خاور از خوابِ گراں بیدار شد

ترجمہ:

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی کے امیر
ان کا دل قرآن سے تابندہ ہے
اس کے باعث جامِ جم شرمندہ ہے
بانسری اور آپ سا رنگیں نوا
جس کے دم سے میری جاں میں غلغلہ
بولا اہلِ شرق اب بیدار ہیں
ان کے دل اب محرمِ اسرار ہیں

ترجمہ سادہ و سلیس ہے۔ فکرِ اقبال کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایثاؔر نے آسان فہم الفاظ استعمال کر کے ترجمے کو کئی جہتوں سے دلکش بنایا ہے۔ ان تراجم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایثاؔر نے اقباؔل کے افکار کی روح کو ترجمہ میں پیچیدگی سے بچاتے ہوئے بڑے ہی سلجھے ہوئے اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے شعری محاسن کو برقرار رکھنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

اقباؔل:

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر
می کنی ہر ذرہ را روشن ضمیر
از تو ایں سوز و سرور اندر وجود
از تو ہر پوشیدہ را ذوقِ نمود
می رود روشن تر از دستِ کلیم

زورقِ زرینِ تو در جوئے سیم
پرتوِ تو ماہ را مہتاب داد
لعل را اندر دلِ سنگ آب داد
لالہ را سوز دروں از فیض تست
در رگِ او موجِ خوں از فیض تست
نرگساں صد پردہ را برمی درد
تا نصیبے از شعاعِ تو برد

ترجمہ:

بادشاہِ شرق اے مہر منیر!
ذرہ ذرہ تجھ سے ہے روشن ضمیر
تجھ سے ہستی کے سبھی سوز و سرور
فاش دکھلاتا ہے سب کو تیرا نور
تیری زریں ناؤ اور دریائے سیم
ہے رواں جوں دستِ بیضائے کلیم
چاند نے پائی ہے تجھ سے چاندنی
پتھروں میں لعل کو دی روشنی
لالہ کو تیری عطا سوزِ دروں
گرم رو اس کی رگوں میں تجھ سے خوں
پھوٹے نرگس چاک کر کے سو حجاب
تا رہے تیری کرن سے فیضیاب

اقبالؔ کی یہ نظم دراصل آفتاب سے خطاب ہے۔ یہ نظم کے ابتدائی اشعار ہیں۔اس کے ترجمے میں ایثارؔ کےفن کی خوبیاں پوری طرح چمک دمک رہی ہیں اور سادگی وسلاست کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ ترجمے پراصل کا گمان ہوتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ایثارؔ کی شکل میں 'اردو کا اقبال' ہم سے مخاطب ہے۔لفظوں کے گہرے ادراک اوراقبال کی فہم مستعار لیے بغیر ایسا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ پوری نظم کے مطالعے سے یہی کیفیت ذہن پر طاری رہتی ہے۔کسی بھی لمحے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے اصل کلامِ اقبال ہے۔البتہ صرف ایک مقام یعنی اخیر شعر میں بس ایک لمحے کے لیے اردو قاری رک سکتا ہے۔

اقبالؔ:

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعدازاں آساں شود تعمیرِ فکر

ترجمہ:

چاہیے اول اسے تطہیر فکر
بعد اسے آساں رہے تعمیر فکر

یہ آخری مصرع دیکھیے، یہاں ''بعد اسے'' پر ایک لمحے کے لیے نظر رک سی جاتی ہے۔اس پوری نظم میں بس یہی ایک مقام پر جہاں یہ احساس تازہ ہوجاتا ہے کہ شاید یہ ترجمہ ہے،اس کے علاوہ سارے اشعار بالکل اصل معلوم ہوتے ہیں۔

اقبالؔ:

اے تو مابے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ
سوختی لات و منات کہنہ را
تازہ کردی کائنات کہنہ را

در جہانِ ذکر وفکرِ انس وجاں

تو صلوٰت صبح، تو بانگِ اذاں

لذتِ سوز وسرور از لا الہ

در شب اندیشہ نور از لا الہ

نے خدا ہا ساختیم از گاوٴ خر

نے حضور کاہناں افگندہ سر

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست

فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

ترجمہ:

اے کے تو ہے بے نواؤں کو نوا

موت کے ڈر سے تو ملت کو بچا

راکھ کر ڈالے سبھی لات ومنات

اور سجائی نظمِ نو سے کائنات

اِنس وجن کی یہ عبادت گہ یہاں

تو نماز صبح، تو بانگِ اذاں

لا الہ سے لذت سوز وسرور

لا الہ سے خوف کی ظلمت میں نور

پوجنے والے نہیں ہم گاوٴ خر

نہ جھکے کاہن کے آگے اپنے سر

انتہائی لطف تیری شان ہے

فکر کی پاکیزگی احسان ہے

یہ دراصل ایک طویل نعت مبارک ہے ۔ڈاکٹر اقبال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں

اپنا استغاثہ پیش کیا ہے۔ سید احمد ایثآر کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بھی اس نعت خوانی میں اقبال کے ساتھ ہو گئے ہیں بلکہ ان کے لیے تو دو گنا ثواب ہے، ایک نعت خوانی کا اور دوسرا اس خوبصورت نعت پاک کے بہترین اور بامعنی ترجمے کا۔ اقبآل نے جس درد اور جذبۂ دروں سے یہ نعت مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہی درد اور جذبہ دروں ایثآر نے اپنے لفظوں میں انڈیلنے کی حتی الوسیع کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ترجمے کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی نعت پاک کا ترجمہ کر رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ پورا ترجمے میں ایثآر کے اپنے احساسات اور جذبات سانسیں لیتے ہوئے دکھائی دیں گے اور یہی حقیقی انداز اس نعت مبارک کی جان ہے، اس کی روح ہے، اس کا مغز ہے اور اس کی کل کائنات۔ ہاں کہیں کہیں پر ایسا ضرور لگتا ہے کہ منظوم مفاہیم ترجمے میں مفقود ہیں مگر ایسا ہونا فطری ہے کیوں کہ بہر حال یہ ترجمہ اور ترجمانی ہے، اصل نہیں، یہ الگ بات کہ ایثآر کے فن نے اسے اصل بنا کر پیش کر دیا ہے۔ یہ ترجمے کی بہت بڑی خوبی ہے جو بہت کم ہی افراد کو میسر ہوتی ہے۔ اس منظوم ترجمے میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں نہ صرف اصل کا لطف آتا ہے بلکہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

اقبآل:

تو فروغِ صبح و من پایانِ زور
در ضمیرِ من چراغے بر فروز

ترجمہ:

تو سویرا ہے میں ہوں دن کا اخیر
روشنی دے، کر مجھے روشن ضمیر

اقبآل:

در ضمیرش انقلاب آمد پدید

شب گذشت و آفتاب آمد پدید

ترجمہ:

اس کے باطن میں ہے پیدا انقلاب
شب گئی آیا سرِ بام آفتاب

اقبالؔ:

اُمتے بودی امم گردیدہ
بزمِ خود را خود زہم پاشیدہ

ترجمہ:

ایک امت تھی ہوئے ٹکڑے کئی
انتشارِ انجمن ہے تجھ سے ہی

اقبالؔ:

ہر کہ از بندِ خودی وارست، مرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مرد

ترجمہ:

جو خودی سے رشتہ توڑا مر گیا
غیر سے جو رشتہ جوڑا مر گیا

اقبالؔ:

قوت از جمیعتِ روحِ مبیں
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

ترجمہ:

وحدتِ ملی سے ہے دینِ مبیں

دین کیا ہے، عزم و اخلاص و یقیں

اقبالؔ:

مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایام را

ترجمہ:

پختہ تر کر مردِ صحرا، خام کو!
جانچ اپنی فہم سے ایام کو!

اقبالؔ:

زندگانی ہر زماں در کش مکش
عبرت آموز است احوالِ حبشؔ

ترجمہ:

زندگی ہر وقت اندر کش مکش
باعثِ عبرت ہیں احوالِ حبشؔ

اقبالؔ:

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

ترجمہ:

ہے توکل و عزم سے مومن قوی
جس میں یہ دو گن نہ ہوں کافر وہی

بلاشبہ ترجمے میں اصل جیسا رنگ پیدا کرنا مشکل امر ہے تاہم اس منظوم ترجمے میں ایثارؔ نے اقبال کے رنگ و آہنگ کو پیش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ ترجمے میں اصل کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے

بعض جگہوں پر فارسی محاورات کالفظی ترجمہ کیا اور بعض جگہوں پر لفظی ترجمے کی بجائے اردو میں ان کے مماثل اسلوبِ بیان اپنایا ہے۔بعض مقامات پر اس خدشے کے پیشِ نظر کہ اقبالؔ کی فکر اور مضامین کو اردو جامہ پہناتے ہوئے کسی قسم کی لغزش یا نقصان نہ ہواس لئے انہوں نے فارسی تراکیب کوتبدیل نہیں کیا۔بحثیت مجموعی ''پس چہ باید کرد'' کا یہ ترجمہ ایثارؔ کی تخلیقی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا عمدہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔مترجم متعدد مقامات سے بہ آسانی گزر گئے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ترجمے کے پل صراط سے گزر جانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں لیکن ایثارؔ بہت خوش اسلوبی سے اس مشکل سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

ارمغان حجاز کا تعارف:

ارمغانِ حجاز اقبال کا آخری مجموعہ کلام ہے جس کی اشاعت اقبالؔ کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ارمغانِ حجاز اقبال کی فکر وفلسفہ وتعلیمات کا نہایت دلکش مرقع ہے۔اقبال عمر بھر حجاز کے سفر میں منہمک رہے۔ان کی ایک مدت سے خواہش تھی کہ وہ فریضۂ حج ادا کریں اور روضۂ نبی کا دیدار کریں لیکن دیدار کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی چنانچہ انہوں نے ارمغانِ حجاز کی صورت میں تصوراتی طور پر اس خواہش کو پورا کیا۔اس سلسلے میں عبدالسلام ندوی رقمطراز ہیں:

> ''ایک پاک جذبہ اس کی تصنیف کا محرک ہوا،یعنی انہوں نے ۱۹۳۷ء میں فریضۂ حج کے ادا کرنے کی جو تیاریاں شروع کیں،ان کے سلسلے میں وفور شوق نے ان کے دل کے دردبھرے ساز کو چھیڑا،اور ان کی زبان جوش ومستی میں ترنم ریز ہونے لگی اور طبیعت میں آمد کا وہ زور پیدا ہوا کہ رباعیوں پر رباعیاں موزوں ہوتی چلی گئیں،یہانتک کہ چند ہی دنوں میں کتاب مکمل ہوگئی۔''۳۵

یہ کلام اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مشتمل ہے۔ارمغانِ حجاز کا پہلا حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہ پورا حصہ رباعیات پر مشتمل ہے۔حالانکہ ان رباعیات کی زبان آسان اور سلیس ہے لیکن ان میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ دقیق ہیں۔ان رباعیات کو سمجھنے کے لئے اقبال کے بنیادی تصورات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔اس لیے ان کی شاعری کا خلاصہ اصل میں عشقِ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ ہے۔آپؐ سے جو انہیں والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں ملتا ہے۔فکر کی گہرائی اور آپؐ سے شدید عشق و عقیدت ان رباعیات کی خصوصیات ہیں۔اقبالؔ نے ان رباعیوں کو مختلف عنوانات کے تحت قلمبند کئے ہیں ۔پہلا عنوان ''حضورِ حق'' اور دوسرا ''حضورِ رسالت'' ہے۔یہ دونوں حصے سفرِ حجاز سے متعلق ہیں۔تیسرا عنوان ''حضورِ ملت'' ہے جس میں مختلف عنوانات کے ذریعے اقبال نے خودی کی تربیت کی تلقین کی ہے۔اقبالؔ کے مطابق اللہ نے اسی قوم کو کامیابی و سرخروئی عطا کی ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھی:

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکاری ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

ارمغانِ حجاز کا چوتھا عنوان ''حضورِ عالمِ انسانی'' ہے جس میں اقبال نے تشکیلِ سیرت کی دعوت دی ہے۔اور آخر میں ''بہ یارانِ طریقت'' میں اقبالؔ نے اپنی تنہائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہتے ہیں کہ کوئی ان کے بلند مرتبہ افکار کو سمجھ نہ سکا:

چو رخت خویش بربستم ازین خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

الغرض یہ کلام ان کے مختلف افکار و خیالات و جذبات کا خلاصہ ہے جس میں انتہائی پختہ کاری ہے۔

ترجمۂ ارمغانِ حجاز کا جائزہ:

ارمغانِ حجاز کا اردو منظوم ترجمہ ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ترجمہ ایثاؔر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا دلکش عکس ہے۔انہوں نے ارمغانِ حجاز کا ترجمہ نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ایثاؔر کے تراجم کی یہ انفرادیت ہے کی وہ اصل مفہوم سے قریب رہنے کی نہ صرف کوشش کرتے ہیں بلکہ تراجم میں وہ یہ مخصوص خصوصیات بھی پیدا کرتے ہیں جو اصل کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔فارسی زبان وادب سے ناآشنائی کے اس دور میں اقباؔل کے پیغام کی عصری اہمیت اور زمان ومکان سے ماوراا اسلامی اقدار کی نشر واشاعت کے نقطہ نظر سے یہ منظوم اردو ترجمہ اقباؔل کے پیام روانی اور حسن ادا کے جملہ لوازمات کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے۔اس منظوم ترجمہ میں مثالی تراجم کی فہرست طویل ہے ان میں سے چند مثالیں پیش ہیں۔

اقباؔل:

چہ شوراست ایں کہ در آب وگل افتاد
زیک دل عشق را صد مشکل افتاد
قرارِ یک نفس برمن حرام است
بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد

ترجمہ:

یہ آب وگل میں ہنگامہ ہے کیسا؟
دل ایک اور عشق پرا فتاد صدہا
گھڑی بھر بھی سکوں حاصل نہیں ہے
الٰہی رحم! میں ہوں دل کا مارا

اس رباعی کا ترجمہ متن کے مفہوم کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔اس رباعی میں جو کیفیت اقبال کی ہے اسی کیفیت وحالت کا پورا پورا عکس ایثاؔر نے ترجمے میں دکھایا ہے۔ترجمہ نہ محض شگفتہ ہے بلکہ الفاظ کا

برمحل اور عمدہ انتخاب کیا ہے۔

اقبالؔ:

دلِ بے قیدِ من در پیچ وتاب است
نصیبِ من عتابے یا خطابیست
دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد
گناہِ گاہ گاہِ من صواب است

ترجمہ:

دلِ آزاد مشکل میں پڑا ہے
عطا، اس کے مقدر یا سزا ہے
دکھا سکتا نہیں شیطاں کا دل بھی
گنہ گا ہے جو کرلوں کیا برا ہے

درج بالا رباعی کا ترجمہ عمدہ ہے اور قریب المفہوم ہے۔ پہلے مصرعہ میں ''دلِ بے قید'' کے لئے انتہائی موزوں لفظ ''دلِ آزاد'' متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چوتھا مصرعہ کا ''گناہِ گاہ گاہِ من صواب است'' کا ترجمہ ''گنہ گا ہے جو کرلوں کیا برا ہے'' برمحل اور دیدنی وقابلِ ستائش ہے۔

اقبالؔ:

روم راہے کہ او را منزلے نیست
ازاں تخمے کہ ریزم حاصلے نیست
من از غمہا نمی ترسم ولیکن
مدہ آں غم کہ شایانِ دلے نیست

ترجمہ:

وہ راہی ہوں نہیں ہے جس کی منزل

جو بو یا ہے نہیں کچھ اس کا حاصل
مجھے غم سے نہیں ڈر کوئی لیکن
نہ دے وہ غم نہیں جو دل کے قابل

اس رباعی کا ترجمہ نہایت رواں اور فصیح ہے اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ایک ایک مصرعہ کے ترجمے سے ایثآر کی نہ صرف لغوی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ترجمہ میں ان کی قادرالکلامی جھلکتی نظر آتی ہے۔ چند اور مثالیں پیش ہیں۔

اقبآل:

زمن ہنگامۂ دہ ایں جہاں را
دگرگوں کن زمین وآسماں را
زخاک ما دگر آدم برانگیز
بکش ایں بندۂ سودوزیاں را

ترجمہ:

عطا کر مجھ سے ہنگامہ جہاں کو
بدل دے تو زمین وآسماں کو
بنا مٹی سے میری دیگر آدم
مٹا اس بندۂ سودوزیاں کو

اقبآل:

نخواہم ایں جہان وآں جہاں را
مرا ایں بس کہ دانم رمز جاں را
سجودے دہ کہ از سوز وسرورش
بوجد آرم زمیں وآسماں را

ترجمہ:

نہ مانگوں اس جہاں یا اس جہاں کو
بہت ہے، جان لو گر رمزِ جاں کو
سرور و سوز دے سجدوں کو میرے
کہ لاؤں وجد میں دونوں جہاں کو

مذکورہ رباعیوں کا ترجمہ لغوی ہونے کے باوجود اصل کی کیفیت اور اس کے مفہوم کی بھرپور نمائندگی کر رہا ہے۔ ان رباعیوں کے ترجمے میں کوئی لفظ اضافی نہیں ہے۔ دوسری رباعی کے چوتھے مصرعے میں ''زمین و آسماں'' کو بہت خوبصورتی سے ''دونوں جہاں'' سے تعبیر کیا ہے۔

اقبالؔ:

متاعِ من دلِ درد آشنائے است
نصیبِ من فغانِ نارسائے است
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوشتر
کہ ہم خاموش و ہم خونیں نوائے است

ترجمہ:

مرا سب کچھ دلِ درد آشنا ہے
مرا حاصل فغانِ نارسا ہے
گلِ لالہ مرے مرقد کو شایاں
خموشی میں بھی وہ خونیں نوا ہے

اقبالؔ:

دل از دستِ کسے بردن نداند

غم اندر سینہ پروردن نداند
دمِ خودرادمیدی اندرآں خاک
کہ غیراز خوردن ومردن نداند

ترجمہ:

سلیقہ دلربائی کا نہ جانے
غموں کی پرورش کرنا نہ جانے
خود اپنی روح اس کے تن میں پھونکی
جو کھا، پی کر مرے، جینا نہ جانے

ان تراجم میں اس قدر روانی اور موسیقیت موجود ہے کہ ان کے مطالعے سے یہ احساس مزید پختہ ہوجاتا ہے کہ ایثارؔ کو اردو اور فارسی زبان پر ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔الفاظ کے موزوں اور متن کے تناسب سے برمحل انتخاب پر جیسی قدرت ایثارؔ کو ہے وہ بہت کم ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔علاوہ ازیں شعری اصناف کے مزاج،مناسبتِ لفظی،علائم و رموز اور بحور سے بھی گہری واقفیت ہے۔ ہر ترجمہ میں انہوں نے جہاں مستعمل بحروں کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کیا وہیں اقبال کے کلام کے مفہوم کو بھی ترجمہ میں مقدم رکھا۔حضور ملت سے چند رباعیاں اوران کا ترجمہ پیش ہے۔

اقبالؔ:

مجو از من کلامِ عارفانہ
کہ من دارم سرشتِ عاشقانہ
سرشک لالہ گوں راندریں باغ
بیفشانم چو شبنم دانہ دانہ

ترجمہ:

سخن مجھ سے نہ چاہو عارفانہ

کہ پائی ہے طبیعت عاشقانہ
میں اشک لالہ گوں مانندِ شبنم
چھڑکتا ہوں چمن میں دانہ دانہ

اس رباعی میں اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے عارفانہ کلام کی توقع مت رکھ کیونکہ میری فطرت عاشقانہ ہے میں اس باغ میں لالہ کے آنسو دانہ دانہ کر کے بکھیر رہا ہوں۔ مذکورہ رباعی کا ترجمہ ایثارؔ نے دلکش کیا ہے جو پر مغز و پر تاثیر ہے۔اس میں اصل کا مفہوم جلوہ گر ہے البتہ مترجم نے ''سرشت'' کو ''طبیعت'' سے تعبیر کیا ہے۔ وہیں آخری مصرعے میں بکھیرنے کو چھڑکنا کہا ہے۔

اقبالؔ:

بہ منزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بندہ و راہِ مصطفیٰ رو

ترجمہ:

ہلال آسا سوئے منزل بڑھے چل
فضائے نیلگوں میں بڑھ تو ہر پل
مقام اپنا اگر پانا ہے تجھ کو
لگا لو حق سے ، راہِ مصطفیٰ چل

مذکورہ رباعی کا ترجمہ ایثارؔ کی شاعرانہ فنکاری کا عمدہ ثبوت ہے۔ ترجمہ نہایت جامع اور طبع زاد محسوس ہوتا ہے۔ چل اور پل کے ردیف سے مترجم نے شاعرانہ کمال دکھایا ہے۔ ترجمہ پر تاثیر اور مثالی ہے۔

اقبالؔ:

کشودم پردہ راازروئے تقدیر
مشونومید و راہ مصطفیٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم
زدیں بگریز مرگِ کافرے میر

ترجمہ:

اٹھائے پردے جوتقدیر پر تھے
نہ ہو مایوس راہِ مصطفیٰ لے
اگرشک ہے مری باتوں پہ تجھ کو
تو مرکافرسا دیں کوترک کردے

ترجمہ میں اصل کی عکاسی موجود ہے۔مجموعی طور پر اقبالؔ کے پیغام کومترجم نے نہایت خوش اسلوبی سے ترجمے میں سمویا ہے۔فکری بلندی، بصیرت اورقلم میں روانی ترجمے میں دلکشی کا باعث بنتے ہیں۔یہ تمام خصوصیت ایثارؔ میں موجود ہیں۔

اقبالؔ:

دگرگوں کشور ہندوستاں است
دگرگوں آں زمین وآسماں است
مجو از ما نما زِ پنج گانہ
غلاماں راصف آرائی گراں است

ترجمہ:

دگرگوں کشور ہندوستاں ہے
دگر حال زمین وآسماں ہے
نماز پنج گانہ کی طلب کیوں؟

غلاموں کوصف آرائی گراں ہے

اقبالؔ:

زمحکومی مسلماں خودفروش است

گرفتار طلسم چشم وگوش است

زمحکومی رگاں درتن چناں سست

کہ ماراشرع وآئیں بارِدوش است

ترجمہ:

غلامی میں مسلماں بک چکا ہے

وہ چشم و گوش کا مارا ہوا ہے

غلامی سے یہ کمزوری کا عالم

شریعت پر عمل مشکل بڑا ہے

مذکورہ بالا دونوں رباعیاں ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ان اشعار میں اقبال کا اسلوب بہت سادہ ہے، بھاری بھرکم الفاظ اور اصطلاحات سے پرہیز کیا گیا ہے۔اور اقبالؔ کا پیغام واضح ہے۔ایثارؔ نے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ اقبال کے پیغام کوترجمہ میں سمودیا ہے اسے ترجمہ نگاری کے بہترین نمونوں میں رکھا جا سکتا ہے۔اقبالؔ کے فارسی کلام کی ہیئت اگرچہ بہت سادہ ہے مگر اسے منظوم کرنا اور پھر سادگی کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام تو نہیں، لیکن یہ کام ایثارؔ نے کردکھایا ہے۔اقبال کے جذبوں کی جو تپش اور لہجے کے جو دھنک رنگ ہیں ،ایثارؔ نے اپنے ترجمے میں اسے سمیٹنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ان کے یہاں سادگی ،سلاست اور روانی اپنے شباب پر ہے۔''مسلماں خودفروش است'' کا ترجمہ کچھ اور بھی کیا جاسکتا تھا مگر ''مسلماں بک چکا ہے''میں جو معنویت اور جامعیت ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔اسی طرح ''گرفتار طلسم چشم وگوش است'' کا ترجمہ یا تعبیر کسی اور طریقے سے بھی کی جا سکتی ہے مگر''وہ چشم وگوش کا مارا ہوا ہے''میں جو خوبی ہے وہ کسی اور تعبیر میں نہیں مل سکتی تھی ۔ایسی فن کارانہ خوبیاں اسی کے قلم سے نکل سکتی ہیں جو فارسی زبان وادب کی

باریکیوں سے واقف ہو اور اقبال کے اندرون میں بھی جھانک آیا ہو۔

اقبالؔ:

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے
بگوش مردۂ پیغامِ جاں گوئے
دلے گویند ایں ناحق شناساں
کہ تاریخ وفاتِ ایں وآں گوئے

ترجمہ:

تو چاہے ذکر عمرِ جاوداں کا
میں دوں پیغام بے جانوں کو جاں کا
تقاضا ہے یہ نادانوں کا مجھ سے
لکھوں نوحہ وفات ایں وآں کا

اقبالؔ:

انا الحق جز مقام کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید ناروا نیست

ترجمہ:

انا الحق ، ہاں مقام کبریا ہے
سوا سولی کے اس کی کیا سزا ہے
جو بولے فرد ہے، تادیب لازم
کہے گر قوم ، یوں کہنا روا ہے

اقبالؔ:

بہ آں ملت انا الحق سازگاراست
کہ از خونش نمِ ہر شاخسار است
نہاں اندر جلالِ او جمالے
کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است

ترجمہ:

''انا الحق'' ہے اسی ملت کو زیبا
نمی ہر باغ کو دے خون جس کا
ہے جس کے قہر میں پوشیدہ رحمت
ہوں آثار سمٰوات اس میں پیدا

''انا الحق''عنوان کے تحت اقبال نے کئی رباعیاں قلمبند کی ہیں۔''انا الحق''مشہور صوفی حسین ابن منصور حلاج کا قول ہے جس کے معنی ہیں میں حق ہوں یا میں خدا ہوں۔منصور حلاج نے جذب کے عالم میں انا الحق کا نعرہ بلند کیا تھا اور جس کی پاداش میں انہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ یہاں صرف دو رباعیاں ہی بطور نمونہ پیش کی جارہی ہیں۔ پہلے مصرعے میں ''جز'' کا ترجمہ ایثارؔ نے ''ہاں'' سے کیا ہے ۔ پورا مصرع ''انا الحق ،ہاں مقام کبریا ہے'' ہے ۔اگر یہاں 'ہاں' کی بجائے 'ہی' کہا جاتا تو شاید فارسی مصرع کی بھرپور ترجمانی ہوتی۔یعنی یہاں یوں کہا جاتا ''انا الحق ہی مقام کبریا ہے''۔'ہی' تاکید کے لیے آتا ہے اور بعض صورتوں میں 'ہاں' بھی تاکید کے طور پر استعمال ہوتا ہے مگر جو بلاغت 'ہی' میں ہے وہ 'ہاں' میں نہیں ہے۔اس مصرع میں بھی 'ہاں' تاکیدی ہی ہے مگر اس میں وہ زور اور شدت پیدا نہیں ہو رہی جو اقبال کے لفظ 'جز' کا مقصود ہے۔بقیہ دوسرے مصرعوں کے ترجمے بہترین ہیں اور اقبال کے فہم سے قریب بھی ۔ دوسری رباعی میں 'سازگار' کا ترجمہ 'زیبا' نہایت خوشگوار ہے۔ یہاں 'زیبا' سے بڑھ کر کوئی اچھا لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔اسی

رباعی کے تیسرے مصرع میں جلال و جمال کو قہر و رحمت سے تعبیر کرنا بھی بہت خوب ہے۔

اقبالؔ:

بہ ملک خویش عثمانی امیر است
دل اش آگاہ، چشم او بصیر است
نہ پنداری کہ رست از بندِ افرنگ
ہنوز اندر طلسم او اسیر است

ترجمہ:

ہے ترک اپنے وطن میں آپ آقا
دل اس کا روشن، آنکھیں اس کی بینا
مگر اب بھی ہے محصورِ فرنگی
ابھی تک اس کے پھندے سے نہ چھوٹا

اقبالؔ:

بہ ترکاں آرزوئے تازہ داند
بنائے کارشاں دیگر نہادند
ولیکن کو مسلمانے کہ بیند
نقاب از روئے تقدیرے کشادند

ترجمہ:

امید تازہ ترکوں کو عطا ہے
بِنا ان کے عمل کی اب جدا ہے
کہاں وہ صاحب ایماں جو دیکھے
رخِ تقدیر سے پردہ اٹھا ہے

ان دو رباعیوں کا انتخاب بالقصد اس لیے کیا گیا ہے کہ اس وقت ترکی کے جو احوال ہمارے سامنے ہیں اس نے پوری دنیا کے فرعونوں کے دل دہلا کر رکھ دیے ہیں۔ دہائیوں تک فرنگیوں کے مکر وفریب کے جال میں پھنس کر اپنی زندگی گزارنے والے ترک اب دوبارہ اپنی نشاۃ ثانیہ کی طرف بڑھ چکے ہیں ۔ترکی کا مرد ناداں تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو چکا ہے اور اس وقت ترکی کی باگ ڈور مردِ دانا رجب طیب اردگان کے ہاتھوں میں ہے ۔اقبالؔ نے یہ اشعار اس وقت کہے تھے جب ترک فرنگیوں کے زیرنگیں رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے اور ترکی کے گلے میں زبردستی فرنگیوں نے اپنی غلامی کا پھندہ ڈال رکھا تھا۔اس وقت اقبال نے کہا تھا''بہ ملکِ خویش عثمانی امیر است''،یعنی ترک ہی اپنے ملک کے امیر وسربراہ ہیں۔اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں کہ ترکوں کو ان کا وطن واپس مل چکا ہے اور اب وہاں اسلام کا علم لہرا رہا ہے ۔ایثارؔ نے ان مصرعوں کے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے ۔ پہلا اور دوسرا مصرع اور پھر اس کا ترجمہ بالکل سادہ ،سلیس اور روانی سے بھرپور ہے مگر تیسرے مصرع میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی ہے اور یہ بہت خوب ہے۔تیسرے اور چوتھے شعر میں بھی ترجمے کا حسن اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور قاری کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔

اقبالؔ:

دگر آئین تسلیم و رضا گیر
طریقِ صدق واخلاص ووفا گیر
مگو شعرم چنیں است چنان نیست
جنوں زیرکے از من فرا گیر

ترجمہ:

تو پھر آئینِ تسلیم و رضا سیکھ
تو راہِ صدق واخلاص ووفا سیکھ
نہ ہونا معترض میرے سخن پر

جنوں چالاک ہے میرا تو آ سیکھ

یہاں ایثؔار نے گیر یعنی اختیار کرنے کو سیکھ سے تعبیر کیا ہے جو مناسب ہے۔ اسی طرح چنیں و چناں کے لئے معترض استعمال کیا ہے۔ اس رباعی میں اقبال کے پیام کی ترسیل میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے ہیں۔
اقبؔال:

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت
چہ بے نم چشم آں کز ِگل بزاید
چو جانِ او بگیرم شرمسارم
ولے او را ز مردن عار ناید

ترجمہ:

سنا ہے یوں کہا حق سے اجل نے
ہے خاکی شرم سے کس درجہ عاری
میں شرمندہ ہوں اس کی جان لیتے
نہیں مرنے سے اس کو شرم ساری

اس رباعی کا عنوان ''موت'' ہے۔ دوسرے مصرع میں 'بے نم چشم' کا ترجمہ 'شرم سے عاری' بڑا ہی بلیغ اور بامعنی ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی آنکھ بے نم ہو اور ندامت کا ایک قطرہ بھی اس سے نہ ٹپکے تو اسے بے شرم یا شرم سے عاری ہی کہا جائے گا۔ یہاں ایثؔار کی فن کارانہ صلاحیت کام آئی اور اس صلاحیت نے ان سے وہ کام لیا جو شاید دوسروں کے بس کا روگ نہ تھا۔ ہے تو یہ ترجمہ مگر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اقبؔال کے فارسی اشعار اگر ایک طرف رکھ دیے جائیں تو اسے مستقل اشعار کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے، علی الخصوص پہلے شعر کو، مگر یہاں ایک بات کہنے کی یہ بھی ہے کہ جو سلاست اور برجستگی پہلے شعر کے ترجمے میں ہے وہ دوسرے تک آتے آتے برقرار نہ رہ سکی، بالخصوص تیسرے مصرع کو پڑھتے ہوئے بآسانی یہ اندازہ لگ جاتا ہے کہ یہ کسی زبان

کا اردو قالب ہے ۔اس کی وجہ بھی اقبال کے شعر کی ارفعیت ہے ۔ظاہر ہے کہ مترجم بھی اسی کا پابند ہے اور منظوم ترجمہ کرتے وقت یہ پابندیاں بیک وقت اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوجاتی ہیں جنہیں پار کرتے وقت مترجم بڑی ذہنی کشمکش اور الجھاؤ سے گزرتا ہے لہذا ایثارؔ کو بھی اس سے گزرنا پڑا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ایثارؔ کے ان منظوم تراجم کے جائزے سے اس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ انہوں نے متنِ اقبال سے وفاداری کی شرط کو اول سے آخر تک نبھایا ہے ۔ یہ وفاداری خوبصورتی کے ساتھ متشکل ہوکر اقبال کے فارسی اشعار کو اقبال ہی کے انداز میں اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے تخلیق کا سا اثر پیدا کرتی ہے ۔اس منظوم ترجمے میں جا بجا ایسے تراجم ملتے ہیں جو مثالی ہیں جن میں اصل کا عکس پوری طرح جلوہ گر ہے اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں ۔

اقبالؔ:

بہ آں قوم از تو می خواہم کشادے
فقیہش بے یقینے کم سوادے
بسے نا دیدنی را دیدہ ام من
مرا سے کاش کے مادر نزادے

ترجمہ:

کشاد اس قوم کی ہے تجھ سے چاہی
فقیہ جس کے تیقن سے ہیں عاری
بہت نادیدنی دیکھے ہیں میں نے
جنم اے کاش ماں مجھ کو نہ دیتی !

اقبالؔ:

غمِ پنہاں کہ بے گفتن عیاں است
چو آید بر زباں یک داستاں است

رہِ پر پیچ و راہی خستہ و زار
چراغش مردہ وشب درمیاں است

ترجمہ:

بنا بولے غمِ پنہاں عیاں ہے
جب آئے لب پہ گویا داستاں ہے
کٹھن ہے رستہ راہی خستہ وزار
دیا خاموش اور شب درمیاں ہے

اقبالؔ:

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من وتو کشتۂ شانِ جمالیم
دوحرفے برمراد دل بگوئیم
بہ پائے خواجہ چشماں رابمالیم

ترجمہ:

کریں مل کر فغاں ہمدم ادھر آ
ہمیں تو یار کے جلووں نے مارا
دہ باتیں ہم مرادِ دل کی کرلیں
بہم آنکھوں سے چومیں پائے آقاؐ

ان منظوم تراجم کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تراجم اعلیٰ معیار پر پورا اترتے ہیں۔اور بعض تراجم تو ایسے ہیں جن پر ترجمہ ہونے کا شبہ ہی نہیں گزرتا۔ان تراجم کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ایثارؔ نے اقبالؔ کے خیالات واحساسات و پیغام کو پیش کرتے وقت ایسا انداز اپنایا ہے کہ ترجمے اور تخلیق کی

دوئی ختم ہوگئی ہے۔ یہ تراجم سادہ وسلیس، رواں اور جامع ہیں اور ان میں ایک ایسے باکمال مترجم کی شخصیت جھلکتی ہے جسے اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ ایثار کے یہ تراجم اردو داں طبقے کے لئے کسی نعمت غیرمترقبہ سے کم نہیں ہیں۔

ب۔رباعیاتِ عمر خیام کے منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ

ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیامی النیشاپوری ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔وہ ۴۰۸ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ۵۱۷ھ میں انتقال کیا۔ان کا اصل نام عمر لقب غیاث الدین کنیت ابوالفتح اور تخلص خیام تھا۔ان کے والد احمد ابراہیم نیشاپور کے مشہور تاجر اور جمیعتہ امراء کے معتمد تھے۔عمر خیام کی ابتدائی تعلیم قرآن شریف سے ہوئی۔اس کے بعد فقہ، حدیث، تفسیر ادب اور علم کلام کی کتابیں ختم کیں۔خیام بچپن ہی سے نہایت ذہین ،سنجیدہ و عاقل جیسی خصوصیات کے مالک تھے۔حافظہ اس قدر کے کسی بات کو سنتے ہی فوراً حفظ کر لیتے۔مضبوط قوتِ ارادی ان کے کردار کا وصف خاص تھا۔کامل غور و فکر کے بعد جو فیصلہ کر لیتے اس پر آخر تک قائم رہتے۔ عمر خیاؔم ریاضیات اور فلکیات ،لغت ،فقہ اور تاریخ کے زبردست عالم تھے۔علم فلکیات کے ماہر ہونے کے باعث انہیں بغداد میں ادارۂ فلکیات کا چیرمین مقرر کیا گیا تھا۔

عمر خیاؔم کی شہرت کا سب سے اہم سبب ان کی فارسی رباعیاں ہیں۔ان رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً سبھی معروف زبان میں ہو چکا ہے۔خیام سے پہلے کسی نے رباعی سے وہ کام نہیں لیا جو انہوں نے لیا۔ ان رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی ، ریا، غیبت، جیسی عیوب کی مذمت، صبر و قناعت، تسلیم و رضا، خوش دلی و خوش فکری کی تعلیم ،شراب و سرمستی کا بیان فلسفہ، تصوف اور اخلاق جیسے مضامین ملتے ہیں۔دراصل عمر خیام کی یہ رباعیات ہی ہیں جن کے ترجمے کے باعث ایثاؔر دیگر تراجم کی طرف متوجہ ہوئے۔اس واقعہ کا ذکر وہ اکثر کرتے ہیں واقعہ کچھ یوں ہے کہ رمضان کا مہینہ تھا اور ایثاؔر دن بھر کی مصروفیت کے خیال سے آرام کرنا چاہتے تھے کہ ان کی نظر مولانا آسی کی مرتب کردہ نسخۂ رباعیات خیام پر پڑی۔انھوں نے یوں ہی پڑھنے کے لئے کتاب کھولی تو درج ذیل رباعی ان کے سامنے تھی۔

خیاؔم:

روزے کہ شود اذ السماء انشقت
واں دم کہ بود اذ النجوم کدرت
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات
گویم صنما ! بای ذنبٍ قتلت

اس رباعی کو پڑھتے ہوئے ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔اس شعری اسلوب اور قرآنی سوچ نے ان کی سوچ کا رخ موڑ دیا۔اسی کیفیت میں انھوں نے اس رباعی کا منظوم اردو ترجمہ کر دیا۔ترجمہ ملاحظہ ہو:

ترجمہ:

جس روز یہ آسمان شق ہوتا ہے
منہ تاروں کا جس وقت یہ فق ہوتا ہے
پوچھوں گا گریباں پکڑ کر اے صنم !
معصوم کا خوں بھی کہیں حق ہوتا ہے

انہیں اپنا ترجمہ اچھا لگا انہوں نے عمر خیام کی مزید رباعیات کا ترجمہ کیا اور سب سے پہلے سید حسین کو دکھایا۔سید حسین ایثاؔر کے ماموں کے دوست تھے۔محکمۂ آب رسانی میں ملازم تھے۔انہوں نے ایثاؔر کی کوشش کو سراہا۔ ایثاؔر کو اس واقعے کے ذریعے ترجمے کے لئے تحریک ملی۔ اور انہوں نے عمر خیاؔم کی ۲۷۷ رباعیات کا اردو میں منظوم ترجمہ کر دیا۔ذیل میں ان ترجموں کا تنقیدی جائزہ پیش ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ عمر خیاؔم کی بہت سی رباعیاں متنازع ہیں مگر وہ اپنے فن کی انتہا پر فائز ہیں۔خیاؔم کا کمال ہے کہ انہوں نے فحش گوئی کو بھی فن کی تابنا کی عطا کی۔مثلاً شراب سے متعلق ایک رباعی میں کہتے ہیں :

خیاؔم:

مے خور کہ مدام راحت روح تو است
آسائش جان ودل مجروح تو اوست
طوفانِ غم ار درآید از پیش و پست
در بادہ گریز کشتی نوح تو اوست

اس رباعی میں عمر خیاؔم کہتے ہیں کہ شراب پی کیونکہ یہ فرحت اور خوشی کی روح ہے، نفس اور اندرونی بیماریوں کو ختم کرنے والی ہے اور جب بھی تجھے غم کا طوفان گھیر لے تو اسی شراب سے نجات حاصل کر کیونکہ یہ سفینۂ نوح ہے۔ عمر خیاؔم کے اس خیال کو ایثاؔر نے اپنے ترجمے میں یوں پیش کیا ہے:

ترجمہ:

پی مے کہ سدا ہے راحت روح وہی
یعنی ہے دوائے قلب مجروح وہی
طوفان غم و الم جو گھیرے تجھکو
اس دم بھی ہے جیسے کشتیٔ نوح وہی

ایثاؔر نے عمر خیاؔم کے خیال کو ترجمے میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ اور رواں ہے۔ انہوں نے شاعر کے خیال کو اصل صورت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک تو رباعی یوں بھی بہت دشوار اور صبر آزما صنف ہے ذرا سی بے احتیاطی سے شاعر رباعی کی بحر سے خارج ہوسکتا ہے۔ اور پھر رباعی کا منظوم ترجمہ اور بھی احتیاط طلب فعل ہے لیکن ایثاؔر نے اس مشکل فعل کو بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ بلاشبہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ترجمہ، ترجمہ ہوتا ہے اصل کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا لیکن مترجم اپنی فنکاری سے اسے اصل صورت میں شعر و شاعری کی فنی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ اور یہ صلاحیت ایثاؔر میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ چند اور مثالیں

ملاحظہ ہوں۔

خیامؔ:

اے آنکہ گزیدۂ جہانی تو مرا
خوشتر ز دل و دیدۂ و جانی تو مرا
از جاں صنما عزیز تر چیزے نیست
صد بار عزیز تر از انی تو مرا

ترجمہ:

اے وہ کہ عزیز ہے جہاں سے تو مجھے
پیارا ہے دل اور چشم و جاں سے تو مجھے
جاں سے نہیں کوئی چیز پیاری صنما
سو بار عزیز تر ہے جاں سے تو مجھے

ان اشعار میں براہِ راست خطاب اپنے محبوب سے ہے۔ یہ محبوب عشقِ حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور عشقِ مجازی بھی۔لیکن ''پیاری صنما'' سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا محبوب صنفِ نازک ہے۔ ایثارؔ نے نہایت شگفتگی سے خیام کی رباعی کو ترجمے کی شکل میں ڈھالا ہے۔ چوتھا مصرعہ ''صد بار عزیز تر از انی تو مرا'' کا ترجمہ ''سو بار عزیز تر ہے جاں سے تو مجھے'' نہایت شگفتہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی خوبیوں کا مرقع ہے۔

خیامؔ:

گر گل نبود نصیب ما خار بس است
در نور نمی رسد بما نار بس است
گر سبحہ و سجادہ و شیخی نہ بود
ناقوس کلیسا و زنار بس است

ترجمہ:

حاصل نہیں گر پھول، ہمیں خار ہی بس
جب نور مقدر میں نہیں، نار ہی بس
گر سبحہ نہیں شیخی و سجادہ نہیں
گرجا ہی، شوالہ ہی، یہ زنار ہی بس

ان اشعار میں خیاؔم میں زندگی کی حقیقت نظم کردی ہے اور قاری کے لئے ایک عظیم پیغام بھی اس میں پوشیدہ ہے۔ عمر خیاؔم کہتے ہیں کہ اگر مقدر میں پھول نہیں تو کیا ہوا ہمارے لیے کانٹے ہی کافی ہیں اسی طرح اگر نور نہ ملے تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہم نار ہی سے کام چلا لیں گے۔ یوں ہی اگر سجادہ، مساجد اور تسبیح نہیں ہے تو کیا غم ہے ہم تو ناقوس، کلیسا اور مشرکین کی زنار کو ہی اس کا ہم پلہ سمجھ لیں گے۔ ناکامیوں اور نامرادیوں پر رونے والوں کے لیے یہ پیغام ایک صبح جاں فزا ہے اور نوید حیات بھی۔ ایثاؔر نے بھی خیاؔم کے اس پیغام کو نہایت خوبصورتی سے ترجمے میں سمویا ہے۔ مذکورہ بالا رباعی کا ترجمہ اصل فارسی شعر کا مکمل مفہوم اور حسن رکھتے ہوئے لفظی ترجمہ ہے۔ ایثاؔر اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ فارسی کی بعض تراکیب اور الفاظ اردو میں بھی مستعمل ہیں اور وہی معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان کا اسی صورت میں یا معمولی سی تبدیلی سے منظوم ترجمے میں استعمال کیا ہے۔

خیاؔم:

ما کافر عشقیم و مسلماں دگر است
ما مورِ ضعیفیم و سلیماں دگر است
از مارخ زرد و جگر پارہ طلب
بازارچۂ قسب فروشاں دگر است

ترجمہ:

ہم عشق کے کافر ہیں مسلمان نہیں

ہم مور ہیں نادار، سلیمان نہیں
رخ زرد جگر پارہ طلب کر ہم سے
زینت کا یہاں کوئی بھی سامان نہیں

اس رباعی کا ترجمہ قریب المفہوم ہے البتہ دوسرے مصرعے میں ''ما مورِ ضعیفیم'' کے ترجمے ''ہم مور ہیں نادار'' تھوڑا اتکلف محسوس ہو رہا ہے۔ تیسرا مصرعہ ''از مارخ زرد و جگر پارہ طلب'' کا ترجمہ ''رخ زرد جگر پارہ طلب کر ہم سے'' خوب کیا ہے۔ وہیں آخری مصرعہ ''بازارچۂ قسب فروشاں دگراست'' کا ترجمہ ''زینت کا یہاں کوئی بھی سامان نہیں'' کیا ہے۔ جس میں دگراست'' کو انہوں نے ''نہیں'' سے تعبیر کیا ہے جو ضرورتِ شعری کی بنا پر بجا ہے۔

خیاؔم:

آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست
آں کس کہ بجملگی ترا تکیہ بدوست
چوں چشم خرد باز کنی دشمنت اوست

ترجمہ:

دنیا سے لگاؤ کم اگر ہو تو بھلا
اور اہل جہاں سے دور رہنا اچھا
وہ جسکی رفاقت پہ بھروسہ ہے تمام
ہوش آئے تو پائے کہ وہ دشمن ہے ترا

مذکورہ بالا رباعی گویا ہر بشر کے لئے ایک نصیحت ہے۔ اور ترجمہ ایثاؔر کی خلاقانہ طبیعت اور ترجمے میں فنکارانہ دسترس کا واضح ثبوت ہے۔ ''با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست'' کا ترجمہ ''اور اہل جہاں سے دور رہنا اچھا'' نہایت خوب کیا ہے۔ اسی طرح چوتھے مصرعے ''چوں چشم خرد باز'' کو ''ہوش آئے تو پائے'' سے تعبیر کرنا

بھی خوب ہے۔ یہ ترجمہ اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ترجمے میں بھرپور روانی ہے اور کوئی بھاری بھرکم الفاظ بھی مستعمل نہیں جس سے قاری کا ذہن بوجھل ہو جائے۔

خیاؔم:

چندیں غمِ مال و حسرتِ دنیا چیست
ہرگز دیدی کسے کہ جاوید بزیست
ایں یک نفسے کہ در تنت عاریت ہست
با عاریتے عاریتے باید زیست

ترجمہ:

یوں مال کا غم، حسرتِ دنیا کیا ہے
ہے کوئی بھی ایسا جو سدا جیتا ہے
سینہ میں ہے اک سانس یہ آتی جاتی
دم لینے کو کچھ دیر یہاں رہنا ہے

یہ رباعی بھی نصیحت کے زمرے میں آتی ہے۔ عمر خیاؔم یہاں واعظ و ناصح کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں اور وہیں ایثاؔر ان کے بہترین پیغام رساں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ یوں ایثاؔر نے ترجمے میں اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار نہیں کی اور نہ ہی بخل کو در آنے دیا۔ ''ہرگز دیدی کسے کہ جاوید بزیست'' کا ترجمہ ''ہے کوئی بھی ایسا جو سدا جیتا ہے'' بہت خوب کیا ہے۔ اسی طرح تیسرے مصرعے ''ایں یک نفسے کہ در تنت عاریت ہست'' کا ترجمہ ''سینہ میں ہے اک سانس یہ آتی جاتی'' کسی بھی باذوق قاری کے ذہن کو شگفتہ محسوس ہوگا۔ اس مصرعے میں ایک ایک لفظ کے ترجمے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عاریت کا ترجمہ ''آتی جاتی'' کیا ہی خوب، بامعنی، بامحاورہ اور سلیس و رواں ہے۔ غور کریں تو عاریت اور آتی جاتی میں دور دور تک کوئی رشتہ نہیں مگر ایثاؔر نے اپنی مہارت سے ان دو اجنبی الفاظ کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کر دیا۔ یہی ایثاؔر کے فن کا کمال ہے۔

خیاؔم:

بر روئے تو زلف را اقامت ہوس ست

سر فتنۂ اردم را قیامت ہوس ست

از ابروے تو محراب نشیں شد چشمت

آں کافر مست را امامت ہوس ست

ترجمہ:

زلفوں کو ترے رخ پہ اقامت کی ہوس

فتنے کو تماشائے قیامت کی ہوس

محراب نشیں ہے تہہ ابروتری آنکھ

ہے کافرِ مست کو، امامت کی ہوس

اس رباعی میں استعاراتی نظام اپنے پورے شباب پر ہے۔کمال کی بات یہ ہے کہ عمر خیاؔم نے استعارے کے جس پہلو سے اپنا مافی الضمیر نظم بند کیا ہے بالکل اسی طرح ایثاؔر نے بھی عمر خیام کے تصور کو ترجمہ میں قید کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔شاعر نے جہاں اپنے محبوب کے رخ زیبا، زلفوں، ابرو، آنکھ کو جو استعاراتی زبان دی ہے وہیں ترجمے میں محسوس ہوتا ہے ایثاؔر کے اندر عمر خیاؔم کی روح حلول کرگئی ہے۔جذبے کی تپش، لہجے کی مہک، اور طرزِ ادا دونوں میں یکساں طور پر نظر آتی ہے۔

خیاؔم:

ساقی کہ درخت ز جام جمشید بہ است

مردن بر ہمت ز عمر جاوید بہ است

خاکِ قدمت کہ روزِ من روشن از دست

ہر ذرہ ز صد ہزار خورشید بہ است

ترجمہ:

چہرہ ترا ساقیا ہے جام جمشید
مرنا تری راہ میں ہے عمرِ جاوید
روشن مرا دن ہے خاکِ پا سے تیری
اک ذرہ ہے اس کا جوں ہزاروں خورشید

اس رباعی میں شاعر نے اپنے محبوب کی شان دلربائی بیان کی ہے اور اس کے چہرے کو جام جمشید سے تشبیہ دی ہے۔ اور اس کی یاد میں مرنے کو دائمی عمر قرار دیا ہے۔ یہاں بھی ایثاؔر ترجمے میں عمر خیام کے خیالات کی ادائیگی اور ترسیل میں کامیاب ہوئے ہیں۔ فارسی سے نا آشنا کوئی بھی باذوق قاری اس ترجمے سے عمر خیام کے جذبے اور کیفیات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ''خاکِ قدمت کہ روزِ من روشن از دست'' کا ترجمہ ''روشن مرا دن ہے خاکِ پا سے تیری'' کمال ہے۔ علاوہ ازیں ترجمے میں ایثاؔر نے اصل تراکیب جیسے ''جام جمشید، عمر جاوید، روشن، خورشید وغیرہ کو جوں کا توں استعمال کر کے ترجمے کو اصل سے قریب تر کر دیا ہے۔

خیاؔم:

در خواب بدم مرا خردمندے گفت
کز خواب کسے را گل شادی نشگفت
کارے چہ کنی کہ با اجل باشد جفت
بر خیز کہ زیر خاک می باید خفت

ترجمہ:

تھا نیند میں یہ کہہ کے جگایا دانا!
سونا ہے یہ بے سود نہ دھوکا کھانا
غفلت نہ کر اٹھ، دیکھ اجل سر پر ہے
جائیگا تہہ خاک تو پھر سو جانا

اس رباعی میں بہت اہم پیغام پوشیدہ ہے ان لوگوں کے لئے جو غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ جو موت اور آخرت سے بے پرواہ ہو کر دنیاوی لذتوں میں سرشار ہیں۔ عمر خیاؔم کے اس پیغام کو ایثاؔر نے نہایت کامیابی سے اپنے ترجمے میں پیش کیا ہے۔ ترجمے میں تھوڑا تکلف ضرور ہے لیکن شاعری میں الفاظ کی اہمیت صرف معنوی ہی نہیں بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کسی ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، شعر کا ترجمہ ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کہ وہ نقشِ اول کو اپنے احساسات میں سے گزارے۔ اس مرحلے پر مترجم کو قوتِ متخیلہ کے ساتھ ساتھ فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ ایثاؔر نے مذکورہ استعداد کا عمدہ ثبوت فراہم کیا ہے۔

خیاؔم:

این کہنہ رباط را کہ عالم نام است
آرام گہ ابلقِ صبح و شام است
بزمی است کہ واماندہ جمشید است
قصریست کہ تکیہ گاہِ صد بہرام است

ترجمہ:

دنیا جسے کہتے ہیں مسافر خانہ
ہیں شام و سحر اسکے لئے پیانہ
اس بزم میں جم آتے رہے جاتے رہے
یہ سینکڑوں بہرام کا اک کاشانہ

اس رباعی میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر نہایت حسین پیرائے میں کیا گیا ہے۔ رباعی کے پہلے مصرع ''این کہنہ رباط را کہ عالم نام است'' جیسی مشکل تعبیر کو اردو میں اتنی آسان اور سلیس زبان میں پرو دینا ایثاؔر ہی کا کمال ہے اس مصرعے کا ترجمہ ''دنیا جسے کہتے ہیں مسافر خانہ'' کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔

البتہ تیسرے مصرعے ''بزمی است کہ وامانده جمشید است'' کا ترجمہ ''اس بزم میں جم آتے رہے جاتے رہے''میں وہ روانی اور بے ساختگی مفقود ہے جو باقی مصرعوں کے ترجموں میں نظر آتی ہے لیکن اسے منظوم ترجمے کی مشکلات سمجھ کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

خیّام:

آں بت کے دلم زہجرِ اوزارشدہ است
او جائے دگر بغم گرفتارشدہ است
من درطلبِ علاج خود چوں کوشم
چوں آنکہ طبیب ماست بیمارشدہ است

ترجمہ:

دل جسکی محبت میں مرا خوار ہوا
وہ اور کی الفت میں گرفتار ہوا
جس طرح ہوں خودعلاج میں سرگرداں
ویسا ہی مرا طبیب بیمار ہوا

عمر خیّام کے پیغام کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایثّار نے کوشش کی ہے کہ اصل متن اور الفاظ وتراکیب کے قریب ترین رہتے ہوئے ترجمہ کیا جائے ۔ابتداء کے تینوں مصرعوں کا ترجمہ خوب کیا ہے، چوتھے مصرعے ''چوں آنکہ طبیب ماست بیمارشدہ است'' کا ترجمہ ''ویسا ہی مرا طبیب بیمار ہوا'' کر کے کی عمر خیّام کے خیال کی ترسیل میں کامیاب ہوئے ہیں۔

خیّام:

ساقی مہ رخسارِتو جان ہمہ است
دلدارمن ست ودلستان ہمہ است
خورشید صفت نہ مہر درآب خوش است

تنہا نہ از آنِ من کہ ز آن ہمہ است

ترجمہ:

یہ چاند سا چہرہ ترا اے جان جہاں
دلدار مرا تو سبھی تجھ پر قرباں
سورج کی طرح فیض ہے تیرا سب پر
مجھ پر ہی نہیں سب پہ ہے تیرا احساں

یہ ترجمہ ترجمانی کے ضمن میں آتا ہے۔ پہلے مصرعے میں لفظ ساقی کو نظر انداز کیا ہے لیکن مفہوم واضح ہے۔ مترجم نے ترجمے میں متن کے مفہوم اور روح کو برقرار رکھا ہے۔ یہ ترجمہ سلیس، رواں اور جامع ہے غرض پورے ترجمے میں مترجم کی سلیقہ مندی، حسنِ بیان، اور اظہارِ مطالب پر ان کی قدرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ایثآر نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کا ترجمہ اصل کا عکس، مثالی اور دلکش ہو۔ ترجمے کا انحصار زبان و بیان پر قدرت حاصل ہونے میں مضمر ہے۔ ایک ایسا ترجمہ جو شاعر کے فکر و فن کی صحیح عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ لفظی و معنوی خوبیوں کا ایک اعلیٰ مرقع بھی ہو اور قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان بھی رکھتا ہو معیاری ترجمہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ایثآر کے تراجم کا تعلق ہے ان سے بھی کئی جگہوں پر غلطیاں سرزد ہوئی ہیں لیکن ان سے قطع نظر مجموعی طور پر ان کے تراجم اعلیٰ ہیں۔ تاہم ایثآر نے عمر خیآم کی شاعری کے ایک پرستار و مداح کی حیثیت سے ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے اور ان کے افکار کو قارئین تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ترجمے ایثآر کی پرگوئی اور شعری استعداد پر دال ہیں۔

ج۔رباعیاتِ سعدی شیرازی کے منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ

شیخ سعدی ایران کی مشہور ومعروف شخصیات میں سے ایک ہیں۔ان کا اصل نام مصلح الدین بن عبداللہ شیرازی تھا۔ان کی سال ولادت محقق نہیں ہے بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کی عمر ۱۰۲ لکھی ہے۔الطاف حسین کی تحقیق کی رو سے ان کی عمر ۱۲۰ برس ہوتی ہے جبکہ رضازادہ شفق کے مطابق سن ولادت ۶۰۶ ھ ہے اس اعتبار سے ان کی عمر ۸۶ سال ہونی چاہیے۔بہرحال انہیں قدرت کی طرف سے لمبی عمر عطا ہوئی تھی۔ان کی ابتدائی تعلیم شیراز میں ہوئی بہتر تعلیم کے لئے آبائی شہر کو خیر باد کیا اور وطن میں بدامنی پھیلی اور جنگوں کا لا متناہی سلسلہ شروع ہوا تو وہ بغداد روانہ ہوئے۔یہاں انہوں نے مشہور مدرسہ نظامیہ اور علمی مجلسوں سے کسبِ فیض کیا۔مدرسہ نظامیہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد متعدد ملکوں کی سیاحت کی۔سیر و سیاحت کے سلسلے میں کئی مما لک جیسے حجاز،شام،لبنان،مصر،فلسطین روم وکا سفر کیا اعلی درجوں کے فنون لطیفہ کے نمونوں سے محظوظ ہوئے اور وہاں کے علماء اور فن کاروں سے ملاقاتیں کی۔حج کی سعادت نصیب ہوئی۔انبیاء کے مزارات پر حاضری دی۔بزرگانِ دین سے ملاقات کیں۔مختلف شہر اور مختلف مذاہب،فرقوں سے واقف ہوئے اور مختلف علوم سے فیضیاب ہوئے۔نتیجتاً قلب ونظر میں وسعت پیدا ہوئی۔سعدی کا یہ سفر تقریباً بیس برس پر محیط ہے۔اور آخر طویل مسافرت کے بعد اپنے سرپرست اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی کے عہد حکومت میں شیراز لوٹے۔اس وقت شیراز کے حالات بدل چکے تھے یہاں حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔اور ہر طرف امن وامان قائم تھا۔اسی دوران سعدی تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔انہوں نے فارسی نظم ونثر میں کافی شہرت حاصل کی۔۱۲۵۷ء میں بوستان نظم کی۔یہ اخلاقی موضوعات پر نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔اور ہر باب میں حکایتیں درج ہیں۔ایک سال بعد دوسری اہم تصنیف ''گلستان'' لکھی۔یہ آٹھ ابواب پر مشتمل نثری تصنیف ہے جس میں اہم اخلاقی مسائل پرکشش انداز میں کہانیوں کی شکل میں پیش کئے گئے

ہیں۔اس تصنیف میں سعدی نے عربی و فارسی اشعار،قرآنی آیات،اوراحادیث کا سہارا لیا ہے۔سعدی کی شہرت کی اصل وجہ یہی دوتصانیف گلستان اور بوستان ہیں۔بقول حالی:

''یہ کتابیں شیخ کی زندگی کا خلاصہ اورلب لباب ہیں۔''۳۶؎

ان تصانیف کے علاوہ سعدی کی کلیات میں قصائد،قطعات،رباعیات،ترجیع بند،اورعربی قصائداور مقالات بھی ہیں۔سعدی شیرازی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہرایک صنف میں خوب عہدہ بر آہوئے۔ان کی علمی نگارشات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا میلان فلسفہ وحکمت کی طرف کم،اور شعروادب،دینیات،وعلم سلوک کی طرف زیادہ تھا۔خوش بیانی میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔فارسی وعربی زبان پر دسترس اوراس کے خلاقانہ استعمال پرقدرت حاصل تھی۔سیداحمد ایثآرکوسعدی شیرازی سے بےانتہاعقیدت ہے۔چنانچہ انہوں نے سعدی کی ۱۶۱رباعیات کا بھی منظوم اردوترجمہ کیا ہے جوزیراشاعت ہے۔ذیل میں چندرباعیات اوران کا ترجمہ پیش ہے۔ایثآر نے اس ترجمہ میں کئی جگہوں پراصل معنی ومفہوم ادا کرنے کے لئے نئے مرکبات کا استعمال کرتے ہوئے اپنی زبان کووسعت بخشی ہے۔

سعدی:

شبہا گذرد کہ دیدہ نتوانم بست
مردم ہمہ ازخواب ومن ازفکرِتومست
باشد کہ بدست خویش خونم ریزی
تاجاں بدہم دامنِ مقصود بدست

ترجمہ:

راتیں یوں ہی کٹ جاتی ہیں بیداری میں
سب نیند میں مشغول میں غمخواری میں
بہتر ہے جوتوقتل بھی کردے مجھکو
تاجان بھی دیدوں تری دلداری میں

مذکورہ بالا رباعی کے ترجمے میں اصل سے زیادہ بہاؤ ہے۔ یہاں ایثآر سعدی سے ایک قدم آگے کھڑے محسوس ہوتے ہیں۔ ترجمے کی زبان سلاست اور شگفتگی کی مظہر ہے جسکے باعث اصل متن کے مفہوم تک رسائی ممکن ہوئی ہے ۔۔اس ترجمہ میں ایثآر نے سعدی شیرازی کے کلام کی باریکیوں اور پیچیدگیوں تک رسائی حاصل کی ہے اور منظوم ترجمہ میں اصل مفہوم کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سعدی:

گر باد ز گل حسن شبابش ببرد
بلبل نہ حریفے است کہ خوابش ببرد
گل وقت رسیدن آب عطار ببرد
عطار بوقتِ رفتن آبش ببرد

ترجمہ:

پھولوں سے ہواؤں نے اڑایا ہے شباب
بلبل میں نہیں حوصلہ تا چھین لے خواب
عطار عرق ریز ہے پھولوں کیلئے
آخر انہیں پھولوں سے نچوڑیگا گلاب

سعدی نے اس رباعی میں ایک بہت بڑی حقیقت نظم کردی ہے۔انہوں نے فطرت،فطری حسن اور فطری امور کی جو عکاسی کی ہے وہ لاجواب ہے اور ایثآر نے بھی اپنے ترجمے میں نہ صرف اصل رباعی کے حسن کو قائم رکھا ہے بلکہ سعدی کے خیال کی ترسیل کرنے کی بھی حتی الامکان سعی کی ہے۔تاہم دوسرے مصرع ''بلبل نہ حریفے است کہ خوابش ببرد'' کا ترجمہ ''بلبل میں نہیں حوصلہ تا چھین لے خواب'' کا حسن لفظ ''تا'' نے چھین لیا ہے۔جبکہ بقیہ مصرعوں میں حسن کاری اپنے شباب پر ہے۔

سعدی:

چوں بخت بتدبیر نکونتواں کرد

بے فائدہ سعی وگفتگو نتواں کرد
گفتم بردم صبر کنم یک چندے
ہم صبر بروکہ صبر ازاو نتواں کرد

ترجمہ:

تد بیر سے تقد یر بنا نا مشکل
کوشش سے کوئی کام چلانا مشکل
بولا کہ چلوں صبر پہ قائم ہوجاں
صبر اس پہ کہ صبر جس پہ آنا مشکل

یہ رباعی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ سعدی اپنے معانی ومفاہیم کی بلندیوں کے لئے مشہور عالم ہیں ان کے مواعظ ونصائح کا ایک جہاں قائل ہے اور یہ حقیقت نگاری اور حقیقت پرستی ان کے افکار کا استعارہ ہے اور یہ رباعی اس دعوی کو صداقت سے معمور کرتی ہے۔ ایثآر نے بھی سعدی کی ہم آواز ہوکر یہ مواعظ اردو قارئین تک پہنچائے ہیں۔ ترجمے کی سلاست اور روانی حسب سابق برقرار ہے۔ مشکل کو آسان کر دکھانا ایثآر کے فن کا کمال ہے اور یہ فنکاری اس ترجمے میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ البتہ آخری مصرع کے ترجمے ''صبر اس پہ کہ صبر جس پہ آنا مشکل'' میں ''پہ، پہ'' کی تکرار ذہن میں کھٹکتی ہے۔

سعدی:

من چاکر آنم کہ دلے برباید
بادل بہ کسے دہد کہ جاں آساید
آنکس کہ نہ عاشق ونہ معشوق کسے است
در ملکِ خدا اگر نباشد شاید

ترجمہ:

میں اس کا غلام جو مرادل لے جائے

یا دیکے کسی کو دل خود آرام اٹھائے
عاشق ہو نہ معشوق ہے ایسا جو کوئی
مخلوقِ خدا بنکے وہ دنیا میں نہ آئے

مذکورہ بالا رباعی کا ترجمہ اصل فارسی شعر کا مکمل مفہوم اور حسن رکھتے ہوئے لفظی ترجمہ ہے۔ ترجمہ نگاری کرتے وقت مترجم کے سامنے بہت بار ایسے مقامات آتے ہیں جہاں مترجم کو ترجمے سے زیادہ ترجمانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی کام سید احمد ایثاؔر نے بھی کیا ہے۔

سعدی:

یا روئے بکنجِ خلوت آور شب و روز
یا آتشِ عشق بر کن د خانہ بسوز
مستوری و عاشقی بہم ناید راست
گر پردہ نخواہی کہ درد دیدہ بسوز

ترجمہ:

تنہائی میں رہ، عمر تو خلوت میں گذار
یا عشق کے شعلوں سے جلا دے گھر بار
پوشیدگی اور عشق؟ یہ دستور نہیں
گر پردہ نہ ہو آنکھوں کو بنا دے بیکار

تصوف کی چاشنی مستعار لے کر کہی گئی یہ رباعی نہایت معنی خیز ہے نیز ترجمے کے حسن سے پیغام کی ترسیل آسان ہوگئی ہے۔ دوسرے مصرعے ''یا آتشِ عشق بر کن دخانہ بسوز'' کا ترجمہ ''یا عشق کے شعلوں سے جلا دے گھر بار'' خوب کیا ہے۔ اسی طرح آخری مصرع ''گر پردہ نخواہی کہ درد دیدہ بسوز'' کا ترجمہ ''گر پردہ نہ ہو آنکھوں کو بنا دے بیکار'' نہایت رواں اور سلاست سے پر ہے۔

سعدی:

خیزم کہ نماند بیش ازیں تدبیرم
خصم از ہمہ شمشیر زند یا تیرم
گر دست دہد کہ آستینش گیرم
ورنہ بردم برآستانش میرم

ترجمہ:

بہتر کوئی اس سے نہ سجھائی تدبیر
شمشیر جلائے کوئی دشمن یا تیر
موقع ہو تو، بازو کو پکڑ لوں اسکے
یا جا کے وہیں سامنے ہو جاؤں ڈھیر

اس رباعی کے پہلے مصرعہ کا ترجمہ کیا خوب کیا ہے اور تیسرا مصرعہ ''گر دست دہد کہ آستینش گیرم'' کی ترجمانی ''موقع ہو تو، بازو کو پکڑ لوں اسکے'' عمدہ کی گئی ہے یہ ترجمہ سلیس، رواں اور اصل سے قریب تر ہے وہیں آخری مصرعہ ''ورنہ بردم برآستانش میرم'' کا ترجمہ ''یا جا کے وہیں سامنے ہو جاؤں ڈھیر'' میں ایثار کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

سعدی:

می آئی ولطف وکرمت می بینم
آسائش جاں درقدمت می بینم
وآں وقت کہ غائبی ہمت می بینم
ہر جا کہ نگہ میکنمت می بینم

ترجمہ:

آمد سے تری لطف وکرم پاتا ہوں
آسائشِ جاں زیرِ قدم پاتا ہوں

جب تو نہ ہوتو ہی نظر آ تا ہے مجھے
موجود تجھی کو اے صنم پا تا ہوں

اس رباعی میں بھی محبوب کے تذکرے ہیں اس کی لطف وعنایت کا ذکرِ جمیل ہے۔اوراس کی زندگی شاعر کے لئے اساسِ حیات ہے۔گوکہ یہاں سعدی نے محبوب حقیقی کا ذکر کیا ہے لیکن ایک شعر سے ہر باذوق قاری اپنے اپنے مفاہیم کے موتی چن لیتا ہے اس لئے ایک عاشق بھی اسے اپنے محبوب مجازی کے معنی میں لے سکتا ہے۔چنانچہ جذبہ کی جو لہر اصل فارسی رباعی میں ہے ترجمے میں اس نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرلی۔محسوس ہوتا ہے گویا یہ ترجمہ نہیں تخلیق ہے۔نیز ایثآر اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ فارسی کی بعض تراکیب اور الفاظ اردو میں بھی مستعمل ہیں اور وہی معنی ومفہوم رکھتے ہیں۔اس لئے انہوں نے ان کا اسی صورت میں یا معمولی سی تبدیلی سے منظوم ترجمے میں استعمال کیا ہے۔زیرِنظر ترجمہ میں ایثآر نے لطف وکرم اور آسائشِ جاں کو جوں کا توں منظوم ترجمے میں استعمال کر کے ترجمے کو اصل فارسی رباعی کے قریب تر کر دیا ہے۔

سعدی:

تدبیرصواب از دلِ خوش باید جست
سرمایۂ عافیت کفافست نخست
شمشیرقوی، نیاید از بازوئے سست
یعنی ز دلِ شکستہ تدبیر درست

ترجمہ:

خوش دل ہی سے پاسکتے ہیں تدبیرصواب
اچھا ہے کہ حاصل ہوں ضروری اسباب
کمزور سے اٹھتی نہیں شمشیر قوی
ہوتی ہے دلِ زار کی تدبیر خراب

اس رباعی میں سعدی نے ایک حقیقت کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ایثآر نے بھی ترجمانی کا حق ادکیا ہے۔ترجمہ خوبصورت، سلیس اور فصیح ہے۔اس منظوم ترجمے کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے قاری کو فارسی زبان وادب سے منظوم صورت میں واقفیت کا موقع فراہم ہوتا ہے۔اور تراکیب واصطلاحات کی سحر آفرینی کوجس طرح ایثآر نے اردو میں منتقل کیا ہے اس سے قاری قریبی واقفیت حاصل کرتا ہے۔اس کے علاوہ سعدی کی معنی خیز رباعیات تک اس کی رسائی ممکن ہو پاتی ہے ۔ایثآر نے اپنے ترجمے میں سعدی کی تشبیہات،استعارات،اوراصطلاحات کواپنے منظوم ترجمے میں بھی برقراررکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی یہ کوشش قابلِ قدر ہےان کا یہ ترجمہ بے ساختہ اور تصنع سے دور ہے۔ان کے مطالعے سے سعدی کی رباعیات کالطف محسوس ہوتا ہے۔

د۔رباعیاتِ مولانا روم کے منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ

محمد جلال الدین رومی تیرہویں صدی کے ایران کے ممتاز صوفی شاعر ہیں۔ان کا آبائی وطن بلخ ہے وہیں ان کی پیدائش ہوئی ۔ان کی ولادت ۶ ربیع الاول۶۰۴ ھ کو ہوئی ۔ان کے والد کا نام محمد اور لقب بہاؤ الدین تھا۔ان کے والد نے اپنے مریدانِ خاص میں سے سید برہان الدین محقق ترمذی کو ان کا اتالیق مقرر کیا۔والد کی وفات کے بعد۶۲۹ ھ میں حلب اور دمشق کا سفر کیا۔حلب میں کمال الدین بن عدیم حلبی اور بعض دوسرے فضلاء سے علوم حاصل کئے ۔حلب سے دمشق تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ مقدسیہ میں قیام کیا۔ ۶۳۴ ھ میں واپس آ کر قونیہ میں سکونت اختیار کر لی ۔ یہاں مولانا درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہو گئے ۔مولانا کی یہ کیفیت۶۴۲ ھ تک قائم رہی ۔اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل گیا اور یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اوران سے عشق کی حدتک عقیدت تھی ۔دراصل مولانا روم کی شاعرانہ زندگی کی ابتداء شمس تبریز کی آمد کے بعد ہی سے ہوئی ۔شمس تبریز اپنے وقت کے صوفی پیروں میں ایک مجذوب پیر تھے ۔جو اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے۔شمس تبریز کی معیت میں رومی شہرۂ آفاق بن گئے اور پوری طرح صوفیانہ زندگی میں داخل ہو گئے ۔شمس کی ملاقات نے انہیں ایک بلند صوفی شاعر بنادیا۔مولانا روم کی شمس تبریز سے ملاقات کے واقعہ کا ذکر شبلی نعمانی سوانح مولانا روم میں یوں کرتے ہیں:

''ایک دن مولانا گھر میں تشریف رکھتے تھے ،تلامذہ آس پاس
بیٹھے تھے ،چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ،اتفاقاً شمس
تبریز کسی طرف سے آ نکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے ،مولانا کی

طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہ (کتابوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہے، مولانا نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے، یہ کہنا تھا کہ دفعتہً تمام کتابوں میں آگ لگ گئی مولانا نے کہا یہ کیا ہے، شمس نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے، شمس تو یہ کہکر چل دیے مولانا کا یہ حال ہوا کہ گھر بار، مال اولاد، سب چھوڑ چھاڑ نکل کھڑے ہوئے، اور ملک بملک خاک چھانتے پھرے، لیکن شمس کا کہیں پتہ نہ لگا۔'' ۳۷

مولانا روم نے اپنے نثری اور شعری کارناموں میں تصوف کے مسائل کو بہت موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ تصوف رومی کی شاعری بنیاد ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے صوفیانہ شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ انہوں نے تصوف کے علوم کو اپنی شاعری میں معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ مولانا روم کی شاعری اور افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا زادہ شفق رقمطراز ہیں:

''مولانا جلال الدین کی شاعری رسائی مقصود، اتقان مطلب، لطافت معنی، باریکی خیال، عرفانی فکر کی صفائی اور پختگی کی شاعری ہے گویا سنائی نے عرفانی شاعری کا قوام اور اس میں موزونیت تام پیدا کی۔ شیخ عطار نے اسے لطیف معانی اور شور وشوق کا مظہر بنایا اور مولانا جلال الدین نے اسے اوج کمال پر پہنچایا۔'' ۳۸

ایثاؔر نے مولانا روم کی شہرۂ آفاق مثنوی معنوی کی مکمل چھ جلدوں کا ترجمہ کیا ہے جو زیر اشاعت ہے۔ مثنوی معنوی دنیا کی عظیم شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ مثنوی آج بھی ''قرآن در زبان پہلوی'' کا درجہ رکھتی ہے۔ تاریخ تصوف اسلام میں مولانا روم کی شخصیت ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ مولانا روم علم و فضل کے بحرِ ذخار تھے۔ قرآن ہو یا حدیث، منطق ہو یا فلسفہ کوئی علم ایسا نہ تھا

جس پر ان کو عبورِ کامل حاصل نہ ہو۔مثنوی معنوی بقول مولانا شبلی یہی وہ کتاب ہے جس نے مولانا روم کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے۔مثنوی کے کل چھ دفتر ہیں۔دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے اور شرحیں موجود ہیں۔یہ مثنوی مولانا روم کے افکارِ عالیہ اور تصوف کے اسرار و رموز کا ایک گنجینہ ہے جس میں انہوں نے اپنے پیغام کو حکایتوں اور تمثیلوں کے پیرائے میں اس انداز میں بیان کیا ہے کی اہلِ دل پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔تصوف اور اخلاق کے دقیق مسائل اور اسرار و رموز کا ایک گلستان ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔مولانا روم محض فرد اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کے مبلغ نہیں بلکہ ارتقائے انسانی کے علمبردار ہیں۔مولانا روم نے اپنے خیالات میں حقائق دین اور زندگی کی روح کو سمو دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے علاوہ آج بھی ان کے اشعار مشہور و مقبول ہیں۔رومی اپنی فکر و فن کو انسان کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے رہے چنانچہ وہ اپنے دور کے انسانوں کو فکری و عملی انقلاب کی دعوت دیتے تھے تاکہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آسکے۔انہوں نے اپنے روحانی افکار و خیالات کو اشعار کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔انہوں نے عارفانہ فلسفیانہ اور اخلاقی مطالب کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔مثنوی معنوی کے بعد مولانا روم کی سب سے اہم تصنیف ''دیوان شمس تبریز ہے۔رومی کو شمس تبریز سے جو والہانہ محبت و عقیدت تھی اسی کے باعث انہوں نے اپنے دیوان کا نام دیوانِ شمس رکھا۔مولانا روم کو فارسی ادب میں ایک قابلِ رشک، ارفع اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ان کے کلام کی آفاقیت اور عالمگیریت مسلم ہے۔ایثآر نے مولانا روم کی ۴۳۶ رباعیات کو اردو کا لبادہ پہنا کر اس کی معنوی خوبیوں کو قارئین تک پہچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان تراجم میں ایثآر کے خلوص، ریاض اور خونِ جگر کی مکمل نقش گری جلوگر ہے ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں۔

رومؔی:

اے دوست بدوستی قرینیم ترا
ہر جا کہ قدم نہی زمینیم ترا
در مذہب عاشقی روا کے باشد
عالم بتو بینیم نہ بنیم ترا

ترجمہ:

اے دوست محبت میں ہیں ہم تجھ سے قریں

تو رکھے جہاں پاؤں وہیں ہم ہیں زمیں

مذہب میں محبت کے کہاں جائز ہے

ہم تجھ سے جہاں دیکھیں، مگر تجھ کو نہیں

مذکورہ بالا رباعی کا ترجمہ رواں اور قابلِ ستائش ہے۔ ایثاؔر نے ترجمہ میں کہیں بھی مرکزی خیال اور مجموعی نفسِ مضمون کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ دوسرے مصرع ''ہر جا کہ قدم نہی زمینیم ترا'' کا ترجمہ ''تو رکھے جہاں پاؤں وہیں ہم ہیں زمیں'' کر کے شاعر کے خیال کو جس سادگی اور خوبصورتی سے ترجمے میں پیش کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ کہیں کسی بھی مقام پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایثاؔر نے کوئی بھاری بھرکم الفاظ یا تراکیب کے استعمال سے ترجمے کے حسن و تاثیر کو متاثر کیا ہے۔

روؔمی:

تا از تو جدا شدہ است آغوش مرا

از گریہ کسے نہ دیدہ خاموش مرا

در جان و دل دیدہ فراموش نئی

از بہر خدا مکن فراموش مرا

ترجمہ:

تجھ سے ہوا محروم جو پہلو میرا

روتا رہا اشکوں کا بہاؤ نہ رکا

تو جان و دل و چشم سے پوشیدہ نہیں

مجھکو بھی خدا کیلئے تو بھول نہ جا

یہ ایثاؔر کا کمال ہے کہ انہوں نے ترجمے میں عام فہم الفاظ، مترادفات اور اصطلاحات کا استعمال کیا ہے

اورشاعر کے لب ولہجہ کے اصل رنگ ذائقے وکھنک کو مکمل کامیابی اور روانی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے ۔پہلے مصرعے میں 'آغوش' کو 'پہلو' سے تعبیر کیا ہے جو بجا ہے۔اسی طرح تیسرے مصرعے میں لفظ ''فراموش '' کے لئے ''پوشیدہ'' استعمال کیا ہے۔وہیں دوسرے مصرعے میں دیدہ خاموش کو 'اشکوں کے بہاؤ نہ رکا'' کہہ کر یہ ثابت کردیا کہ وہ فارسی زبان کی روح میں ڈوب کر اردو کی سطح پر ابھرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اس لئے بہت سہولت کے ساتھ اصل متن کو اس کے اصل حسن وتاثیر اور روانی و برجستگی کے ساتھ ترجمہ کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ ترجمے پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے اور یوں ثابت ہوتا ہے کہ ایثآر دونوں زبانوں کے علمی وادبی اسالیب اور فنی باریکیوں پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔

رومؔی:

نور فلک است ایں تن خاکی ما
رشک ملک آمد است چالاکی ما
گہ رشک بر د فرشتہ از پاکی ما
گہ بگذرد دیوز بے باکی ما

ترجمہ:

اپنا تن خاکی بھی ہے افلاک کا نور
پھرتی کا یہ عالم کہ فرشتے مسحور
عفت سے ملائک کبھی شرماتے ہیں
بیباکی سے شیطاں بھی چلا جاتا ہے دور

ایثآر کے ترجمے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ قاری کی تمام مشکلات اور دشواریوں کو اپنے علمی تدبر کے ذریعے آسان بنادیتے ہیں۔جس کی وجہ سے قاری تخلیقی گرفت کی مشکل سے آزاد ہوجاتا ہے۔اس کا اندازہ مذکورہ بالا رباعی کے ترجمے سے ہوتا ہے اس ترجمے میں یہ بات قابل غور ہے کہ انہوں نے نہ تو پیچیدہ الفاظ کا استعمال کیا اور نہ ہی مشکل اصطلاحات کے استعمال سے ترجمے کو گراں بار کیا۔بلکہ آسان الفاظ میں روانی کے

ساتھ اصل مفہوم کو ترجمے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

رومؔی:

حاجت نہ بود مستیٔ ما را بشراب
یا مجلسِ ما را طرب از چنگ در باب
بے ساقی و بے شاہد و بے مطرب و مے
شوریدہ و مستیم چو مستانِ خراب

ترجمہ:

مستی کو ضروری نہیں یہ جام شراب
یا بزم طرب کیلئے یہ چنگ در باب
ساقی ہے نہ معشوق نہ مطرب ہے نہ مے
مستوں کی طرح رہتے ہیں ہم مست وخراب

یہ ترجمہ بھی تمام فنی خوبیوں اور حسن کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ شاعر کے اصل احساس اور جذبے کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس میں وہی روانی وہی بے ساختگی موجود ہے جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے مثلاً تیسرے مصرعے کا ترجمہ دیکھیں ''ساقی ہے نہ معشوق نہ مطرب ہے نہ مے''۔ اکثر شعری تراجم میں مترجمین اصل متن کا خیال واجبی سا کرتے ہیں لیکن ایثاؔر کے شعری تراجم میں یہ انفرادیت ہے کہ وہ اصل مفہوم کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی تراجم میں وہ خصوصیات بھی پیدا کر دیتے ہیں جو اصل شاعری کی شان ہوتی ہیں۔

رومؔی:

گہ بادہ لقب نہادم و گہ جامش
گاہے زرِ پختہ گاہ سیم خامش
گہ دانہ و گاہ صید و گاہے دامش
ایں جملہ چراست تا نہ گویم نامش

ترجمہ:

کہہ دیتا ہوں مے اسکو کبھی کہتا ہوں جام

زرا سکو بتا یا تو کبھی نقرۂ خام

ہاں صید کہا ، دانہ کہا ، دام کہا

ذکراس کا یوں ہی کرتا ہوں لیتا نہیں نام

اس ترجمے کو مثالی ترجمے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ترجمہ کا آہنگ رواں اور کسی بھی پیچیدگی سے دور ہے اور مترجم نے رومی کے شعر کے مفہوم کو کامیابی کے ساتھ ترجمے میں پیش کیا ہے۔ترجمے کی روانی اور موسیقیت توجہ طلب ہے۔

رومیؔ:

اندر طلبِ دوست ہمی بشتابم

عمرم بکراں رسید ومن درخواہم

گیرم کہ وصالِ دوست درخواہم یافت

ایں عمر گذشتہ را کجا دریابم

ترجمہ:

سرگرم تلاش یار میں ہوں ہر دم

غفلت میں کٹی زیست کی مدت رہی کم

کب ہوگا؟ وصالِ یار ہونا ہے ضرور

کیا عمر گذشتہ پھر کہیں پائینگے ہم؟

یہ ترجمہ قریب المفہوم ہے۔مترجم نے شاعر کے خیال کو ترجمے میں سمونے کی پوری کاشش کی ہے۔ پہلے مصرعے میں طلبِ دوست کے لئے ''تلاشِ یار'' کا استعمال بجا ہے۔وہیں چوتھے مصرعے ''ایں عمر گذشتہ را کجا دریابم'' کا ترجمہ ''کیا عمر گذشتہ پھر کہیں پائینگے ہم؟'' خوب کیا ہے۔

رومیؔ:

من پیر شدم پیر نہ زایام شدم
از نازش معشوقہ خودکام شدم
در ہر نفسے پختہ شدم خام شدم
در ہر قدمے دانہ شدم دام شدم

ترجمہ:

میں اپنی بڑی عمر سے بوڑھا نہ ہوا
بوڑھا مجھے معشوق کے عشووں نے کیا
ہر لحہ بنایا وہ بگاڑا مجھ کو
ہر گام پہ اک دام ہوا دانہ بنا

مذکورہ بالا رباعی کا ترجمہ لفظی ہے۔ مترجم نے اصل خیال کو ترجمے میں قید کی کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پہلے دو مصرعوں کا ترجمہ مناسب ہے البتہ تیسرے مصرعے کا ترجمہ ''ہر لحہ بنایا وہ بگاڑا مجھ کو'' ذہن میں کھٹکتا ہے۔ چونکہ ''وہ بگاڑا'' سے فصیح ''اس نے بگاڑا'' ہے لیکن چونکہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ شعری ترجمے کے دوران مترجم کو سہہ گونہ مسائل و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ شعر کے ترجمے میں مشکلات سے عہدہ برآنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ان مشکلات و مسائل کو سمجھتے ہوئے جیلانی کامران نے کہا تھا:

''میرے خیال میں اگر شعری ادب کے تراجم کے لئے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض، قافیے، اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہیں تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔''[۳۹]

غرض ان شعری مسائل کے باوجود ایثارؔ نے نہایت سنجیدگی، متانت کے ساتھ اس سہولت و سادگی سے

ترجمہ کیا ہے کہ قاری کا ذہن کہیں بھی اٹکنے نہیں پاتا اور وہ متن کی روح تک پہنچ جاتا ہے۔ چند اور مثالیں پیش ہیں:

رومیؔ:

مہتاب بلند گشت و ما پست شدیم
معشوق بہوش آمد و ما مست شدیم
اے جانِ جہاں ہر چہ ازیں پس شمری
بر دست مگیر زاں کہ از دست شدیم

ترجمہ:

مہتاب چلا اوج پہ ہم پست ہوئے
معشوق کو ہوش آ گئے ہم مست ہوئے
بعد اسکے مری جان نہ کر اپنا شمار
قابو سے ہم آزاد سر دست ہوئے

ترجمہ رواں اور سلیس ہے۔اس ترجمے میں ایثاؔر نے فارسی متن کے اصل قافیوں ''پست ،مست دست کو ترجمے میں برقرار رکھا ہے۔ترجمے میں ایسا لطف اور کشش ہے کہ اصل کا حسن اس میں بھی برابر نظر آتا ہے۔منظوم ترجمہ کرنا ازخود مشکل اور مشقت طلب کام ہے۔اس پر مزید یہ کہ رومی کے کلام کی گہرائیوں کو سمجھنا اور اسے منظوم ترجمے میں منتقل کرنا خاصی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔اس ترجمے کے مجموعی مطالعے سے ایثاؔر ان اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے ذوق سلیم و کاوش کے ذریعے اپنے تراجم کو نکھار کر اور اصل سے قریب تر کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ترجمہ نگاری کے آداب سے کما حقہ واقف ہیں۔ایثاؔر کے قلم کا اعجاز ہے کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے نہ صرف سادگی و پرکاری کو ملحوظ رکھتے ہیں بلکہ اصل متن کے حسن کو پوری حسن کاری کے ساتھ ترجمے میں پیش کر دیتے ہیں۔بلاشبہ ایثاؔر کے ان تراجم سے اردو زبان کے دامن میں کشادگی پیدا ہوئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے ایثاؔر کی تخلیقی ذہن کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔جس سے ترجمے کو ادب میں ثانوی حیثیت دینے والوں کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کا موقع ملتا ہے۔

حوالے

۱۔(مضمون) ترجمے کے بنیادی مسائل، ظ انصاری، مشمولہ ترجمہ کا فن، خلیق انجم، ص۹، مطبوعہ ادب لطیف، لاہور

۲۔ترجمہ کا فن اور روایات، ڈاکٹر قمر رئیس، ص۱۱، تاج پبلشنگ ہاؤس

۳۔مضمون ترجمے کے بنیادی مسائل، ظ انصاری، مشمولہ ترجمہ کا فن، خلیق انجم، ص۹، مطبوعہ ادب لطیف، لاہور

۴۔انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر احسن الدین احمد، ص۱۱

۵۔ارسطو سے ایلیٹ تک، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص۱۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

۶۔پروفیسر کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ص۱۹۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

۷۔پروفیسر کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ص۱۹۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

۸۔پروفیسر کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ص۱۹۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

۹۔فنِ ترجمہ نگاری، مضمون دریافت اور بازیافت، خلیق انجم، ص۱۳۲

۱۰۔اصنافِ ادب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ص۱۹۰، سنگ میل پبلیکیشنز

۱۱۔ایلیٹ کے مضامین، جمیل جالبی، ص۱۰، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۲۔عبدالحق، ڈاکٹر ''مقدمہ تاریخِ یونان'' ترجمہ سید ہاشمی فرید آباد، ۱۹۱۹ء، ص۳

۱۳۔حامد بیگ مرزا (مضمون) ''ترجمے کا فن اور اس کا جواز'' ماہِ نو لاہور، مئی ۱۹۸۶ء ص۱۳۲

۱۴۔احسن فاروقی، ایلیٹ کے مضامین

۱۵۔فنِ ترجمہ نگاری، خلیق انجم، ص۱۱۷، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

۱۶۔انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ۲۹

۱۷۔بحوالہ انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر احسن الدین احمد، ۲۱

۱۸۔(مضمون)منظوم ترجمے کا عمل، ڈاکٹر عنوان چشتی، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۵۹، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۹۔ڈاکٹر یوسف کمال، (پیش لفظ) کلامِ اقبال کے تراجم، مشمولہ ''پیامِ مشرق منظوم ترجمہ'' (مترجم مضطر مجاز)، ص ۷ص، اقبال اکیڈمی حیدر آباد

۲۰۔اقبال ریویو، حیدر آباد، ۱۹۹۷، ص ۸۹

۲۱۔ڈاکٹر فخر عالم اعظمی (مضمون) اقبال کا فارسی کلام اور ترجمے کی ضرورت، مشمولہ جہانِ اقبال، مرتبہ عبدالرحیم خاں، ص ۷۵، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی

۲۲۔ڈاکٹر فخر عالم اعظمی (مضمون) اقبال کا فارسی کلام اور ترجمے کی ضرورت، مشمولہ جہانِ اقبال، مرتبہ عبدالرحیم خاں، ص ۷۶، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی

۲۳۔ دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی، ڈاکٹر محمد اقبال، ص ۱۵۱، مشمولہ شرح اسرارِ خودی، یوسف سلیم چشتی، اقبال اکیڈمی لاہور

۲۴۔نقدِ اقبال، میکش اکبر آبادی، ص ۱۳۲، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ

۲۵۔فکرِ اقبال ، خلیفہ عبدالحکیم، ص ۴۳۳، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

۲۶۔رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۳۸، ص ۷۵۷

۲۷۔بحوالہ رموزِ بےخودی مع شرح، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۳، اعتقاد پبلشنگ ھاؤس، نئی دہلی

۲۸۔وارداتِ ایثار، محمد اقبال، ص ۳۷۵، ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

۲۹۔شرح پیامِ مشرق، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص 8

۳۰۔زبورِ عجم مع شرح، پروفیسر سلیم چشتی، ص ۶

۳۱۔اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، عبدالشکور احسن، ص ۱۱۱، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷

۳۲۔اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، عبدالشکور احسن، ص ۱۴۲، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷

۳۳۔بحوالہ، جاوید نامہ، منظوم اردو ترجمہ، سید احمد ایثار، ص ۱۵، ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ

۳۴۔نیرنگِ خیال۔اقبال نمبر، ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۴۵۵

۳۵۔اقبال کامل،مولانا عبدالسلام ندوی،ص۱۰۶،درطبع معارف اعظم گڑھ،۱۹۵۶ء

۳۶۔حیاتِ سعدی،الطاف حسین حالی،ص۷۷

۳۷۔سوانح مولانا روم،شبلی نعمانی،ص۹

۳۸۔ڈاکٹر رضازادہ شفق،تاریخ ادبیاتِ ایران،ص۳۶۳

۳۹۔شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات،پروفیسر جیلانی کامران،مشمولہ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل،ص۲۲۹

باب پنجم

﴿......سید احمد ایثآر کے تراجم کا تقابلی مطالعہ......﴾

تقابلی مطالعہ مختلف زبانوں کی ادبیات اورفن پاروں کا ایسا تجزیاتی مطالعہ ہے جس کے ذریعے ادب و فن، شعرا اور فنکاروں کے مراتب کے تعین کرنے، ان کی خصوصیات کو اجاگر کرنے اوران کے تاثر کونمایاں کرنے میں قابلِ لحاظ مدد ملتی ہے۔ یہ تنقید کا ایک اہم اور ناگزیر شعبہ ہے جو سائنسی طریق کار کا حامل ہے۔ اس میں بالعموم دو یا دو سے زائد فنکاروں یا ادب پاروں اور زبانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے، جس سے متعلقہ ادب پاروں یا تخلیق کاروں کے مراتب کے تعین، ان کی امتیازی خصوصیات کونمایاں کرنے اوران کے اثرات کی نشاندہی کرنے میں مدد ملتی ہے۔تقابلی مطالعہ محض کسی زبان یا ادب تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے مختلف زبانوں کی ادبیات کے مابین باہمی لین دین اور اثرات کا احاطہ بھی کیا جاتا ہے نیز ان کے تہذیبی و تاریخی عوامل و محرکات کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔تقابلی ادب کے ذریعے انسانی قدروں میں تال میل پیدا کیا جاسکتا ہے اورفنون کے آپسی رشتے کا سراغ لگا کر اسے مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ تقابلی ادب کا مطمحِ نظر یہ بھی ہے کہ ادب سے ادب کا رشتہ استوار ہو۔ادب کے ماخذات کا پتہ لگایا جاسکے۔ادب میں تنقیدی بصیرت، عصری آگہی، تاریخی وراثت اور ہرلمحہ بدلتی انسانی قدروں کا جائزہ لیا جاسکے۔ چنانچہ یہ ادب کی تفہیم اور پرکھ کا ایک ایسا طریقِ کار ہے جس کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ پروفیسر محمد حسن اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''تقابلی ادب وہ ادب ہے جو دو فن کاروں، دو تہذیبوں اور دو
> زبانوں کی ادبیات کے درمیان مختلف سطحوں کے لین دین،
> تطابق اور تخالف کا مطالعہ کر کے اس کے دورس محرکات اور وسیع

تر عالمی آ گاہوں کو سامنے لاتا ہے۔''[1]

ہندوستان میں تقابلی مطالعے کی تاریخ وروایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو ادب کی تاریخ۔ مثلاً مرزا عطاحسین تحسین خان کی ''نوطرز مرصع'' اور میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' یقیناً تقابلی طرزِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ اردو ادب میں نثر کو مقابلے شاعری میں تقابل زیادہ کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ میرؔ سوداؔ سے شروع ہوتے ہوئے مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے بعد بھی جاری رہا۔ یہ ادبی معرکے دراصل شعروادب میں تقابل کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی کے مطابق:

''اردو شاعری میں موازنہ کی رسم بہت قدیم ہے اور شعرا کی باہمی رقابت سے وابستہ ہے''[2]

اردو ادب میں نہ صرف اردو شعرا کے کلام کا آپس میں موازنہ کیا گیا بلکہ بعض مغربی شاعروں کے افکار و تصورات اور کلام کے مابین بھی کثرت سے موازنے ہوئے۔ تقابلی مطالعے کی بدولت مختلف علوم وادب سے واقفیت عام ہوئی، تمام ادبیات کے مابین لین دین، تقابل و توازن کا سلسلہ استوار ہوا جس کے نتیجہ میں اردو کے تمام بڑے شعرا مثلاً میر و غالب اور اقبال کی عظمت و اہمیت عالمی سطح پر تسلیم کی گئی۔ مثال کے طور پر دہلی کا دبستانِ شاعری، لکھنو کا دبستانِ شاعری، دو ادبی اسکول، مثنوی سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا تقابلی مطالعہ، میر اور فانی کا تقابلی مطالعہ، اقبال اور گوئٹے وغیرہ اس سلسلے میں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

تقابلی مطالعہ کا دائرہ عام ادب وتنقید کے مقابلے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہ ایک انتہائی جاں فشانی اور محنت طلب فعل ہے۔ اس کی ذمہ داریاں عام تنقیدی و تحقیقی سرگرمیوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ تقابلی ادب جہاں ادبی مطالعات کے لئے روشنی فراہم کرتا ہے وہیں یہ مطالعہ ملک کی سرحدوں کو توڑتا ہوا، مختلف قوموں اور ان کے تہذیبی اثرات اور تحریکات کی تلاش کرتا ہے اور انسان کی دیگر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کی ادبیات کے مابین تعلقات کو اجاگر کرتا ہے۔

اردو ادب میں تقابلی تنقید یا تقابلی مطالعہ کی باقاعدہ ابتدا کا سہرا مولانا شبلی نعمانی کے سر جاتا ہے۔ ان کی تحریر کردہ تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' کو اردو میں اس فن کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے جو اپنے

موضوع مواد اور پیش کش کے اعتبار سے قابلِ قدر تصنیف ہے۔

تقابلی مطالعہ کے دوران اس کے اصول و معیار سے واقفیت ضروری ہے۔جس میں سب سے اہم اصول شعرا یا ان کی تخلیقات کے مابین نقطۂ اشتراک ہے۔چونکہ کسی بھی شاعر یا ادیب کا موازنہ ان کے مابین خصوصیات کی بنیاد ہی پر کیا جاتا ہے۔جس میں بالعموم ان کے فنی وفکری عوامل ومحرکات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر احتشام احمد ندوی رقمطراز ہیں کہ:

''موازنہ یوں تو بہت سے پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر مختلف موضوعات کا بھی آپس میں کیا جا سکتا ہے ۔اس لئے کہ فن کی خوبیاں بہر حال ایک قدر مشترک کی حامل ہوتی ہیں لیکن اس کا لطف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ نہ صرف ایک صنفِ شاعری میں کیا جائے بلکہ کسی مشترک موضوع پر کیا جائے جو دونوں شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں ''موازنہ انیس ودبیر'' قابلِ لحاظ ہے کہ دونوں شعرا کے یہاں بالکل مشترک موضوعات پرطبع آزمائی کی گئی ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں کا موازنہ کرنے میں لطف بھی زیادہ آتا ہے۔''[۳]

تقابلی مطالعہ موضوع یا خیال، اسالیب و پیش کش کے طریقہ کار، فلسفہ وفکر، اخلاقی وسماجی قدریں غرض کسی بھی سطح پر کیا جاسکتا ہے۔اس طرح کے مطالعہ سے شعرا یا ادباء کی تمام فنی وفکری جہتیں اور ان کی تخلیقات کی روح میں کارفرما عوامل ومحرکات بے نقاب ہو سکتے ہیں اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔شعرا کے باہمی موازنہ میں اسلوب یا طرزِ بیان پر گہری نظر رکھنا از حد ضروری ہے تا کہ ان کے فن اور حقیقی عظمت تک پہنچا جا سکے۔اس کے علاوہ تقابلی مطالعہ کے دوران ہر قسم کے تعصّبات وتاثرات سے خود کو دور رکھنا چاہیے تا کہ موازنہ کے فرائض بہتر طور پر انجام دیے جاسکیں۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''تقابلی تنقید کرتے وقت غیر جانبداری لازمی شرط ہے کیوں کہ نقاد اگر کسی بدنیت بنئے کی طرح ڈنڈی مارے تو اس کی تنقید، تنقید نہ رہے گی بلکہ ایک کے لیے اگر ''قصیدہ در مدح'' قسم کی چیز بنے گی تو دوسرے کے لیے تنقیص کا انداز''[۴]

مختصر یہ کہ جن شعرا کے درمیان تقابلی مطالعہ کیا جائے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ تقابلی مطالعہ میں محض کسی شاعر کو کسی پر فضیلت دینا کافی نہیں بلکہ اس کی عظمت یہ ہے کہ دونوں شعرا کے مکتبِ فکر کو واضح کیا جائے، ساتھ ہی ان کے فلسفہ و فکر کی تشریح کی جائے اور ان کے خصائص کو کھل کر بیان کیا جائے۔ صحیح فیصلہ اور وسعتِ نظر کی روشنی میں یہ کام بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ ابواب میں سید احمد ایثاؔر کی حالاتِ زندگی، ان کی تخلیقات اور تراجم کا تفصیلی و تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ اس باب میں ان کے کیے گئے تراجم اور دیگر مترجمین کے تراجم سے تقابلی جائزہ لینا مقصود ہے۔ اقباؔل کی فارسی شاعری کے ترجمہ میں ایثاؔر کی فنی اور علمی صلاحیتیں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں ان کے تراجم کا تقابلی مطالعہ اس کا تعین کرنے میں معاون ہوگا۔ یوں تو اقباؔل کے فارسی کلام کا کئی مترجمین نے اردو منظوم ترجمہ پیش کیا ہے جن کی تفصیل گزشتہ باب میں پیش کی گئی ہے لیکن مقالہ کی طوالت کے پیشِ نظر زیرِ نظر باب میں فارسی کلامِ اقبال کے مخصوص مترجم اور ان کے تراجم کا ایثاؔر کے تراجم سے تقابلی جائزہ پیش ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی پیامِ مشرق'' کے منظوم تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے گا۔ ''پیامِ مشرق'' کا منظوم ترجمہ سید احمد ایثاؔر کے علاوہ مضطر مجاز، عبدالرحمٰن طارق اور شبیر علی سرخوش نے کئے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایثاؔر کے پیامِ مشرق کے تراجم کا مضطر مجاز اور عبدالرحمٰن طارق کے تراجم سے تقابلی جائزہ پیش ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مضطر مجاز یا عبدالرحمٰن طارق کی ادبی کاوش کی اہمیت کو کمتر ثابت کیا جائے بلکہ حقیقتاً اس بات کا اندازہ لگانا ہے کہ فنِ ترجمہ پر ایثاؔر کی گرفت واقعی مضبوط ہے اور اصل تخلیق کے مفہوم تک ان کی رسائی مقابلتاً واضح ہے۔

اقباؔل کی پیامِ مشرق شعری اعتبار سے فکری بلندی، تخیل و ہمہ گیری، جذبات و احساسات کی شدت اور بیان کی ندرت سے مالا مال ہے۔ یہ مجموعہ اقبال نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے جواب

میں لکھا۔اقبال کی غرض وغایت اس مجموعے سے یہ تھی کہ ان اخلاقی، مذہبی،اورقومی صداقتوں کوپیش کیا جائے جوافراداوراقوام کی باطنی نشو ونما کے لئے ضروری ہیں۔اس تصنیف کے ذریعے اقبالؔ نے مشرق اورمغرب دونوں کوعشق کا پیغام دیا ہے۔ان کے مطابق عشق کے بغیر باطنی تربیت ناممکن ہے۔انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یورپ روحانی اقداراورسوزِ باطنی سےمحروم ہوتا جارہاہے۔ان کی آرزو ہے کہ یہ بےیقینی ختم ہوجائے اورمغرب کا سینہ کسی طرح نورِیقیں سےمنورہوجائے۔

ایثارؔ نے اپنے تراجم کے ذریعے اقبال کے پیام کونہایت شگفتگی کےساتھ قارئین تک پہنچایا ہے۔ان کا یہ ترجمہ جہاں ایک طرف اقبال کے ساتھ ان کی بھرپور ذہنی وابستگی کی دلیل ہے وہیں دوسری طرف بہ طور ان کی کہنہ مشقی اوراخذِ مطالب پر قدرت کی غماز بھی ہے۔ذیل میں تقابلی مطالعہ پیش ہے۔

اقبالؔ:

زپیوندِتن و جانم چہ پرسی
بدامِ چندوچوں درمی نیایم
دمِ آشفتہ ام در پیچ وتابم
چواز آغوشِ نے خیزم نوایم

ترجمۂ ایثارؔ:

نہ پوچھو مجھ سے رشتہ جسم وجان کا
میں دامِ چندوچوں سے ماوراہوں
دمِ آشفتہ ہوں میں بےسکوں ہوں
گذرکر،نَے سے نکلوں تو نواہوں

ترجمۂ مضطرمجاز:

نہ پوچھواس جان وتن سے میرارشتہ
کہ میں اس دام میں ہرگز نہ آؤں

نوا جس طرح نکلے بانسری سے
دم آشفتہ ہوں اور مضطرب ہوں

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

پوچھتا ہے مجھ سے کیا تو جان وتن کا ماجرا
چند وچوں کے دام کا ہرگز نہ میں قیدی ہوا
ہوں دمِ آشفتہ اور کھاتا ہوں ہردم پیچ وتاب
جب اٹھا آغوشِ نے سے، بن گیا شورِ نوا!!

مذکورہ بالا تراجم میں ایثؔار کا ترجمہ سلیس رواں اور قریب المفہوم ہے۔اور تمام فنی خوبیوں اور حسن کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ اصل احساس اور جذبے کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔جبکہ طارق اور مضطر مجاز نے ترجمانی کی ہے۔ایثؔار کے ترجمے میں بندش کی چستی، زبان کی بے ساختگی، اور مطالب کی صحیح عکاسی ایک انوکھا لطف دے رہی ہے۔اس میں شک نہیں کہ مزاج اور سرمایۂ الفاظ کے اعتبار سے اردو اور فارسی میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔لیکن زبانوں کے مصادر اور افعال میں باہمی بعد بھی اسی قدر ہے۔ باہمی ہم آہنگی خواہ کتنی بھی ہوا گر مترجم کے یہاں مذاقِ شعری، بندش کی چستی اور بات کہنے کا سلیقہ نہ ہوتو منظوم ترجمے میں جان پیدا نہیں ہوسکتی۔اوراس طرح کا لطف اور کیف پیدا نہیں ہوسکتا جو ایثؔار کے تراجم میں موجود ہے۔

اقبؔال:

مگو از مدعائے زندگانی
ترا بر شیوہ ہائے اونگہ نیست
من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم
کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

ترجمۂ ایثؔار:

ہے ذکرِ مدعائے زیست بے سود

تو کار زندگی سے بے خبر ہے
میں ہوں ذوقِ سفر میں مست اتنا!
کہ منزل مجھکو سنگِ رہ گذر ہے

ترجمہ مضطر مجاز:

نہ سمجھا مجھ کو، تو نے جو بھی سمجھا مدعائے زندگانی
کہ تیری شیوہ ہائے زندگانی پر نظر یکسر نہیں ہے
مجھے ذوق سفر ہے اور میں ذوقِ سفر سے مست ہوں اتنا
کہ منزل میرے نزدیک ایک سنگِ راہ سے بڑھ کر نہیں ہے

ترجمہ عبدالرحمٰن طارق:

زندگی کو کر نہ منزل کے تصور سے تباہ
اس کے ذوق وشوق سے بیگانہ ہے تیری نگاہ
کیف ومستی سے سفر کی اس قدر سرشار ہوں
ہوگئی منزل بھی میری راہ میں اک سنگِ راہ

ان تینوں تراجم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایثاؔر کے تراجم میں سلاست، روانی اور شگفتگی مقابلتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔اور اگر ترجمے کی معنویت پر بھی غور کریں تو ایثاؔر کا ترجمہ اصل اشعار سے قریب تر معلوم ہوتا ہے اور موخرالذکر دونوں ترجمہ نگاروں کے ترجمے محض ترجمانی معلوم ہوتے ہیں۔عبدالرحمان طارق اور مضطر مجاز کو اقبال کے مطالب واضح کرنے کے لیے زیادہ لفظوں کا سہارا لینا پڑا ہے جب کہ ایثاؔر نے کم لفظوں میں ہی اقبال کا پیغام پہنچا دیا ہے اور یہی ترجمے کا حسن ہے۔ان دونوں مترجمین کے یہاں تصنع اور تکلف ہے جب کہ ایثاؔر کا اسلوب پانی کی طرح بہتا چلا جاتا ہے اور قاری بھی بلا تکلف اور ذہن پر زور دیے بغیر ان کے ساتھ شریک سفر ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ:

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما
بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں
دگر آدم بنا کن از گلِ ما

اقبالؔ کہہ رہے ہیں آ اے عشق اے ہمارے دل کے بھید اے ہماری کھیتی ہماری فصل آ جا یہ مٹی کے پتلے پرانے ہوگئے ہیں ہماری مٹی سے دوسرا آدم بنا۔اقبال کہنا چاہ رہے ہیں کہ عشق انسان کی حقیقت ہے اور عشق ہی مقصدِ حیات ہے اور عشق میں ہی وہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو نئی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ایثارؔ نے اقبالؔ کے اس پیغام کو اپنے ترجمے میں نہایت شگفتگی سے اس طرح سمویا ہے کہ ترجمہ میں اصل کا لطف آتا ہے ملاحظہ ہو:

تو آ! اے عشق رازِ مخفی دل
تو ہی کھیتی ہماری،تو ہی حاصل
پرانے ہوگئے خاکی نہاداں
دگر آدم بنا لیکر یہی گل

اسی خیال کو مضطر مجاز اپنے ترجمے میں یوں پیش کرتے ہیں:

اے میرے رمزِ دل! اے عشق ادھر آ!
مری کھیتی! مرے حاصل ادھر آ!
پرانے ہو چکے سب پیکرِ خاک
نیا آدم کوئی اب ڈھونڈ کر لا

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق

دل میں آ اے عشق، ہے تو ہی مری رمزِ بقا

تو ہی میری کشت ہے اور تو ہی حاصل ہے مرا
ہو چکے ہیں کہنہ و بوسید ہ یہ خا کی نہا د
میر ی آ ب و گل سے تو تعمیر کر آ دم نیا

مذکورہ بالا رباعی کے ترجمے میں ایثاؔر نے اقبال کی مستعمل بحر کا استعمال کرتے ہوئے قریب المفہوم منظوم ترجمہ کیا جبکہ دیگر مترجمین نے ترجمہ میں مفہوم کو زیادہ اہمیت دی ہے۔اگر چہ ایجاز واختصار میں ایثاؔر اور مضطر مجاز نے کمال دکھایا ہے جبکہ عبدالرحمٰن طارق نے ترجمانی کرتے ہوئے اقبال کے پیغام کو نہایت خوبصورتی سے ترجمے میں سمویا ہے۔مثلاً اس رباعی کا آخری مصرعہ ''دگر آدم بنا کن از گلِ ما'' اس کا ترجمہ ایثاؔر نے ''دگر آدم بنا لیکر یہی گل'' کیا ہے۔جو بالکل اصل کا عکس ہے جبکہ مضطر مجاز نے 'بنا'' کو''ڈھونڈ'' سے تعبیر کیا ہے اور''گل'' کا یکسر فراموش کر دیا'اور ترجمانی سے کام لیتے ہوئے اس طرح کیا ترجمہ کیا ہے''نیا آدم کوئی اب ڈھونڈ کر لا''۔وہیں عبدالرحمٰن طارق نے بھی ترجمانی سے کام لیا ہے۔'مجموعی طور پر تینوں ہی مترجمین نے اصل کے مفہوم کو بڑی کامیابی سے ترجمے میں پیش کیا ہے۔

اقباؔل:

ھمائے علم تا افتد بدامت
یقیں کم کن گرفتارِ شکے باش
عمل خواہی ؟ یقین را پختہ تر کن
یکے جوئے و یکے بیں و یکے باش

ترجمہ ایثاؔر:

ھما ئے علم کو پا نے کی خا طر
یقیں کم رکھ ، گر فتا رِ گما ں ر ہ
عمل چا ہے تو پختہ کر یقیں کو
تو یک جو، یک نظر اور ایک جاں رہ

ترجمۂ مضطرمجاز:

ہمائے علم پھنس جائے گا تیرے جال کے اندر
یقیں رکھتا ہے تو کم کر، اسیرِ بیم و شک ہو جا
عمل کا ہے اگر خواہاں تو پختہ کر یقیں اپنا
تجسس ایک کا کر اور یک بیں بن کے یک ہو جا

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

تا ہمائے علم اسیرِ دام ہو جائے وہیں
غرقِ شک رہ اور نہ کر تو علم پر اپنے یقیں
اور اگر چاہے عمل، کر لے یقیں کو پختہ تر
ایک کا طالب ہو اور رکھ اک ہی چوکھٹ پر جبیں!

مذکورہ بالا تراجم میں تقریباً تینوں ہی مترجمین نے مفہوم کو گرفت میں لینے کی پوری کوشش کی۔مثال کے طور پر دوسرے مصرعہ ''یقیں کم کن گرفتارِ شکے باش'' کا ترجمہ دیکھیں مضطر نے اس کا ترجمہ ''یقیں رکھتا ہے تو کم کر، اسیرِ بیم و شک ہو جا'' کیا ہے جبکہ عبدالرحمٰن طارق نے ''غرق شک رہ اور نہ کر تو علم پر اپنے یقیں'' ترجمانی سے کام لیتے ہوئے شگفتہ ترجمہ کیا۔اگر چہ دونوں مترجمین نے الفاظ اضافی استعمال کئے ہیں لیکن پھر بھی ترجمے فکری وفنی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔لیکن ایثآر کا ترجمہ ''یقیں کم رکھ، گرفتارِ گماں رہ'' مثالی اور دلکش ہے۔تقریباً پورے بند میں ایثآر نے اصل کا عکس پیش کرنے میں حد درجہ کمال دکھایا ہے۔لہٰذا فکری اور فنی اعتبار سے ایثآر کا ترجمہ کامیاب ہے۔

اقبآل:

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو زخود نا محرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ تو دیدار کی طلب میں طور پر پہنچا کیونکہ تو خود اپنے آپ سے انجان ہے۔تو آدمی کی تلاش میں قدم آگے بڑھا۔خدا بھی کسی آدمی کی تلاش میں ہے۔ایثارؔ نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

گدائے جلوہ بنکر طور پہنچا
کہ اپنی اصل خود تو نے نہ جانی
کہیں سے ڈھونڈ کر لا آدمی کو
خدا کو بھی طلب ہے آدمی کی

ترجمہ مضطر مجاز:

گدائے جلوہ پہنچا بر سرِ طور
نہیں ہے جان تیری خود سے محرم
نکل جا جستجو میں آدمی کی
خدا خود ہے یہاں جویائے آدم!

ترجمہ عبدالرحمٰن طارق:

اک تجلی کا گدا بن کر تو پہنچا طور پر
دل ترا اس وقت تھا حسنِ خودی سے بے خبر
نفس کے بندوں سے بچ کر ڈھونڈ کوئی آدمی
خود خدا بھی ڈھونڈتا ہے آدم والا گہر

مذکورہ بالا اشعار میں ایثارؔ نے ایجاز و اختصار کا بہت خیال رکھا ہے۔ جبکہ طارق اور مجاز نے یہاں ترجمانی سے کام لیا ہے۔اقبالؔ کی پیام کی وضاحت میں ایثارؔ کامراں ہیں۔مثلاً دیکھیے: ''نہیں ہے جان تیری خود سے محرم''۔یہاں لفظ ''خود'' پیچیدگی پیدا کرتا ہے ،یوں ہی ''تیری خود سے

محرم'' کا کیا مطلب؟ مقصد ہرگز واضح نہیں ہوتا۔اس کے بر خلاف ایثآر کو دیکھیے :''کہ اپنی اصل خود تو نے نہ جانی''۔ یہاں بھی ''خود'' کا لفظ ہے مگر دوسرے معنی میں۔فارسی کا ''خود'' اردو میں ''خود''نہیں ہوسکتا اس کے لیے ''خودی''بہترین ترجمہ ہے جو عبدالرحمان طارق کے یہاں پایا جاتا ہے:''دل ترا اس وقت تھا حسنِ خودی سے بے خبر''۔ایثآر نے اسی ''خود'' کو''اصل'' سے تعبیر کیا ہے جو قریب المفہوم ہے۔ایثآر نے پورے ترجمے میں متن کے مفہوم اور اس کی رعایت کو سمجھتے ہوئے شعری لہجے کو بھی سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اقبآل:

تو خورشیدی و من سیارۂ تو
سراپا نورم از نظارۂ تو
ز آغوشِ تو دورم ناتمامم
تو قرآنی و من سیپارۂ تو

اقبآل اس رباعی میں کہہ رہے ہیں کہ تو سورج اور میں تیرا سیارہ ہوں میں تیرے دیدار سے سراپا نور بن گیا ہوں ۔تیرے آغوش سے دور ہوں نامکمل ہوں ۔تو قرآن ہے اور میں تیرا سپارہ ہوں۔اقبآل کے مطابق انسان اس وقت تک نامکمل ہے جب تک وہ اپنے خالق سے دور ہے اگر یہ دوری ختم ہو جائے تو وہ اس کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ایثآر نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

تو سورج اور میں سیارہ تیرا
مجھے روشن کیا نظارہ تیرا
جو تجھ سے دور ہوں، ہوں نامکمل
تو ہے قرآن، میں سیپارہ تیرا

ترجمۂ مضطر مجاز:

تو سورج اور میں سیارہ تیرا

کہ دمکا دے مجھے نظارہ تیرا
میں تجھ سے دور! سو ہوں نامکمل
تو قرآں اور میں سیپارہ تیرا

ترجمہٗ عبدالرحمٰن طارق:

تو اگر خورشید ہے تو دل مرا سیرہ ہے
میں سراپا نور ہوں، یہ بھی ترا نظارہ ہے
میں تری آغوش سے ہوں دور رہ کرنا تمام
جانئے تجھ کو جو قرآں، دل مرا سیپارہ ہے

مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ ایثارؔ نے نہایت شگفتہ کیا ہے۔ لیکن اقبالؔ کے دوسرے مصرعے کا سب سے بہترین ترجمہ طارق کا ہے: میں سراپا نور ہوں، یہ بھی ترا نظارہ ہے۔ جب کہ دیگر دونوں حضرات کے یہاں محض ترجمانی اور یہ ترجمانی سے تکلف سے پُر ہے۔ ظاہر اسے خوبی تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں آخری مصرعے میں طارق صاحب لڑکھڑا گئے ہیں۔ اقبال کے اتنے واضح اور صاف لفظ ''تو قرآنی'' کو انھوں نے ''جانئے تجھ کو جو قرآں'' کہہ کر بلاوجہ تصنع سے گزارا ہے اور بحر کے مطابق مصرع مکمل کرنے کی جدوجہد میں ترجمے میں فصاحت نہیں پیدا ہو سکی۔ پہلے، تیسرے اور چوتھے مصرعے کے ترجمے میں ایثارؔ اور مجاز برابر برابر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے تراجم میں اصل کا عکس نظر آتا ہے۔

اقبالؔ:

اگر آگاہی از کیف وکمِ خویش
یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے؟
شبِ خود را برافروز از دمِ خویش

اس رباعی میں اقبآل کا پیغام ہے کہ اگر تو اپنے کیف وکم سے واقف ہے تو اپنی اوس سے دریا کو تعمیر کر، اے دل چاند کی گدائی کب تک اپنی رات کو اپنے دم سے روشن کر یعنی اپنی خودی کو مستحکم کر لے تاکہ غیروں کے سہارے سے بے نیاز ہو جائے۔ ایثآر نے اقبآل کے اس پیام کو ترجمہ کے قالب میں یوں ڈھالا ہے:

اگر واقف ہے اپنے بیش وکم سے
تو کر تعمیرِ یم شبنم کے نم سے
اے دل یوں چاند کا محتاج کب تک؟
کر اپنی شب کو روشن اپنے دم سے

ترجمہ مضطر مجاز:

اگر تو ہو گیا آگاہ اپنے کیف سے، کم سے
تو پھر تعمیر کر تو بحر اپنا اپنی شبنم سے
مرے دل، آہ! یہ دریوزگی مہتاب کی کب تک
تو اپنی رات کو چمکا تو چمکا اپنے ہی دم سے

ترجمہ عبدالرحمٰن طارق:

تو سمجھتا ہے اگر اپنا مقامِ کیف وکم
اپنی شبنم ہی سے کر تعمیر اک طوفانِ یم
کب تک اے دل! ہاتھ پھیلائے گا پیشِ ماہتاب
کیوں نہ تیری شب کو روشن کر دے خود تیرا ہی دم

مذکورہ بالا تراجم میں ایثآر نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا۔ بڑی ہی خوبصورتی اور فنی چابکدستی سے ترجمہ یوں کیا ہے کہ ترجمہ کی بجائے طبع زاد کا گماں ہوتا ہے۔ انہوں نے جامع انداز میں ترجمہ کیا ہے اور استفہام متن کو بھی برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مضطر مجاز اور طارق کے تراجم بھی اصل مفہوم تک ضرور پہنچے ہیں لیکن جو روانی دلکشی اور غنائیت ایثآر کے ترجمہ میں نظر آتی ہے ان کے تراجم میں مفقود ہے۔ مثلاً آخری

مصرعہ ''شبِ خود را برافروز از دمِ خویش'' کے ترجمے میں مضطر مجاز اور عبدالرحمٰن نے مفہوم کو مقدم رکھتے ہوئے ترجمانی سے کام لیا جبکہ ایثاؔر کا ترجمہ دیکھیں ''کر اپنی شب کو روشن اپنے دم سے'' ترجمہ میں نہ صرف مفہوم جلوہ گر ہے بلکہ موسیقیت وغنائیت سے ترجمہ عمدہ معلوم ہوتا ہے۔

اقبالؔ:

قبائے زندگانی چاک تا کے؟
چوں موراں آشیاں در خاک تا کے؟
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاش دانہ در خاشاک تا کے؟

اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ کب تک زندگی کا لباس تار تار رکھے گا؟ یعنی کب تک ذلت کی زندگی بسر کرے گا چیونٹیوں کی طرح کب تک خاک میں گھر بناتا رہے گا۔ پرواز کی امنگ پیدا کر اور شاہینی سیکھ کب تک خس و خاشاک میں رزق تلاش کرتا رہے گا۔ مطلب اقبال چیونٹی کی بجائے شاہین کی طرح زندگی بسر کرنے کا پیغام دے رہے ہیں اقبالؔ کے اس پیغام کو ایثاؔر نے نہایت خوبصورتی سے من وعن اپنے ترجمے میں یوں پیش کیا ہے۔

تری ہستی کا دامن چاک کب تک؟
یونہی چیونٹی سا زیرِ خاک کب تک؟
سبق پرواز کا شاہین سے لے
تلاشِ دانہ در خاشاک کب تک؟

مضطر مجاز کہتے ہیں:

قبائے زندگانی چاک کب تک
ارے تیرا نشیمن خاک کب تک

ذرا پر کھول، شاہینی بھی کچھ سیکھ

تلاشِ دانہ در خاشاک کب تک

عبدالرحمٰن طارق نے بھرپور ترجمانی کی ہے:

زندگی کے پیرہن کو ہر گھڑی مت چاک کر

چیونٹی کی صورت نہ مسکن ہم کنارِ خاک کر

خاک میں مت ڈھونڈ دانہ، باز کی رفعت دکھا

ہمت و جرات دکھا اور قلب کو بے باک کر

مذکورہ بالا بند میں ایثؔار اور مضطر مجاز کے ترجمہ تقریباً ایک جیسے اور قریب المعنی ہیں۔ اور ساتھ ہی رواں اور غنائیت سے بھرپور ہیں۔ جبکہ عبدالرحمٰن طارق کا ترجمہ بھی شگفتہ ہے لیکن انہوں نے ترجمانی سے کام لیا ہے۔ مثلاً تیسرے مصرعہ ''بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز'' کا ترجمہ ایثؔار نے یوں کیا ہے ''سبق پرواز کا شاہین سے لے'' جو کہ مضطر مجاز کے ترجمہ ''ذرا پر کھول، شاہینی بھی کچھ سیکھ'' سے زیادہ رواں اور واضح ہے۔ اور تقریباً پورے بند میں یہی کیفیت نمایاں ہے۔

پیامِ مشرق کا دوسرا حصہ ''افکار'' سے موسوم ہے۔ اس میں اقبؔال نے خدا انسان و کائنات کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ یہ نظمیں ہیئتی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ''افکارِ انجم'' سے چند مثالیں پیش ہیں۔ جس میں ایثؔار کے تراجم دیگر مترجمین کے مقابلے فنی معیار پر نہ صرف کھرے اترتے ہیں بلکہ اقبال کے پیام کو بھی بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اقبؔال:

شنیدم کو کبے با کو کبے گفت

کہ در بحریم و پیدا ساحلے نیست

سفر اندر سرشتِ ما نہادند

ولے ایں کارواں منزلے نیست

اقبالؔ کی اس نظم میں ستاروں کے خیالات کونظم کیا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک ستارے کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ہم ایسے سمندر ہیں جس کا کنارہ اوجھل ہے خدا نے ہماری سرشت میں سفرلکھا ہے لیکن اس کارواں کی کوئی منزل نہیں ہے۔ایثارؔ نے اس خوبصورت نظم کا ترجمہ نہایت عمدہ کیا ہے ملاحظہ ہو:

سنا ہے تارا تارے سے یہ بولا
ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے
سفر ہے اپنی فطرت کا تقاضا
مگر اپنی کوئی منزل نہیں ہے

ترجمۂ مضطرمجاز:

کہا تارے نے اک تارے سے اک دن
ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے
سفر لکھا ہے فطرت میں ہماری
مگر اس کی کوئی منزل نہیں ہے

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

ایک تارا دوسرے تارے سے بولا باملال
ہم ہیں ایسے بحر میں جس کا کوئی ساحل نہیں
فطرت انجم میں ہے، روزِ ازل ہی سے سفر
آہ اپنے کارواں کی کوئی بھی منزل نہیں

مذکورہ بالا تراجم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایثارؔ کا ترجمہ میں اصل کا لطف آتا ہے۔مضطرمجاز نے بھی تقریباًاقبال کے مفہوم کو پوری طرح اپنے ترجمہ میں برتا ہے۔جبکہ عبدالرحمٰن طارق نے ترجمہ کے دوران اصل معنی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تخیل کا بھی استعمال کیا ہے۔جیسے ''سفر اندر سرشتِ مانہادند'' کا ترجمہ ''فطرت انجم میں ہے، روزِ ازل ہی سے سفر'' کیا ہے۔اسی طرح چوتھا مصرعہ'' والے

ایں کارواں منزلے نیست'' کا ترجمہ '' آہ اپنے کارواں کی کوئی بھی منزل نہیں'' کیا ہے۔
اقبالؔ:

اگر انجم ہمانستے کہ بوداست
ازیں دیرینہ تابیہا، چہ سوداست
گرفتارِ کمندِ روزگاریم
خوشا آں کس کہ محروم وجوداست

اقبالؔ ان اشعار میں کہہ رہے ہیں کہ اگر ستارے جیسے تھے ویسے ہی ہیں تو اس سدا کی چمک دمک کا کیا حاصل ہے۔ہم زمانے کی کمند میں جکڑے ہوئے ہیں اچھا ہے وہ جو وجود سے محروم ہے۔اقبالؔ کے اس خیال کا ترجمہ ایثارؔ نے یوں کیا ہے:

اگر انجم وہی ہیں جو تھے پہلے
بھلا کیا فائدہ تابندگی سے
گرفتارِ کمندِ دہر ہیں ہم
وہ خوش محروم ہے جو زندگی سے

ترجمہ مضطر مجاز:

اگر تارے یہی ہیں جو کہ ہم ہیں
تو اس دیرینہ تابی سے ملا کیا
گرفتارِ کمندِ وقت ہیں ہم
خوشا جس نے وجود اپنا نہ پایا

ترجمہ عبدالرحمٰن طارق:

ہستیِ انجم ہی کیا، جب لرزہ براندام ہوں
کہنہ تابی میں نظر آتا ہے کوئی سود

ہم ہیں ہر لحہ گرفتارِ کمندِ روزگار

خوش نصیب وخوش نوا ہیں جو ہیں محرومِ وجود

مذکورہ بالا تراجم میں ایثآر نے ایجاز واختصار کے پیرایۂ میں اصل کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ ہر مصرعہ کا ترجمہ نہایت شگفتہ ہے۔مثلاً ''اگر انجم ہمانستے کہ بوداست'' کا ترجمہ ''اگر انجم وہی ہیں جو تھے پہلے'' اصل کا عکس ہے۔مضطر مجاز نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ''اگر تارے یہی ہیں جو کہ ہم ہیں'' یہ ذہن پر گراں گزرتا ہے جبکہ عبدالرحمٰن طارق نے ترجمانی سے کام لیتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ''ہستئی انجم ہی کیا، جب لرزہ بر اندام ہوں'' جبکہ چوتھے مصرعہ کے ترجمہ میں طارق نے اضافی الفاظ ''خوش نصیب وخوش نوا'' استعمال کئے ہیں۔ان تینوں تراجم میں ایثآر کا ترجمہ نہایت عمدہ اور رواں ہے۔

پیامِ مشرق کا تیسرا حصہ ''مئے باقی'' غزلیات پر مشتمل ہے۔یہ حصہ پیامِ مشرق کا دلکش ترین حصہ ہے۔اقبال کی عظمت کا دارومدار اگرچہ ان کی غیر فانی نظموں پر ہے لیکن غزل میں بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔ پیامِ مشرق کی یہ غزلیات ان کی مخصوص فلسفیانہ افکار کے پیغام کی حامل ہیں۔

اقبآل:

در بود ونبودِ من اندیشہ گمانہا داشت

ازعشق ہویدا شد، این نکتہ کہ ہستم من

در دیر نیا زمن ، در کعبہ نمازِ من

زنار بدوشم من ، تسبیح بدستم من

سرمایہ دردِتو، غارت نتواں کردن

اشکے کہ ز دل خیزد در دیدہ شکستم من

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

از بادۂ شوقِ تو ہشیارم ومستم من

ترجمۂ ایثار:

ہستی کی جو بات آئی، تھی عقل تردد میں
یہ نکتہ کہ ہوں میں بھی خود عشق نے سمجھایا
مندر میں پجاری میں، مسجد میں نمازی ہوں
زنار ہے کندھے پر اور ہاتھ میں ہے مالا
ہے درد کا سرمایہ ضائع نہیں کر سکتے
دل سے جو اٹھے آنسو جذب آنکھ میں کر ڈالا
ہشیار بھی بیخود بھی تیری مئے الفت سے
باتوں میں ہوں فرزانہ، کردار میں دیوانہ

ترجمۂ مضطر مجاز:

میرے بود و نبود میں اندیشے نے گماں کے پرے جمائے
عشق سے میں ہوں، ہوا ہویدا، عشق سے راز یہ پایا میں نے
دیر میں ناز و نیاز ہے میرا اور کعبے میں مری نمازیں
ہاتھ میں اک تسبیح کو تھاما اور زنار رگھمایا میں نے
تیرے درد کے سرمائے کو غارت کرنا ٹھیک نہیں ہے
دل سے جو بھی آنسو امڈا، آنکھوں ہی میں چھپایا میں نے
فرزانہ گفتار سے اپنی اور عمل سے دیوانہ ہوں
مستی میں ہشیار رہوں، ایسا بادۂ شوق چڑھایا میں نے

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

تھا میری ہی ہستی پر اندیشے کو اک شک سا
ہے عشق سے یہ ثابت ہستی مری پیدا ہے
کعبے میں نمازیں ہیں اور دیر میں بھی سجدے

زنار بھی رکھتا ہوں، سبحے سے بھی رشتہ ہے

میں ما یہ غم تیرا غارت نہیں کر سکتا

جودل سے اٹھا آنسو، وہ آنکھ میں توڑا ہے

گفتار میں فرزانہ، دیوانہ عمل میں ہوں

ہوں مست تری مے سے،اور ہوش بھی پایا ہے

اقبال کی اس خوبصورت غزل کا تینوں مترجمین نے اپنے تئیں بہتر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضطر مجاز اور عبدالرحمٰن طارق نے زیادہ تر ترجمانی کی ہے۔لیکن اس ترجمانی میں متن کے مفہوم کو مقدم رکھنے کی کوشش کی ہے۔مضطر مجاز نے بجائے لفظی ولغوی طور پر ترجمہ کرنے کے متن کے مفہوم کی عکاسی کی ہے لیکن ترجمہ روانی وغنائیت جیسے عناصر سے مفقود نظر آتا ہے۔مثلاً ''اشکے کہ زدل خیزد در دیدہ شکستم من'' کا ترجمہ ''دل سے جوبھی آنسو امڈا، آنکھوں ہی میں چھپایا میں نے'' کیا ہے وہیں اس کا ترجمہ عبدالرحمٰن طارق نے ''جو دل سے اٹھا آنسو، وہ آنکھ میں توڑاہ'' کیا ہے۔اس ترجمہ میں '' آنکھ میں توڑا'' یہ ترجمہ گراں گزرتا ہے۔اور ترجمے میں تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔اسی مصرعہ کا ترجمہ ایثار نے نہایت شگفتہ'' دل سے جواٹھے آنسو جذب آنکھ میں کرڈالا'' کیا ہے۔اس کے علاوہ مضطر مجاز اور عبدالرحمٰن طارق کے ترجمے میں مصرعے طویل اور پیچیدہ ہیں۔نیز بحروں کی طوالت پر نثر کا گمان ہوتا ہے جبکہ اصل مصرعے مختصر اور دلکش ہیں۔مثلاً '' در بود ونبودِ من اندیشہ گمانہا داشت'' کا ترجمہ مضطر مجاز نے ''میرے بود ونبود میں اندیشے نے گماں کے پرے جمائے'' کیا ہے جس میں نثر کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔اس کے برعکس ایثار کا ترجمہ دلکش ہے۔انہوں نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اصل متن کی مجموعی فضا کو ترجمے میں مکمل طور پر گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور ساتھ ہی ان کا ترجمہ رواں دواں اور غنائیت وموسیقیت سے لبریز ہے۔مثلاً اس غزل کے آخری دو اشعار کے ترجمے میں نہ محض اصل کا عکس پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ان پر طبع زاد کا گماں ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

ہے درد کا سرمایہ ضائع نہیں کر سکتے
دل سے جو اٹھے آنسو جذب آنکھ میں کر ڈالا
ہشیار بھی بیخود بھی تیری مئے الفت سے
باتوں میں ہوں فرزانہ، کردار میں دیوانہ

ترجمہ ایک پیچیدہ، سخت اور جان کنی کا کام ہے۔ اور پھر شعر کا شعر میں مترادفات تلاش کرنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس میں شاعر کی ذہانت، فطانت فنِ عروض کی مہارت اور محنت شاقہ ہی کام آتی ہے۔ کلام اقبال کے تراجم کے دوران تقریباً ہر مترجم کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تینوں ہی مترجمین نے دلکش ترجمہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اقبالؔ:

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن
یکتائی و بسیاری، پنہائی و پیدائی
اے جانِ گرفتارم، دیدی کہ محبت چیست
در سینہ بنا سائی، از دیدہ بروں آئی

ترجمہ ایثارؔ:

اسرارِ ازل ڈھونڈے؟ دیکھ اپنی حقیقت ہی
تو کثرت و وحدت بھی، پنہاں بھی ہے پیدا بھی
معلوم اے میری جاں! ہوتی ہے محبت کیا؟
تو گھٹتی تھی سینہ میں آنکھوں سے نکل آئی

ترجمۂ مضطر مجاز:

اسرارِ ازل ڈھونڈے، ڈال ایک نظر خود پر
یکتائی و بسیاری، پنہائی و پیدائی

اے جانِ حزیں دیکھا کیا چیز محبت ہے
سینے میں نہ چین آیا، آنکھوں سے نکل آئی

ترجمہ عبدالرحمٰن طارق:

اسرارِ ازل چاہے، اپنے پہ نظر وا کر
یکتائی و بسیاری ! پنہائی و پیدائی
اے جان تو سمجھی بھی مفہومِ محبت کو
جب سینے میں گھبرائی، آنکھوں سے نکل آئی

ان اشعار میں اقبال کہہ رہے ہیں کہ تو ازل کے راز جاننا چاہتا ہے تو خود پر نظر ڈال۔ایک بھی تو ہے، ہزار بھی تو ہے ظاہر بھی تو ہے نہاں بھی تو ہے۔یعنی صفاتِ حق خود تجھ میں جلوہ گر ہیں۔اے میری جان گرفتار تو نے دیکھا کہ محبت کیا ہے؟ اب تو سینے میں نہیں سماتی بلکہ آنکھوں کے راستے باہر آ رہی ہے۔اقبالؔ کے اس خوبصورت پیغام کو عمدگی سے تقریباً تینوں ہی مترجمین نے اپنے ترجمے میں پیش کیا ہے۔لیکن یہاں بھی ایثارؔ نے مقابلتاً بازی مار لی ان کا ترجمہ نہ صرف اصل سے قریب ہیں بلکہ شگفتہ اور رواں ہیں۔ایک ایک مصرعہ کے ترجمے میں انہوں نے اقبال کے پیغام کا حق ادا کر دیا ہے۔

''نقشِ فرنگ''اس میں اقبالؔ اہل یورپ کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اگر مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے ہو تو عقل کی بجائے عشق کو اپنا رہنما بناؤ۔

ازمن اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگرمی زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے صبا میری طرف سے مغرب کے دانا سے کہنا کہ عقل جتنا پر کھولتی ہے پھنستی چلی

جاتی ہے۔ یہ برق کو جگر پر لیتا ہے وہ اسے قابو میں کرتی ہے۔ عشق میں عقل سے زیادہ طاقت ہے۔ ایثآر نے اس شعر میں اصل کے مفہوم کو پیش کرتے ہوئے ترجمہ اس طرح کیا ہے:

دے صبا مجھ سے یہ دانائے فرنگی کو پیام
پر کشائی سے خرد ہو گی گرفتار زیاد
یہ جگر پیش کرے، برق کو وہ رام کرے
عشق ہے عقلِ فسوں گر سے جگردار زیاد

مضطر مجاز کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

کہہ دے جا کر دانائے افرنگ سے آج اے باد، صبا!
عقل کے جتنے پر کھلتے ہیں ہو جاتی ہے اتنی اسیر
برق یہ اپنے جگر میں سموئے اور وہ اس کو رام کرے
عشق ہے عقلِ فسوں پیشہ سے بڑھ کے جگردار و خود گیر

عبدالرحمٰن نے اقبال کی پیام کو ترجمے میں یوں سمویا ہے:

اے صبا لے جا مرا پیغام یہ سوئے فرنگ
جب سے پر کھولے خرد نے، وہ مقید تر ہوئی
عشق بجلی دل پہ لیتا ہے، خرد کرتی ہے رام
عقل پر مکر و فسوں سے عشق ہے بڑھکر جری

مندرجہ بالا تینوں ترجمے دلکش اور اصل کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ تینوں مترجمین کا طریقہ منفرد ہے لیکن سبھی نے اقبال کے پیغام کو اپنے تراجم میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دوسرے مصرعے ''عقل تا بال کشوداست گرفتار تر است'' کا ترجمہ ایثآر نے ''پر کشائی سے خرد ہوگی گرفتار زیاد'' کر کے جہاں کمال دکھایا وہیں مضطر مجاز نے ''عقل کے جتنے پر کھلتے ہیں ہو جاتی ہے اتنی اسیر'' کہہ کر بھرپور ترجمانی کی۔ اسی ضمن میں عبدالرحمٰن طارق کا ترجمہ بھی ''جب سے پر کھولے خرد نے، وہ مقید تر ہوئی'' دلچسپ ہے۔ ان تراجم میں گویا

نگینے جڑے ہوئے ہیں جس کی چمک دمک سے قاری متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اقبالؔ:

می خورد ہر ذرۂ ما پیچ و تاب
محشرے در ہر دمِ ما مضمر است
با سکندر خضرؑ در ظلمات گفت
مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

ترجمۂ ایثارؔ:

ذرے ذرے میں ہمارے اضطراب
حشر در داماں ہے اپنی ہر گھڑی
یہ سکندر کو بتایا خضرؑ نے
ہے گراں موت اور گراں تر زندگی

ترجمۂ مضطرمجاز:

دیکھ ہر ذرہ ہمارا کھا رہا ہے پیچ و تاب
اف یہ ہر اک سانس جیسے اک قیامت کی گھڑی
خضر نے ظلمات میں اک دن سکندر سے کہا
موت مشکل ہے پہ مشکل اور بھی ہے زندگی

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

جسم کا ہر ذرہ گویا کھا رہا ہے پیچ و تاب
میرے ہر دم میں نہاں ہے محشرِ درد و اثر
ایک دن ظلمات میں بولا سکندر سے خضرؑ
مرگ ہے دشوار، لیکن زندگی دشوار تر

یہاں اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہمارا ذرہ ذرہ بل کھاتا رہتا ہے اور ہماری ہر سانس میں ایک محشر چھپا ہے۔ خضرؑ نے ظلمات میں سکندر سے یہ کہا کہ موت دشوار ہے لیکن زندگی اس سے دشوار تر ہے۔ ان اشعار کو نہایت خوبصورتی سے تینوں مترجمین نے ترجمے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ایثارؔ پہلے مصرعے میں ''پیچ و تاب'' کو ''اضطراب'' سے تعبیر کیا ہے جو کہ مناسب ہے۔ تیسرے مصرعے میں لفظ ''ظلمات'' کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن پھر بھی مطلب واضح ہے۔ مجموعی طور پر ایثارؔ کے ترجمے میں سادگی وسلاست نمایاں ہے۔ تاہم انہوں نے فکرِ اقبال کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ مضطر مجاز نے ترجمے میں مفہوم کو مقدم رکھتے ہوئے ترجمہ کیا اور اضافی الفاظ استعمال کئے ہیں جیسے'' دیکھ، اف وغیرہ۔ عبدالرحمن طارق نے ترجمہ کرتے وقت اقبالؔ کی فکری روح کو پیشِ نظر رکھ کر اشعار کے معانی اور مفاہیم کو اولیت دی ہے۔ چنانچہ ترجمانی کے باوجود بھی یہ ترجمہ پر کیف ودلآویز ہے۔

اقبالؔ:

چشم را بینائی افزاید سہ چیز
سبزہ وآبِ روان وروے خویش
کالبد را فربہی می آورد
جامۂ قز، جانِ بےغم بوئے خوش

ترجمۂ ایثارؔ:

تین چیزیں ہیں بصارت کو مفید
سبزہ وآبِ رواں وروے خوش
جسم کو ملتی ہے ان سے فربہی
ریشمی جامہ، بشاشت، بوے خوش

ترجمۂ مضطر مجاز:

تین چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے بینائی میں
یعنی سبزہ، بہتا پانی اور کسی کا روئے خوش

تین یہ چیزیں یونہی کرتی ہیں فربہ جسم کو
ریشمی کپڑا،طرب انگیزیاں،اور بوئے خوش

ترجمۂ عبدالرحمٰن طارق:

تین چیزیں ہیں بصارت کے لئے بے حد مفید
اور وہ ہیں سبزہ وآبِ رواں وروئے خوش
تین چیزیں جسم میں کرتی ہیں پیدا فربہی
اور وہ ہیں جامۂ قز، جانِ بےغم، بوئے خوش

ان اشعار میں اقبال کہہ رہے ہیں کہ تین چیزیں آنکھ کی روشنی بڑھاتی ہیں،سبزہ، بہتا پانی اوراچھی صورت۔اسی طرح موٹاپا تین چیزوں سے ہوتا ہے وہ ہیں ریشمی کپڑا، بےفکر دل اورخوشبو۔ایثآر کا ترجمہ مثالی ہےاورترنم وموسیقیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔''جانِ بےغم'' کے لئے نہایت خوبصورت اصطلاح ''بشاشت'' استعمال کیا ہے جو پر کیف ہے۔مضطر مجاز اورعبدالرحمٰن طارق بھی اقبال کی فکروفن کی گرفت میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اقبآل کی شاعری تغزل وترنم اورشوکت الفاظ کا وہ حسین مجموعہ ہے جس میں بندش کی چستی،خیالات وافکار کی بلندی و گہرائی،فلسفہ وتصوف کی آمیزش سب کچھ موجود ہے۔اقبال کے فلسفیانہ خیالات کومنظوم صورت میں پیش کرنا ایک مشکل امراورایک بڑی اہم ذمہ داری تھی۔ جسے سید احمد ایثآر،مضطر مجاز اورعبدالرحمٰن طارق نے بخوبی نبھایا ہے۔لیکن خصوصاً ایثآر کے تراجم فکری وفنی اعتبار سے قابلِ ستائش ہیں۔ذیل میں ایثآر کے کئے گئے اسرارِ خودی کا ترجمہ اورجسٹس ایس اے رحمٰن کے ترجمہ ''ترجمانِ اسرار'' کا تقابلی جائزہ پیش ہے۔

اسرارِخودی:

''اسرارِخودی''،علمی ادب کے شاہکاروں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔یہ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف

ہے جس کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔اس مثنوی میں اقبال نے اپنے افکار وتصورات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔اس میں انہوں نے ایک ایسا ضابطۂ حیات پیش کیا ہے جس کا محور اور مرکز خودی ہے۔خودی ان کے فلسفے کا نقطۂ عروج ہے۔اقبال کا نظریہ خودی اسلامی نظریات سے ماخوذ ہے جس کا سرچشمہ قرآن مجید اور احادیثِ رسول ہیں۔اس میں انہوں نے قرآنی تعلیمات کی بنا پر فلسفہ کو بیان کیا ہے اور اسی کے ذریعے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور اسے عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اقبال کے نزدیک انسانی کامیابی کا انحصار خودی کی پرورش وتربیت پر ہے کیونکہ خودی کے ذریعے انسان حق و باطل کی جنگ میں سرخرو ہوسکتا ہے۔اگر خودی پائیدار ہوتو فقر میں بھی بادشاہی کی شان ہوتی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ متحرک نظر آنے لگتا ہے۔اسرارِ خودی کے منظوم ترجمے کے مطالعے سے ایثآر صاحب کی نہ صرف شاعرانہ عظمت وانفرادیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بہ اعتبارِ زبان وبیان اس ترجمے میں نئی روح پھونک دی ہے۔اس منظوم ترجمے کی زبان صاف، سادہ اور بیان نہایت رواں ہے۔مترجم کتنا ہی لائق اور قابل کیوں نہ ہو جب تک ان زبانوں سے پوری طرح واقفیت نہ رکھتا ہو جس زبان کے فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تب تک ترجمے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔اسرارِخودی کے منظوم ترجمے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایثآر فارسی واردو زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں اور دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔انہوں نے اسرارِخودی کے منظوم تراجم میں مثنوی کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ان کے تراجم اصل متن سے نہ صرف قریب تر ہیں بلکہ سلاست سے بھی پر ہیں۔اسرارِخودی کا یہ اردو منظوم ترجمہ اردو کے دیگر منظوم ترجموں میں منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

اسرارِخودی کے ترجمہ میں ایثآر کے علاوہ جسٹس ایس اے رحمٰن، عبدالرشید فاضل، عصمت جاوید کے ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔یہاں ایثآر اور جسٹس ایس اے رحمٰن کے تراجم کے مابین تقابلی مطالعہ پیش ہے۔''در بیان ایں کہ خودی از عشق ومحبت استحکام گیرد'' سے چند مثالیں پیش ہیں:

اقبآل:

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

ا ز محبت می شو د پا ئند ہ تر
زندہ تر ،سوزندہ تر ،تابندہ تر
ا ز محبت ا شتعا لِ جو ہر ش
ا ر تقا ئے ممکنا تِ مضمر ش
عشق راا ز تیغ وخنجر با ک نیست
اصل عشق از آب وبادوخاک نیست

ترجمۂ ایثار:

مرکزِنوری جسے کہئے خودی
تن میں ہے جیسے شرارِزندگی
عشق سے ہوتی ہے وہ پائندہ تر
زندہ تر ،سوزندہ تر ،تابندہ تر
اس کے جوہر کومحبت سے جلا
اور صلاحیت کو اس کی ارتقا
تیغ وخنجر سے نہیں ہے اس کو باک
وہ نہیں ہے اصل سے بادآب وخاک

ترجمۂ رحمٰن:

وہ نقطہ نور کا جسکوخودی کہتے ہیں دانشور
شرر ہے زندگانی کا ہماری خاک کے اندر
محبت سے یہ کچھ پائندگی میں اور بڑھتی ہے
چمک میں،سوز میں اور زندگی میں اور بڑھتی ہے
چمک اٹھتا ہے جوہر اسکا تاثیر محبت سے
ابھرتی ممکنات اسکی ہیں تنویر محبت سے

ڈرا سکتے نہیں ہیں عشق کو تلوار اور خنجر
نہیں مٹی سے، پانی سے، ہوا سے، عشق کا گوہر

مذکورہ بالا ترجمے میں ایثآر نے اپنی مہارت کے جوہر خوب نمایاں کیے ہیں۔کامیاب ترجمہ کرنے کی خصوصی مہارت نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا ہے۔اسرارِ خودی میں اقبال کا فکر وفن اپنی انتہائی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔اس فکری رفعت اور فنی حسن کو ترجمے میں برقرار رکھنا بڑا دشوار کام تھا لیکن ایثآر نے اس مشکل کام کو نبھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ پہلے مصرعے ''نقطۂ نوری'' کی خوبصورت مترادف ''مرکزِ نوری'' کا استعمال عمدہ ہے۔جبکہ ایس اے رحمٰن کے ترجمہ میں دانشور لفظ اضافی ہے۔دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے ''زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر'' کو ترجمے میں جوں کا توں رکھا ہے جبکہ ایس اے رحمٰن نے ترجمانی کی ہے ''چمک میں ،سوز میں اور زندگی میں اور بڑھتی ہے''۔آخری شعر میں ایثآر نے لفظ ''عشق'' کو نظر انداز کیا ہے لیکن مفہوم پوری طرح واضح ہے۔جبکہ رحمٰن نے پورے شعر کا ترجمہ نہایت شگفتہ کیا ہے۔ایس اے رحمٰن نے ترجمے میں بعض مقامات پر کامیابی حاصل کی ہے جیسے ''ازمحبت اشتعالِ جوہرش'' کا ترجمہ ''چمک اٹھتا ہے جوہر اسکا تاثیر محبت سے'' بہت خوب کیا ہے۔

اقبآل:

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشمِ نوحؑ، قلبِ ایوبؑ طلب

ترجمۂ ایثآر:

بن کے عاشق کر طلب محبوب کی
چشمِ نوح وخوئے صبر ایوبؑ کی

ترجمۂ رحمٰن:

سبق پڑھ عاشقی کا، ہو کسی محبوب کا طالب
ہو چشمِ نوح کا طالب، دل ایوب کا طالب

اس ترجمہ میں ایثآر نے دوسرے مصرعہ میں قلبِ ایوب کی جگہ صبرِ ایوب استعمال کیا ہے۔تقریباً دونوں ہی ترجمہ اصل سے قریب ہیں۔ایثآر نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ترجمہ کیا وہیں رحمٰن نے لفظی ترجمانی کی ہے۔''در بیان ایں کہ خودی از سوال ضعیف میگردد'' کے ابتدا سے چند اشعار کا ترجمہ دیکھیں:

اقبآل:

اے فراہم کردہ از شاہاں خراج
گشتۂ رو بہ مزاج از احتیاج
خستگی ہائے تو از ناداری است
اصلِ دردتو ہمیں بیماری است
می ر باید رفعتِ فکرِ بلند
می کشد شمعِ خیال ارجمند

ترجمۂ ایثآر:

اے کہ تو لیتا تھا شاہوں سے خراج
اپنی حاجت سے ہوا روبہ مزاج
تیری ناداری ہے وجہ خستگی
تیری بیماری کا باعث ہے یہی
تجھ سے لے لیگی تری فکرِ بلند
گل کرے شمعِ خیالِ ارجمند

ترجمۂ شیخ عبدالرحمٰن:

زمانہ وہ بھی تھا شیروں پہ جب کرتا تھا تو شاہی
ضرورت نے مگر تجھکو سکھا دی خوئے روباہی
کئے دیتی ہے تجھکو خستہ و درماندہ ناداری
ہے تیرے درد و غم کا باعث اصلی یہ بیماری

یہ فکرِ آسماں پیما سے رفعت چھین لیتی ہے
یہ قندیل خیالِ نو سے طلعت چھین لیتی ہے

مترجم عبدالرحمٰن نے ان اشعار کا ترجمہ جس انداز سے کیا ہے اس سے اقبالؔ کے پیام کو سمجھنے میں حائل فارسی زبان کی دقت دور ہوگئی ۔انہوں نے اقبال کے فکر و معانی سے انصاف کرنے کی سعی کی ہے۔ترجمہ کرتے وقت انہوں نے نقشِ اول کی خصوصیت کو پیش نظر رکھا۔اس میں ترجمہ کی دل کشی کم سہی لیکن مفہوم کی ادائیگی بھر پور ہے۔اس ضمن میں حتی الوسیع یہ کوشش کی ہے کہ ایک شعر کا مفہوم ایک ہی شعر میں بیان ہو۔ترجمے میں اصل کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اردو میں ان کے مماثل اسلوبِ بیان اپنایا ہے۔اس کے برعکس ایثارؔ نے اسرارِ خودی کے منظوم ترجمے کے دوران کئی جگہوں پر ضرورتِ شعری اور ترجمہ کی مشکلات کے باعث ایک یا وہ الفاظ کے ترجمہ کے علاوہ پورے شعر کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔چند مثالیں پیش ہیں۔

اقبالؔ:

باز برخوانم زفیضِ پیرِ رومؒ
دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

ترجمۂ ایثارؔ:

پھر سناؤں میں فیوضِ پیرِ رومؒ
دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

ترجمۂ رحمٰن:

ملا ہے فیض رومی سے بصیرت کا مجھے حصہ
میں پھر پڑھ لوں کتاب علم کے سب راز سربستہ

اقبالؔ:

حسنِ شیریں عذرِ دردِ کوہ کن

نافۂ عذ رِصد آہوئے ختن

ترجمۂ ایثارؔ:

حسنِ شیریں عذ رِدر دِکوہ کن
نافہ اک عذر صد آہوئے ختن

ترجمۂ رحمٰن:

غم فرہاد کا ہے عذر حسن دلکش شیریں
صد آھوئے ختن کا عذر ھے اک نافۂ مشکیں

اقبالؔ:

می شود از بہرِ اغراض وعمل
عامل ومعمول واسباب وعلل

ترجمۂ ایثارؔ:

بنتی ہے خود بہرِ اغراض وعمل
عامل ومعمول واسباب وعلل

ترجمۂ رحمٰن:

یہ پھر لیتی ہے کیا کیا روپ سرگرم عمل ھوکر
عیاں ہے عامل ومعمول واسباب وعلل ھوکر

ایثارؔ نے دوسرے مصرعے کو جوں کا توں رکھا ہے جبکہ رحمٰن نے تشریحانہ انداز اپنایا ہے۔ ''در شرحِ اسرارِ اسمائے علیؓ مرتضیٰ'' سے چند اشعار دیکھیں:

اقبالؔ:

مسلمِ اول شہِ مرداں علیؓ

عشق راسرمایۂ ایماں علیؑ
از ولائے دود مانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام
نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چو بو آوارہ ام

ترجمۂ ایثاؔر:

مسلم اول شہِ مرداں علیؑ
عشق کو سرمایۂ ایماں علیؑ
عشقِ اہل بیت سے میں زندہ ہوں
دہر میں مثلِ گہر تابندہ ہوں
مثلِ نرگس عاشقِ نظارہ ہوں
باغ میں مانندِ بو آوارہ ہوں

ترجمۂ رحمٰن:

علی المرتضٰی وہ مسلم اول شہ مرداں
ہے جسکی ذات اقدس عشق کو سرمایۂ ایماں
مجھے اسکے گھرانے کی محبت زندہ رکھتی ہے
در شہوار کی صورت مجھے تابندہ رکھتی ہے
میں نرگس ہوں، بنا ہوں سر بسر میں شوق نظارہ
خیابان علی میں ہوں مثال بو میں آوارہ

ایثاؔر نے اس منظوم ترجمے میں لطافت و دلآویزی کا اہتمام کیا ہے۔ایثاؔر کا ترجمہ اصل سے قریب ہے اس کا طرز بیان شگفتہ وخوشنما ہے۔ایثاؔر نے اس ترجمے میں نہ صرف فارسی الفاظ کی جگہ موزوں اردو

الفاظ کا استعمال کیا ہے بلکہ الفاظ کی شوخی وتراکیب کی خوش آہنگی پر بھی توجہ دی ہے ۔مثلاً وارفتۂ نظارہ کو ایثؔار نے عاشقِ نظارہ کہا تو عبدالرحمٰن نے شوقِ نظارہ کہا۔عبدالرحمٰن کے ترجمے اصل سے قریب ہیں انہوں نے بھی اقبال کے پیغام کو ترجمہ میں ڈھالنے کی بھرپور سعی کی ہے۔لیکن جو روانی اور بے ساختگی ایثؔار کے ترجمے میں نظر آتی ہے وہ عبدالرحمٰن کے ترجمے میں کم نظر آتی ہے۔اس مجموعی تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان تمام تراجم میں ایثؔار کے تراجم اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ان تراجم میں انہوں نے متن کے مفہوم،تاثر کا بھرپور خیال رکھا ہے۔غیر ضروری و بے محل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے اور اقبال کے پیغام کو من وعن اپنے تراجم میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے یہ تراجم افکارِ اقبال کی تفہیم میں بڑی حد تک ممد و معاون ہیں۔

حوالے

۱۔ مشرق ومغرب کے تنقیدی تصورات کی تاریخ، پروفیسر محمد حسن، ص۲۹۲

۲۔فنِ موازنہ کا ارتقا: پروفیسر احتشام احمد ندوی، ص۳۹

۳۔فنِ موازنہ کا ارتقا: پروفیسر سید احتشام ندوی، ص۱۴۶

۴۔تنقیدی دبستان، ڈاکٹر سلیم اختر، ص۷۸

ماحصل

تخلیقی ذہن بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔اس کے لئے فیضانِ سماوی لازمی شرط ہے۔اکثر و بیشتر یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک فنکار علم و ادب کی کسی ایک شاخ یا کسی ایک صنف ہی میں اپنی فنکارانہ صلاحیت اجاگر کر پاتا ہے،لیکن ہماری ادبی تاریخ میں کچھ ایسے عبقری ذہن کے مالک شعراء و ادبا گزرے ہیں جنہوں نے بیک وقت مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اردو ادب میں سید احمد ایثاؔر کا شمار بھی ایسے فنکاروں میں ہوتا ہے۔ایثاؔر کی بے پایاں فکر نے اپنے اظہار کے لئے بہت سارے وسیلے ڈھونڈے ہیں۔کہیں غزلوں کی محفل سجی ہے تو کہیں نظموں کی بزم آرائیاں ہیں،کہیں رباعیات اور قطعات اپنی جولانیاں دکھارہے ہیں تو کہیں نثری قالب میں مضامین اپنی جانب ملتفت کررہے ہیں اور سب سے بڑھ کر بحیثیت ترجمہ نگار وہ اردو ادب میں ایک منفرد مقام پر نظر آتے ہیں۔ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے مفصل تحقیقی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ذہین،وسیع المطالعہ ادیب،روشن خیال شاعر اور معتبر مترجم ہیں۔انہوں نے اپنی علمی و ادبی ذوق وشوق اور ذاتی دلچسپی کے بل بوتے پر اپنی عملی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔اور شعر و ادب سے اپنا رشتہ استوار کیا۔

ایثاؔر نے شعر و شاعری کے سلسلے میں دورانِ طالب علمی ہی سے اپنے اساتذہ سے حتیٰ المقدور استفادہ کیا۔ایثاؔر کو نظم و نثر میں یکساں قدرت حاصل ہے لیکن ان کا جوہر صلاحیت سب سے زیادہ شاعری کے میدان میں چمکا۔ان کی شاعری اپنے موضوعات کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں۔وہ شاعری کو نہ تو وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی لفظی بازی گری کا مشغلہ۔ان کے نزدیک شعر و شاعری ایک ایسی کاوش کا نام ہے جس سے قوم کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جائے۔وہ شاعری کو ایک اعلیٰ و ارفع اور عظیم تر مقصد کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ایثاؔر خصوصی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔غزل میں ان کی شاعرانہ صلاحیتیں پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں۔غزل جس رمز و ایمائیت کی متقاضی ہوتی ہے اس کا جلوہ صد رنگ ایثاؔر کی غزلوں میں نظر آتا

ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خاموش نظر آؤں تو خاموش نہ سمجھو
دامانِ تخیل میں گہر رول رہا ہوں

مشتِ گل اور خیالات میں وسعت کتنی
کوئی چھونے بھی نہ پائے گا کنارا میرا

اصل ہے تو جہاں فقط عکس ترے جمال کا
پیشِ نظر ہے تو ہی تو عالمِ چار سو میں بس

جہاں دار العمل ہے کام کرتے جایئے
دامنِ مقصود اپنا آپ بھرتے جایئے

دو عالم کی حقیقت فاش ہو سکتی ہے دم بھر میں
ذرا خود آشنا ہو جا کہ تو ہی رازِ ہستی ہے

ایثآر نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی اپنی قلم کے جوہر دکھائے۔ ان کی نثری تحریروں میں کلاسیکی اسالیب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان کی اہم خوبی ان کا اختصار اور استدلال ہے۔ مختصر جملوں کی سادگی ان کی تحریر کا نمایاں وصف ہے۔ وہ سیدھے سادے لفظوں میں بے تکلفانہ اور بے ساختہ لکھتے ہیں۔ ان کی عبارت چست اور رواں ہوتی ہے۔ جس موضوع پر لکھتے ہیں طرزِ تحریر بھی ویسا ہی اختیار کرتے ہیں جو موضوع سے ہم آہنگ ہو۔ مثال کے طور پر منظوم ترجموں کے مقدموں کی تحریروں میں وہ ایک

محقق کی شان لئے نظر آتے ہیں اور مختلف موضوعات پر مشتمل ادبی مضامین میں سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ برجستگی سے کام لیتے ہیں وہیں شگفتہ نگاری کے جوہر ان کی خودنوشت ''سراغ زندگی'' میں بھی نہایت خوبی سے کھلے ہیں۔ گویا ان کی تحریریں ادبی چاشنی سے پر ہوتی ہیں۔ کسی بھی مصنف یا قلم کار کی سب سے بڑی کامیابی اس بات پر منحصر کرتی ہے کہ وہ شروع ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لے۔ ایثار کی اپنے موضوع پر گرفت اتنی ہوتی ہے کہ پہلے جملے ہی سے قاری ان کا ہم خیال ہوتا نظر آتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ قاری کی توجہ فوری طور پر متوجہ کرنے کے گر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک اقتباس پیش ہے۔

> ''1985ء کی بات ہے۔ تب میں آنندنگر میں مقیم تھا۔ ایک شام دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو ایک لمبے چھریرے بدن والی ،خوش رنگ شخصیت چند ہمرائیوں کے ساتھ اندر آئی۔ میرے سامنے کچھ کتابیں پڑی ہوئی تھیں اور میں لکھنے میں مصروف تھا۔ رسمی تعارف کے بعد انہوں نے پوچھا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے جواب دیا ''ترجمہ کر رہا ہوں۔ یہ مولانا روم کی مثنوی کی تیسری جلد ہے۔''[1]

ترجمہ نگار کی حیثیت سے ایثار کا رتبہ بلند ہے۔ دوسرے علمی شعبوں کی طرح ترجمہ نگاری بھی ایک اہم شعبۂ علم ہے۔ اس کی وساطت سے کسی زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اس زبان کے قارئین تک پہنچنے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف متعلقہ فن پارے کی لسانی خصوصیات کا علم ہوتا ہے بلکہ جس تہذیب وتمدن ،قوم اور ملک کی وہ پیدا کردہ ہے اس کی معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔ گویا ترجمہ لسانی، علمی ،فکری اور معاشرتی سطح پر تبادلے کا کام کرتا ہے۔ ہر عہد میں نئے نئے افکار ونظریات کا تبادلہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔ اس کے ذریعے ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات ،اس کے مزاج اور اس کی نحوی ساخت سے متعارف ہو کر اپنی آبیاری کرتی رہی ہے۔ ترجمے کی اہمیت کے حوالے سے آل احمد

سرور رقمطراز ہیں:

''ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ترجمے میں تخلیق کو
ازسرِنو پانا ہوتا ہے۔اس لیے امریکہ میں ترجمہ کے لیے دوبارہ
تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے
۔ترجمے کے ذریعے سے ہم دوسری زبانوں کے افکار واقدار سے
آشنا ہوتے ہیں۔ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف
لسانیاتی نہیں بشریاتی (Anthropological) بھی ہے
۔یعنی اسے صرف اصل زبان (Source
language) سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہیے،اسے اس
زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔''[۲]

ترجمہ نگاری کے سلسلے میں ایثآر نے عصری علوم سے برابر استفادہ کیا ہے۔تاہم مسلسل ترجمہ نگاری کے عمل نے ترجمے کے سلسلے میں ان کا اپنا ایک نقطہ نظر تشکیل دیا ہے۔ایثآر ترجمے کی اہمیت وافادیت سے بخوبی وقف ہیں وہ کہتے ہیں:

''اگر ایرانی لٹریچر اطالوی زبان میں منتقل نہ ہوتا تو گوئٹے ،نہ
حافظ شیراز سے آشنا ہوتا اور نہ ان کے کلام سے ،اسی طرح وہ
ترجموں ہی کے ذریعہ تخیلات میں شیخ عطار،سعدی،فردوسی ،اور
عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔اس کے اندر ردیف و
قافیہ کے استعمال کا شعور بھی پیدا ہوا۔نتیجہ کے طور پر اس نے
''دیوانِ مغرب'' کی تخلیق کے ذریعہ اپنی احسان مندی کا
اعتراف کیا۔اسی طرح واقعات معراج نبوی،ابن عربی کی

تصنیف ''فتوحات مکیہ'' اور ان کے کشف، نیز ابوالعلامعریٰ کے رسالتہ الغفر ان کے تراجم ڈانٹے کو میسر نہ آتے تو اس کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کی تصنیف کے لئے اسے سیر آسمانی اور جنت و دوزخ کی تفصیلات کیسے حاصل ہوتیں؟'' [۳]

ایثؔار ترجمے کو آفاق گیر وسعتوں کا حامل قرار دیتے ہیں اس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک معاشرہ دوسرے معاشرے سے جڑ جاتا ہے۔ ایثؔار کے نزدیک ترجمہ میں چند شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ ان کی نظر میں ترجمہ اصل تخلیق کی روح کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ہو سکے ترجمے میں اس ماحول، ان معروضی صداقتوں، وہی نفسیاتی فضا اور اس ادبی تناظر کو بھی منتقل کرنا لازمی ہے جس میں اصل تخلیق معرض وجود میں آتی ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی ترجمے کے مسائل اور خصوصاً منظوم ترجمہ کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں وہ رقمطراز ہیں:

''ادب میں معنیٰ کو روح کا مقام حاصل ہے۔ لہذا جو ترجمہ معانی کی ترسیل ٹھیک طور پر نہ کرے وہ ترجمہ نہیں کہلائے گا۔ نثر ہو یا نظم دونوں کا ترجمہ نثر میں بآسانی ہوسکتا ہے۔ پھر بھی اصل کی جاذبیت ترجمہ میں لانا مشکل ہے۔ لیکن
نظم کا ترجمہ نظم میں مشکل ہی نہیں بعض مقامات پر ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ اصل کی روح کو ترجمہ میں برقرار رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف کہیں تو نامناسب نہ ہوگا۔'' [۴]

عہدِ حاضر میں ایثؔار کا شمار اقبال کے اہم مترجمین میں ہوتا ہے۔ ایثؔار چونکہ خود اردو زبان کے عمدہ شاعر ہیں علاوہ ازیں فارسی زبان پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے فکر و فلسفے، استعاراتی نظام، اور علامتی اظہار کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کے تراجم میں اقبال کا پیغام واضح طور پر نظر آتا ہے

۔ایثآرؔ محکمۂ جنگلات جیسی غیرادبی ملازمت سے وابستہ تھے لیکن دورانِ ملازمت بھی انہوں نے اپنی علمی وادبی مشغلے کو جاری رکھا۔شاعری کے علاوہ انہوں نے اقبال کے جملہ فارسی کلام ،عمر خیام کی رباعیات،سعدی شیرازی کی رباعیات اور مولانا جلال الدین رومی کی رباعیات اور شہرۂ آفاق مثنوی معنوی کی مکمل چھ جلدوں کا منظوم اردو ترجمہ پیش کر کے اردو داں طبقے کو بیش قیمت تحفے سے نوازا ہے۔ایثآرؔ کے تراجم کی طویل فہرست اس بات کی غماز ہے کہ وہ حقیقی مترجم ہیں کیونکہ غیر حقیقی عناصر کی قلعی بہت جلد کھل جاتی ہے اور وہ کسی سفر کو دو قدم طے کرنے کے بعد اپنا راستہ تبدیل کر لیتے ہیں لیکن ایثآرؔ نے اس کام میں ایک عمر صرف کی ہے۔انہوں نے ان فن پاروں اور شعراء کے کلام کے ترجمے کئے جو انہیں اپنے دل کی دھڑکنوں میں تیرتے ہوئے محسوس ہوئے۔انہوں نے ان تراجم کے وسیلے سے بلاشبہ اردو زبان وادب کی ترقی کی راہ بھی ہموار کی۔انہوں نے فارسی کلام کو اردو زبان کی شیرینی میں اس طرح گوندھ دیا کہ بمشکل انہیں ترجمہ ماننے کو دل چاہتا ہے۔

ایثآرؔ نے سب سے پہلے ۱۹۷۷ء میں عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ نہایت ہی شگفتہ انداز میں کیا اور انھیں بادۂ خیام کے عنوان سے شائع کیا۔اس کے بعد حافظ شیرازی،سعدی اور مولانا جلال الدین رومی کے کلام کا ترجمہ کیا۔اسی دوران اقبال کے فارسی کلام نے ان کے قلب وذہن کو حد درجہ مسحور کیا اور انھوں نے اقبال کے تمام فارسی مجموعہ ہائے کلام کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔وہ قارئین جو فارسی نے نابلد ہونے کے باعث فارسی کلام اقبال سے مستفیض نہیں ہو پائے ان ترجم کے مطالعے کے بعد انہیں فارسی کلام اقبال سے اپنائیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جو اقبال کی دنیا ہے۔اقبال کی فکر اور پیغام کی اہمیت کے پیش نظر ایثآرؔ نے کوشش کی ہے کہ اصل متن اور الفاظ وتراکیب سے قریب تر رہتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔اس ضمن میں انہوں نے اقبالؔ کی تخلیقات کا ترجمہ ان کی اصل بحر ہی میں کیا ہے تا کہ اس مخصوص بحر کے استعمال سے اقبالؔ نے جو فضا تخلیق کی ہے وہ ترجمے میں محسوس ہو اور ان کا مخصوص آہنگ برقرار رہے۔ایک نمونہ ملاحظہ ہو،اقبالؔ کہتے ہیں:

از ما بگو سلامے آں ترک تند خو را

کاتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمند است

من گر چہ توبہ گفتم نہ شکستہ ام سبو را
اے بلبل از وفایش صد بار با تو گفتم
تو در کنار گیری باز ایں رمیدہ بو را
از نالۂ بر گلستاں آشوبِ محشر آرد
تا دم بہ سینہ پیچد مگزار ہائے وہو را

ایثؔار نے نہایت شگفتگی سے ان اشعار کو ترجمے میں یوں سمویا ہے:

میرا سلام کہنا اس یار تند خو کو
وہ جس نے پھونک ڈالا دنیائے آرزو کو
اک دردمند دل ہی جانے گا درد میرا
توبہ تو کی ہے میں نے توڑا نہیں سبو کو
سو بار کہہ چکا ہوں بلبل! یہ بے وفا ہے
دل میں بسا رہی ہے پھر بھی رمیدہ بو کو
نالوں کے شور سے تو محشر اٹھا چمن میں
سینے میں دم ہے جب تک رہنے دے ھاوھو کو

فارسی کلام کو اردو کا جامہ پہناتے ہوئے اگر اسی بحر کو استعمال میں لایا جائے تو حسنِ ادا اور مفہوم کے قائم رہنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں ایثؔار کے تراجم اس خوبی سے متصف ہیں۔ ایثؔار کے منظوم تراجم میں یہ انفرادیت ہے کہ وہ اصل مفہوم کے قریب رہنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ تراجم میں مخصوص خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں جو اصل تخلیق کار کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ ایثؔار نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان فارسی تصانیف کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان تراجم کے دوران انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں مضامین کی فکری و فلسفیانہ پیچیدگی تو کہیں تلمیحات و اشارات کی بوقلمونی، بحور کی مشکلات

اورسب سے اہم اقبالؔ کے کلام کی ارفعیت کا بڑا دخل ہے۔لیکن یہ ایثارؔ کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس مہم سے سر خرو نکلے۔ یہ تراجم محض کلامِ اقبال کی تفہیم ہی کا باعث نہیں بلکہ ان کی بدولت اقبالؔ کے کلام کے معنوی تسلسل اوران کی منظومات کے مجموعی تاثر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ترجمے کے فنی محاسن اورشعری لطافتوں نے اقبالؔ کے مضامین کی پیش کش میں حسن وتاثیر کا جواضافہ کیا ہےاس سے مترجم کی تخلیقی صلاحیت نکھر کر سامنے آئی ہے۔ رباعیاتِ عمرخیام سے چندمثالیں پیش ہیں:

خیامؔ:

گو یند مرا دو زخی با شد مست
قولیست خلاف دل درونتواں بست
گر عاشق مست دوزخی خواہد بود
فردابینی بہشت ہمچوں کفِ دست

ترجمۂ ایثارؔ:

کہتے ہیں کہ دوزخی ہوں، پیتا ہوں شراب
ہےقول خلافِ عقل ، سنئے گا جناب
گر عاشق مست دوزخی ٹھہریگا
جنت میں نہ ہوگا کوئی پھر، روزِحساب

خیامؔ:

دہ عقل ، زنہ رواق ، وزہشت بہشت
ہفت اختر ام،ازشش جہت ایں نامہ نوشت
کز پنج حواس وچار ارکان وسہ روح
ایزد بدو عالم چوتو یک کس نہ سرشت

ترجمۂ ایثؔار:

دس عقل، نو آسماں، بہشت آٹھ رہے
ہاں سات ستارے، چھ جہت ہیں پورے
حس پانچ ہیں، رکن چار بھی تین اجسام
ڈھونڈے سے بھی تجھ سا کوئی ان میں نہ ملے

الغرض ایثؔار نے ترجمہ نگاری میں اپنی مخصوص علمی بصیرت اور فنی ریاضت کے ذریعے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ اور ترجمے کے فن کو تاثیر، حسن اور افادیت کے حوالے سے فنی چابکدستی کے ساتھ تخلیق کا ہم پلہ وہم منصب ثابت کر دکھایا۔ انہوں نے ان شعراء کے اذہان، محسوسات، اسلوب و بیان کی نزاکتوں، نفاستوں، لطافتوں اور حسن کو تراجم کے ذریعے اردو زبان وادب کے قاری تک پہنچانے کی ذمہ داری پورے خلوص کے ساتھ نبھائی۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے فکر وفن اور تخلیقی صلاحیتوں سے علم وادب کی جو بہترین خدمات انجام دی ہیں وہ قابلِ قدر اور اردو ادب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حوالے

۱۔واردات ِایثار،محمد اقبال،ص۱۵۷،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ،بنگلور

۲۔تراجم اوراصطلاح سازی،مشمولہ ترجمہ کافن اورروایت،ڈاکٹرقمر رئیس،ص۴۹،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۳۔واردات ِایثار،محمد اقبال،ص۲۱۹،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ،بنگلور

۴۔واردتِ ایثاراور جہاتِ اقبال،ص۲۶۳،ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ،بنگلور

مصنف ومرتب	کتاب کا نام	مطبع/ناشر	سن اشاعت
۱۔آزاد،جگن ناتھ	اقبال اور اس کا عہد	ادارہ انیس اردو،الہ آباد	۱۹۶۰ء
۲۔آزاد،جگن ناتھ	فکر اقبال کے بعض اہم پہلو	شیخ غلام محمد اینڈ سنز،سری نگر	۱۹۸۲ء
۳۔آغا،وزیر	اردو شاعری کا مزاج	جدید ناشرین اردو بازار،لاہور	۱۹۶۵ء
۴۔آغا،وزیر	تنقید اور احتساب	جدید ناشرین اردو بازار،لاہور	۱۹۶۸ء
۵۔آغا،وزیر	نظم جدید کی کروٹیں	مکتبہ میری لائبریری،لاہور	۱۹۷۴ء
۶۔آغا،وزیر	نئے تناظر	آئینہ ادب،لاہور	۱۹۸۱ء
۷۔آہن،اخلاق احمد	خیام شناسی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۲۰۱۷ء
۸۔احسن،عبدالشکور	اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	اقبال اکادمی،پاکستان	۱۹۷۷ء
۹۔احمد،پی۔نثار	اقبال کا فکر و فن	سرمدی پبلیکیشنز،چینئی	۲۰۱۰ء
۱۰۔احمد،حسن الدین	انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۲۰۱۳ء
۱۱۔احمد،کلیم الدین	اردو شاعری پر ایک نظر	ایوان اردو،پٹنہ	۱۹۶۶ء
۱۲۔اختر،سلیم	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	۱۹۷۸ء
۱۳۔اشرفی،وہاب	تاریخ ادبِ اردو (جلد دوم)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۲۰۰۷ء
۱۴۔اعظمی،عبداللطیف	اقبال دانائے راز	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ،دہلی	۱۹۷۸ء
۱۵۔اقبال،جاوید	زندہ رود	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلی کیشنز،لاہور	۱۹۸۲ء
۱۶۔اقبال،محمد	پیامِ مشرق	کتب خانہ نذیریہ،دہلی	۱۹۷۱ء
۱۷۔اقبال،محمد	زبورِ عجم	کتب خانہ نذیریہ،دہلی	۱۹۷۱ء
۱۸۔اقبال،محمد	ارمغانِ حجاز	شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور	۱۹۶۴ء
۱۹۔اقبال،محمد	کلیاتِ اقبال (فارسی)	شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور	۱۹۷۳ء

مصنف	کتاب	ناشر	سال
۲۰۔اقبال،محمد	کلیاتِ اقبال (اردو)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور	۱۹۸۴ء
۲۱۔اقبال،محمد	وارداتِ ایثار اور جہاتِ اقبال	ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ، بنگلور	۲۰۰۶ء
۲۲۔اقبال،محمد	وارداتِ ایثار	ایثار پبلشنگ ہاوز ٹرسٹ، بنگلور	۲۰۱۷ء
۲۳۔اکبرآبادی،میکش	نقدِ اقبال	برقی پریس، آگرہ	۱۹۵۴ء
۲۴۔اکرام،محمد شیخ	موجِ کوثر	ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور	۱۹۹۴ء
۲۵۔انجم،خلیق	فنِ ترجمہ نگاری	ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دلی	۱۹۹۵ء
۲۶۔انصاری،اختر	غزل اور غزل کی تعلیم	مکتبہ عالیہ، لاہور	۱۹۸۷ء
۲۷۔انصاری،اسلوب احمد	ادب اور تنقید	سنگم پبلشرز، الہ آباد	۱۹۲۸ء
۲۸۔انصاری،اسلوب احمد	تنقیدی تبصرے	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۴ء
۲۹۔انصاری،اسلوب احمد	مطالعۂ اقبال کے چند پہلو	کاروانِ ادب، ملتان	۱۹۸۶ء
۳۰۔انصاری،اسلوب احمد	اقبال حرف ومعنی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۸ء
۳۱۔انصاری،ظ	اقبال کی تلاش	میٹرو پرنٹنگ پریس، بمبئی	۱۹۷۸ء
۳۲۔ایثار،سید احمد	پیامِ مشرق منظوم اردو ترجمہ	دی بنگلور اکیڈمی، بنگلور	۱۹۹۷ء
۳۳۔ایثار،سید احمد	زبورِ عجم منظوم اردو ترجمہ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۱۹۹۹ء
۳۴۔ایثار،سید احمد	جاوید نامہ منظوم اردو ترجمہ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۰۳
۳۵۔ایثار،سید احمد	پس چہ باید کرد منظوم اردو ترجمہ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۰۶ء
۳۶۔ایثار،سید احمد	اسرار ورموز منظوم اردو ترجمہ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۰۸ء
۳۷۔ایثار،سید احمد	ارمغانِ حجاز منظوم اردو ترجمہ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۰۹ء
۳۸۔ایثار،سید احمد	ترانہ وترنگ	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۱۹۹۹ء
۳۹۔ایثار،سید احمد	آبفشار	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۱۲ء
۴۰۔ایثار،سید احمد	سراغِ زندگی (خودنوشت)	ایثار پبلیشنگ ہاؤز، بنگلور	۲۰۱۵ء
۴۱۔بریلوی،عبادت	شاعری اور شاعری کی تنقید	اردو دنیا، کراچی	۱۹۶۵ء
۴۲۔بریلوی،عبادت	غزل اور مطالعہ غزل	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۵۵ء
۴۳۔بریلوی،عبادت	شاعری کیا ہے؟	ادارۂ ادب وتنقید، لاہور	
۴۴۔پرشاد،مہیش	رباعیاتِ عمر خیام	رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا	۱۹۳۳ء

۴۵۔ جالبی، جمیل (مرتب) | ایلیٹ کے مضامین | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی | ۲۰۰۰ء

۴۶۔ جالبی، جمیل | ارسطو سے ایلیٹ تک | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی | ۱۹۷۷ء

۴۷۔ جاوید، صدیق | اقبال نئی تفہیم | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی | ۲۰۱۳ء

۴۸۔ جاوید، عصمت | عکس اسرار خودی | مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی | ۱۹۹۱ء

۴۹۔ جاوید، عصمت | عکس رموز بیخودی | مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی | ۱۹۹۸ء

۵۰۔ جعفری، علی سردار | اقبال شناسی | مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی | ۱۹۷۶ء

۵۱۔ چشتی، یوسف سلیم | اسرارِ خودی مع شرح | اعتقاد پبلشنگ ھاؤس، نئی دہلی | ۱۹۹۸ء

۵۲۔ چشتی، یوسف سلیم | زبورِ عجم مع شرح | اعتقاد پبلشنگ ھاؤس، نئی دہلی | ۲۰۰۳ء

۵۳۔ چشتی، یوسف سلیم | پیامِ مشرق مع شرح | آفتاب عالم پریس، لاہور | ۱۹۵۳ء

۵۴۔ چشتی، یوسف سلیم | جاوید نامہ مع شرح | کوہ نور پریس دہلی | ۱۹۷۳ء

۵۵۔ چغتائی، محمد اکرام | مولانا جلال الدین رومی | سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور | ۲۰۰۴ء

۵۶۔ حالی، الطاف حسین | حیاتِ سعدی | مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دھلی | ۱۹۷۰ء

۵۷۔ حالی، الطاف حسین | مقدمہ شعر و شاعری | اردو اکادمی، لکھنو | ۱۹۸۸ء

۵۸۔ خان، یوسف حسین | روح اقبال | غالب اکیڈمی، دہلی | ۱۹۶۶ء

۵۹۔ خان، یوسف حسین | اردو غزل | آئینہ ادب، لاہور | ۱۹۸۶ء

۶۰۔ خاور، رفیق | اقبال کا فارسی کلام | بزم اقبال کلب روڈ، لاہور | ۱۹۸۸ء

۶۱۔ رئیس، قمر | ترجمہ کا فن اور روایت | تاج پبلشنگ ھاؤس، دلی | ۱۹۷۶ء

۶۲۔ سبزواری، شوکت | نئی پرانی قدریں | مکتبہ اسلوب، کراچی | ۱۹۶۱ء

۶۳۔ سدید، انور | اردو ادب کی مختصر تاریخ | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد | ۱۹۹۱ء

۶۴۔ سراج الدین، سید | جاوید نامہ (اردو آزاد نظم میں ترجمہ) | اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا | ۲۰۰۷ء

۶۵۔ سرور، آل احمد | تنقید کیا ہے | مکتبہ جامعہ، علی گڑھ | ۱۹۵۹ء

۶۶۔ سرور، آل احمد | تنقیدی اشارے | مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ | ۱۹۴۲ء

۶۷۔ سرور، آل احمد | نئے اور پرانے چراغ | ادارۂ فروغ اردو، لکھنو | ۱۹۵۵ء

۶۸۔ سروری، عبدالقادر | اقبال حیات اور شاعر | ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد | ۱۹۴۴ء

۶۹۔ سلیمان ندوی، سید | خیام | دارالمصنفین اعظم گڑھ | ۱۹۳۳ء

۷۰۔سکسینہ،رام بابو تاریخ،ادب اردو علمی کتب خانہ،اردو بازار،لاہور

۷۱۔شارب رودلوی جدید اردو تنقید-اصول ونظریات اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنؤ ۱۹۸۹ء

۷۲۔شہاب،غلام دستگیر ترجمان اسرار خودی ظفر اقبال گارڈن روڈ ۱۹۸۹ء

۷۳۔شہاب،غلام دستگیر ترجمان رموز بیخودی پربھات پریس،پونہ ۱۹۹۱ء

۷۴۔صدیقی،ابواللیث آج کا اردو ادب ایجوکیشنل بک ہاؤس،،لاہور ۱۹۷۵ء

۷۵۔صدیقی،افتخار احمد عروج اقبال بزم اقبال،لاہور ۱۹۸۸ء

۷۶۔صدیقی،رشید احمد جدید غزل مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۷۷۔صدیقی،ظفر احمد فلسفہ شاعری اور اقبال شعبہ اردو دلی یونیورسٹی،دہلی ۱۹۷۵ء

۷۸۔طارق،عبدالرحمٰن روحِ مشرق ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور

۷۹۔عابد علی عابد،سید شعر اقبال بزمِ اقبال،لاہور ۱۹۷۷ء

۸۰۔عابد علی عابد،سید اصول انتقاد ادبیات مجلس ترقی ادب،لاہور ۱۹۶۶ء

۸۱۔عابد علی عابد،سید اسلوب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،علی گڑھ ۱۹۷۶ء

۸۲۔عبدالحکیم،خلیفہ فکر اقبال بزمِ اقبال،لاہور ۱۹۶۸ء

۸۳۔عبدالرحمٰن،شیخ ترجمانِ اسرار مکتبہ کاروان،لاہور

۸۴۔عبدالرشید،ڈاکٹر ادب وفن مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہور ۱۹۸۹ء

۸۵۔عظیم،عظیم الدین کرناٹک کے اردو قلم کاروں کی ڈائرکٹری کرناٹک اردو اکادمی،بنگلور ۲۰۰۴ء

۸۶۔عبدالمغنی اقبال کا نظریۂ خودی مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۸۷۔عبدالمغنی اقبال کا ذہنی وفنی ارتقاء انجمن ترقی اردو ہند،نئی دہلی ۱۹۹۱ء

۸۸۔عبدالمغنی اقبال اور عالمی ادب کریسٹ پبلی کیشنز،بہار ۱۹۸۲ء

۸۹۔علوی،تنویر احمد اصولِ تحقیق وترتیبِ متن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی ۲۰۰۹ء

۹۰۔علی ندوی،سید ابوالحسن کاروانِ مدینہ مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام لکھنؤ ۲۰۰۱ء

۹۱۔فاخری،آفاق فکر اقبال کے سرچشمے نشاط آفسیٹ پریس،ٹانڈہ ۱۹۹۳ء

۹۲۔فاروقی،شمس الرحمٰن اثبات ونفی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۹۳۔فاروقی،شمس الرحمٰن شعر،غیر شعر اور نثر شب خون کتاب گھر،الہ باد ۱۹۹۸ء

۹۴۔فاروقی،شمس الرحمٰن درسِ اقبال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء

نئی دہلی

۹۵۔فتح پوری،فرمان	اردوشاعری کافنی ارتقاء	اردواکیڈمی،سندھ	۱۹۹۰ء
۹۶۔فتح پوری،فرمان	اقبال سب کے لئے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۱۹۹۰ء
۹۷۔فتح پوری،فرمان	اردوکی نعتیہ شاعری	آئینہ ادب،لاہور	۱۹۷۴ء
۹۸۔قریشی،عبدالرزاق	مبادیات تحقیق	ادبی پبلشرز،بمبئی	۱۹۶۸ء
۹۹۔قریشی،نثاراحمد(مرتب)	ترجمہ،روایت اورفن	مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد	۱۹۸۵ء
۱۰۰۔ کاشمیری،تبسم	نئے شعری تجربے	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	۱۹۷۸ء
۱۰۱۔کامران،جیلانی	نئی نظم کے تقاضے	مکتبہ عالیہ،لاہور	۱۹۸۵ء
۱۰۲۔کاشمیری،حامدی	حرفِ زار۔ اقبال ایک مطالعہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۱۰۳۔گیان چند،ڈاکٹر	تحقیق کافن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۲۰۰۹ء
۱۰۴۔گیان چند،ڈاکٹر	ابتدائی کلام اقبال	اردوریسرچ سینٹر،حیدرآباد	۱۹۸۸ء
۱۰۵۔لکھنوی،منور	سوزاقبال	انجمن ترقی اردو،دہلی	۱۹۷۰ء
۱۰۶۔مجاز،مضطر	طلوعِ مشرق	اناپبلیکیشنز،حیدرآباد	۱۹۷۵
۱۰۷۔مجاز،مضطر	ارمغانِ حجاز(منظوم اردوترجمہ)	اناپبلیکیشنز،حیدرآباد	۱۹۷۷ء
۱۰۸۔مجاز،مضطر	جاویدنامہ(منظوم اردوترجمہ)	اقبال اکیڈمی،حیدرآباد	۱۹۸۱ء
۱۰۹۔مجاز،مضطر	پیامِ مشرق(منظوم اردوترجمہ)	اقبال اکیڈمی،حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۱۱۰۔مجنوں گورکھپوری	ادب اورزندگی	مکتبہ دانیال،کراچی	۱۹۸۵ء
۱۱۱۔محمدحسن،ڈاکٹر	جدیداردوادب	غضنفراکیڈمی،پاکستان	۱۹۷۰ء
۱۱۲۔منظرحسین	اقبال اوردانتے	حسین لٹریری انفارمیشن سنٹر،رانچی	۱۹۹۸ء
۱۱۳۔نارنگ،گوپی چند	ادبی تنقیداوراسلوبیات	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	۱۹۹۱ء
۱۱۴۔نارنگ،گوپی چند	ساختیات،پس ساختیات اورمشرقی شعریات	سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور	۱۹۹۴ء
۱۱۵۔نارنگ،گوپی چند	اقبال کافن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۱۹۸۹ء
۱۱۶۔ندوی،عبدالسلام	اردورباعیات	نسیم بک ڈپو،لکھنؤ	۱۹۶۳ء

۱۱۷۔ندوی،عبدالسلام	اقبال کامل	دارالمصنفین ،اعظم گڑھ	۱۹۴۸ء
۱۱۸۔نعمانی،شبلی	شعرالعجم (جلد چہارم)	دارالمصنفین شبلی اکادمی،اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء
۱۱۹۔نعمانی،شبلی	سوانح مولانا روم	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء
۱۲۰۔نقوی،نورالحسن	اقبال شاعرومفکر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،علی گڑھ	۲۰۰۰ء
۱۲۱۔واقف، پروفیسر	عمرخیام کی رباعیات	مشورہ بک ڈپو،دھلی	۱۹۶۰ء
۱۲۲۔وحیدالدین، پروفیسر	حکمت گوئٹے اورفکراقبال	اقبال انسٹی ٹیوٹ،سری نگر	۱۹۸۳ء
۱۲۳۔وقارعظیم،سید	اقبالیات کا مطالعہ	اقبال اکادمی پاکستان،لاہور	۱۹۷۷ء
۱۲۴۔ہاشمی،حمیداللہ شاہ	کلیاتِ اقبال	مکتبہ دانیال،لاہور	
۱۲۵۔ہاشمی، رفیع الدین	اصناف ادب	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۳ء
۱۲۶۔ہاشمی، رفیع الدین	اقبالیات تفہیم وتجزیہ	اقبال اکادمی،لاہور	۲۰۰۴ء
۱۲۷۔ہاشمی، رفیع الدین	تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ	اقبال اکادمی پاکستان،لاہور	۱۹۸۲ء
۱۲۸۔ہاشمی، رفیع الدین	اقبالیاتی جائزے	گلوب پبلشرز،لاہور	۱۹۹۰ء
۱۲۹۔ہاشمی، رفیع الدین	اقبال شناسی اور جنرل ریسرچ	بزمِ اقبال،لاہور	۱۹۸۹ء
۱۳۰۔ہاشمی،نصیرالدین	دکن میں اردو	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۰ء
۱۳۱۔ہمدانی،احمد	اقبال فکروفن کے آئینے میں	اقبال اکادمی پاکستان،لاہور	۱۹۹۵ء

رسائل

۱۔سب رس،حیدرآباد،اگست ۱۹۷۷ء

۲۔اقبال ریویو،حیدرآباد،نومبر۲۰۰۴ء

۳۔اردوادب (سہہ ماہی) نئی دہلی جنوری،فروری،مارچ ۱۹۹۹ء

۴۔نیرنگِ خیال،لاہور،ستمبرواکتوبر۱۹۳۲ء

۵۔بیسویں صدی(نئی دہلی)جولائی ۱۹۶۵ء،فروری ۲۰۰۰ء

۶۔تحریک ادب ۲۰۱۰ء،۲۰۱۶ء شمارہ نمبر ۶۲

۷۔تحریرنو، ماہنامہ،اکتوبر ۲۰۱۴ء

۸۔اقبال ریویو،حیدرآباد،اپریل ۱۹۹۴ء

۹۔خبرنامہ(ماہنامہ)اترپردیش اردو اکادمی،لکھنؤ جنوری ۲۰۱۳ء

۱۰۔دبستان علم وادب،نمبر۳،اکتوبر ۲۰۱۴ء

۱۱۔زرین شعائیں،بنگلور ۲۰۱۴ء،۲۰۱۵ء،

۱۲۔سبق اردو،نومبر ۲۰۱۷، جلد۱۵،شمارہ ۴۳

۱۳۔شاعر،ممبئی،شمارہ مئی ۲۰۰۹ء

۱۴۔شب خون،الہ آباد،جون ۲۰۰۶ء

۱۵۔اقبال ریویو،حیدرآباد،اپریل ۱۹۸۴ء

۱۶۔اقبال ریویو،حیدرآباد،نومبر ۲۰۰۲ء

۱۷۔کتاب نما(دہلی)،اگست ۱۹۹۸ء،ستمبر تادسمبر،۲۰۰۲ء

۱۸۔فکروتحقیق(سہ ماہی)نئی دہلی،اپریل،مئی،جون،۲۰۰۴ء

۱۹۔اقبالیات،اقبال اکادمی،پاکستان،جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء

۲۰۔ادیب،کرناٹک اردو اکادمی،بنگلور،ستمبر ۲۰۱۲،مئی ۲۰۱۳،جون ۲۰۱۳

۲۱۔اردو دنیا،ترقی بیورو،نئی دہلی،مارچ،دسمبر ۲۰۱۳ء،اپریل ۲۰۱۶ء

۲۲۔ہماراادب ۱۹۶۵ء،۱۹۸۷ء

۲۳۔روحِ ادب،مغربی بنگال اردو اکاڈمی،اپریل تاجون ۲۰۱۶ء

......شائع شدہ مضامین......